



تخریج شدہ ایڈیشن

مُسِنِ انسانیت کی سیرت پُمنفرد اسلوب کی خالی ایک جامع کتاب



سیاستِ الرسول

تألیف

علّامہ شبیل عمانی

علّامہ سید عباین ندوی

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ سلامیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ذات کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔ ←

مجلس التحقیق الاسلامی (Upload) کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ

کی جاتی ہیں۔ ←

دعویٰ مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔ ←

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ ←

ان کتب کو تجارتی یا مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔ ←

«اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاؤشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں»

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔ ←

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

جَنْ مُسْتَدِّهِ الْيَدِيَشِنِ

سِرِّ سَبَبِي

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ

﴿مُؤْمِنًا تَأْنِيَثَ كَيْرِيٹ پُنْفِرْدَ اسْلُوبَ كَيْ جَاهِلَ اِيكَتْ جَامِعَ كَاتِبَ﴾

اس حصے میں اخلاق، فلسفہ اخلاق، حقوق و فرائض، رذائل اور آداب زندگی کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی کی گئی ہے۔



تألیف

عَلَامَةَ شَبَلِ نَعْمَانِ

عَلَامَةَ سُبْرِيلِ نَذْوَى



مکتبہ سبلامیہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

سُكْنَةُ النَّبِيِّ

کتاب

تالیف - علامہ شبیل غافنی، علامہ سعید لشائی ندوی

ناشر - محمد روزان

اشاعت - اکتوبر 2012ء

قیمت

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بامتحان، جمانہ مداریت فلسفی شیعیت اردو ہزار لاہور پاکستان فون: 042-37244973 فکر: 042-37232369

تمثیل سست سیٹ بالسائل شیل پروول پسپ کوتوالی روڈ، فصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204، 2034256

E-mail: maktabaislamiapk@gmail.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دیباچہ طبع ثانی

الله تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے ایک تحریر بندہ کی خدمت کو عام مسلمانوں میں اور مخصوصاً اہل علم کی نگاہوں میں مقبولیت کی نعمت عطا فرمائی: ﴿وَإِنْ تَعُذُّوا نِعْمَةُ اللَّهِ لَا تَحْصُوْهَا﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۲۴) ”خدا کی نعمتوں کا شمار کون کر سکتا ہے۔“

قدروانوں کا تقاضہ تھا کہ اس کی چھوٹی جلد جلد شائع ہو، مگر کتاب کی ضخامت اور کاغذ کی گرانی کے سبب سے اس میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیش آتی رہیں، اور آخر کمی برسوں کے بعد وہ دن آیا کہ پوری کتاب دوبارہ چھپ کر ختم ہوئی اور اب وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب ساتویں جلد (معاملات) کا معاملہ درپیش ہے، بعد ر توفیق اس کے کچھ صفحات لکھنے بھی گئے ہیں، مگر ابھی کام بہت باقی ہے، احباب سے اس کے حسن انجام کی دعا کا خواستگار ہوں۔

والسلام

بیچ مدار

۲۹/شوال ۱۳۶۰ھ

سلیمان

۱۹ نومبر ۱۹۴۱ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله الذي انزل الكتاب والحكمة والصلوة والسلام على رسوله نبي الرحمة
وعلى الله واصحابه اولى العزم والهمة۔

اے تو بھمیں صفت سزاوار	نام تو گرہ کشانے ہر کار
اے کردہ زگنج خانہ راز	برآدمیاں در سخن باز
عالیٰ ز تو شد بحکمت آباد	حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆☆☆☆☆☆☆

در قربت حضرت مقدس پیغمبر پاک، رب برہم، بس گنجینہ کیمیانے عالم پیش از ہمہ پیشوائے عالم نامش بسریر پادشاہی توقع سپیدی و سیاہی (خسرو) سیرت نبوی ﷺ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے بعنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا ہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ "اسماۓ حسنی" کا پرو ہیں۔ بار بار اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق، خالق کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سرا اسٹریک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس صفت کو خداۓ تعالیٰ کی جس صفت سے ممتاز ہوتی ہے، اس پر اس صفت کا اطلاق مجاز کر دیتے ہیں، جیسے اللہ کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے، جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر اللہ کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس صفت کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی صفت علم اللہ میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چونکہ خداۓ تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک اکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ اکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ ۱ ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراك کا ہے، اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراك،

* تفصیل کے لیے دیکھئے معارف دینیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۲۸۔ مطبوعہ مدینہ بنگور

اشتراك بادئي متناسب ہے اور اس، «لَيْسَ كَيْفِيَّةُ شَنْعٍ وَهُوَ الشَّوِيعُ الْبَصِيرُ» (۴۲) (الشوری: ۱۱) کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آگیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات وہدیات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحقوں میں پائی جاتی ہیں، یا ان کے موجودہ چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی، وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی۔ یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ علیہ السلام کے ذریعہ اس کی بہیش کے لیے تکمیل فرمادی گئی۔ کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آگئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں البحانیں گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فدق کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت علیہ السلام کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گناہی گئی ہیں۔ پھر حقوق، فنائیں، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفقی کارمولا نا عبد السلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں، جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکرگزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو و خطا انسان کی فطرت ہے، پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میر افکرو ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے باñی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو مدحت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزاء پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ (جیسا ہے)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اور اُن کو قبول فرمائے اور ابناۓ ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی ترتیب میں آ رائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت سید سعید عمان ندوی

(۳۲ ذی الحجه ۱۴۲۵ھ)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى إِلَهِ
وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

تعلیمات نبوی ﷺ کا تیرا باب اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کی کتاب کا تیرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی بہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو حسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے مال باپ، اہل دعیاں، عزیز و رشتہ دار، دوست و احباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، طلن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں، تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستے سے بیکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم و بیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ”اسلام“ نے بھی یہی کیا ہے، آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقی حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصہ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ حج بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برا ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے، لیکن نہب کے دوسرا ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مکملی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُعْثَتْ لَا تَتَمَّمُ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ)) *

”میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مؤطرا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا يَعْثُثُ لَا تَتَمَّمُ مَكَارِمُ الْأَخْلَاقِ)) *

”میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔“

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ ﷺ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذر گنڈی شوہنے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جمن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:

رَأَيْتَهُ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ۔ *

”میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔“

جشن کی هجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوکر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

”اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، ہتوں کو پوچھتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو مستاثتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیرستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہو..... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوچھنا چھوڑ دیں، حج بولیں، خوزیزی سے باز آئیں، تیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داع غنہ لگائیں۔“ *

* مؤطا امام مالک، کتاب حسن الحلق، باب ماجاء فی حسن الخلق: ۱۶۷۷؛ کنز العمال، ج ۲، ص ۵ وزرقانی شرح مؤطا، ج ۴، ص ۹۲ مطبع کستلیہ مصر: ۱۲۸۰ھ۔ ۲ سنن البخاری بیہقی، ۱۹۲/۱۰، مسند الشہاب: ۱۰۸۰؛ احمد، ۳۸۱، ابن سعد، ۱/۱۹۲، نوٹ: الحمد اہن سعد میں ”صالح الاخلاق“ کے الفاظ ہیں۔

* صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ۶۲۶۲۔

* مسند احمد، ج ۱، ص ۲۰۲؛ مسند رحکم، ج ۲، ص ۱۳۱؛ ابن هشام ذکر واقعہ هجرت، ج ۱، ص ۲۰۶۔

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو بھی تک کافر تھے، آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ”وَپَكَّ دَامِنِي اخْتِيَارَ كَرِيْسَ، سَجَّ بُولِيسَ اوْ قِرَابَتَ كَاحْقَنَ اوْ كَرِيْسَ۔“ *

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

﴿وَيَذَّكُّهُمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحُكْمَةَ﴾ (الجمعة: ۶۲)

”یَقْبَلُهُمْ اَنْ پُرْهِ جَاهِلُوں کو پاک و صاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔“

اس آیت میں دونلفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک و صاف کرنا، جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

① تزکیہ

کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آسودگیوں سے نکھار کر صاف سترہ کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورہ الشمس میں ہے:

﴿وَنَفَّسٍ وَمَا سَوَّهَا فَالْعَمَّا مُجُورُهَا وَنَقْوَهَا قَدْ أَفْلَحَهُ مَنْ زَكَّهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾ (الشمس: ۹۱-۱۰)

”قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبه جس نے اس نفس کو صاف سترہ بنا یا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔“

دوسری جگہ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَهُ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ أَسْمَرَرِيهِ فَصَلَّى﴾ (الاعلیٰ: ۸۷-۱۴)

”بے شبه وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک و صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔“

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے تجیک کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلََّ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى وَمَا يُدْرِيكُ لَعْلَهُ يَزَّكَى أوْ يَذَّكَرُ فَتَغْفِعَهُ الذِّكْرُى﴾ (عبس: ۸۰-۴)

”پیغمبر ﷺ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سور جاتا، یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔“

* صحیح بخاری ، کتاب الوحی ، باب کیف کان بده الوحی: ۷ و کتاب الجہاد ، باب دعاء النبی مفتیہ الی الاسلام ۲۹۴۱۔

ان آئیوں سے اندازہ ہو گا کہ قرآن پاک میں اس "تزریقیہ" کا مفہوم کیا ہے، جس کو اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خاص خصوصیت قرار دیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے برا فرض یقیناً کہ وہ نفس انسانی کو جلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلو گیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف تحریا بنا کیں، چنانچہ جو واقعات اور پریان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ ﷺ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

② حکمت

اس کے بعد دوسر الفاظ حکمت کا ہے، گواں لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے، جو نور الہی کی صورت میں نبی ﷺ کے سینہ میں دلیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سفن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسر اصطلاح اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کونسی باتیں داخل ہیں، سورہ نبی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابت داروں اور مرتضیٰ جوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور تینیوں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایسا ہے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تو نئے اور زی میں پر اکڑ کرنے چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ذلِكَ مِنَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (۱۷ / الاسراء: ۳۹)

"یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجوہ پر دی کیا۔"

سورہلقمان میں ہے کہ

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَا لِقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِيَهُ﴾ (۲۱ / لقمان: ۱۲)

"اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں، کہ اللہ کا شکر ادا کر۔"

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ "کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغروہ نہ بن، زمین پر راکڑ کرنے چل، پیچی آواز میں باتیں کر۔" ان آئیوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فاطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃ تمام قوموں اور نمہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں، "حکمت" کہا گیا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ، یہ ہے کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور

قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ دجی محمدی علیہ السلام کتاب اور حکمت دونوں پر بر ام مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جواہیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كُعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعُلُوا الْغَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفَاهُونَ ﴿٤﴾

(۲۲/الحج: ۷۷)

”اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوت محمدی علیہ السلام کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرًا اخلاق، ایک خالق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔
حقوق عبادوں کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تعلیمِ محمدی علیہ السلام نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوق عباد، یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی اللہ کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو احتمال الرحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بننیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی، جو اس احتمال الرحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لیے آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کر لے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہو گا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کوں جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں، ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔“ * ایک اور حدیث میں ہے کہ ”قیامت میں نامہ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پرواۃ اللہ نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے اللہ ایک حرفاً کوئی نہ چھوڑے گا اور تیسرا وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پرواۃ اس کو نہ ہو گی تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے اللہ کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرفاً بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے

* صحیح بخاری، کتاب البرقاق، باب الفصاص يوم النیامۃ: ۶۵۳۔

دوسرے بندہ پر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے، جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا، جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو لے۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسن کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ و اغظبوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقی حسنے کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے، کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپ انسانی ہمدری اور غنواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز پھر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی شرہ ظاہر ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکامِ الہی کی محض لفظی تکمیل اور عبادات کے جو ہر و معنی سے یکسر خالی اور معراہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوبی نہیں اور وہ قابل ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی ﷺ کے جو اشارات اس باب میں ہیں، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

”اللہ فرماتا ہے کہ نماز کو میری بیاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو، جب تک تم یہ سمجھو کر تم کیا کہہ رہے ہو، لکنے نمازی ہیں جنہوں نے گوشراب نہیں لی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص درکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی

۱ مسند احمد، ج ۲، ص: ۲۴۰؛ مستدرک حاکم عن عائشة، ج ۴، ص: ۵۷۵۔

۲ یہ اصول فتنہ کا مسلم ہے، دیکھو محدثیہ، کتاب الحج، ص: ۲۱۳؛ مرتبہ مولانا عبد الحق مجیدیہ۔

دنیاوی چیز کا دھیان نہ آئے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ ”نماز عاجزی، فروقی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔“ اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ”اے میرے اللہ!“ جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں، جو میری بڑائی کے سامنے سرگلوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جاتا اور بھوکے محتاج کو میرے لیے لکھانا کھلاتا ہے۔“ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز اسی لیے فرض کی گئی اور اسی لیے حج کے اركان بنائے گئے، تاکہ اللہ کی یاد کی جائے۔“ تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو جو مقصد ہے، تو اس یادِ الہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس کی نماز اس کو بڑائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور دور کر دیتی ہے۔“ *

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیرِ محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (سورہ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو بیجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں، کہ ”جس کو اس کی نماز بڑائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہیں“ * اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ ”روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کونہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔“ * ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاق حسنة اور ایمان

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گونہ ہب کا اصل الاصول ہے، لیکن اس بنا پر کوہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنة کو تواریخ دیا گیا ہے، چنانچہ سورہ مومنوں میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا:

﴿قَذْ أَفْلَمَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاةٍ يَعْمَلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ الْغُُورِ
مُغْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلرَّكْعَةِ فَلِعُولُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلْعُرُوجِ هُمْ حَفَظُونَ ۝ إِلَّا عَلَى
أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكُتَ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَعْلُومِينَ ۝ لَكُمْ أَبْشِرُنِي وَرَأَءَهُ ذَلِكَ فَإِنَّكَ هُمْ

* احیاء العلوم، جلد اول، باب فضیلۃ الخشوع، ص: ۹۵۔ * تفسیر ابن کثیر، سورہ عنکبوت، آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۴۱۴۔ * صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ابو داود، کتاب الصیام، باب الغیبة للصائم: ۲۳۶۲؛ حامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی التشديد فی الغیبة للصائم: ۷۰۷؛ ابن ماجہ، ابواب الصیام، باب ماجاء فی الغیبة والرفث: ۱۶۸۹۔

الْعَدُوْنَ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ لَا يَفْتَأِمُونَ وَعَاهَدُهُمْ رَاعُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلْوَاتِهِمْ
جَمَاعُهُنَّ ۝ 》 (٢٣ / المؤمنون: ١-٩)

”بے شبهہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے ہیں اور جو کئی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا الحاطر رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔“

ان آقوٰں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ تاتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پا کردا منی اور ایسا یعنی عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنة اور تقویٰ

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرك ہے، تقویٰ ہے، وحی محمدی ﷺ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

﴿لَيْسَ الْبَرَّ أَنْ تُؤْلَمُ وَجْهُكُمْ قِبَلَ الْمَسْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلِكُنَّ الْبَرَّ مَنْ أَمْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالثَّقَيْنَ وَإِنَّ الْمَالَ عَلٰى حُسْنِهِ ذُو الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمُسْكِنَى
وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّيقَابِ ۝ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَإِنَّ الزَّكُوٰۃَ وَالْمُوْمُونُ يَعْهِدُهُمْ
إِذَا عَاهَدُوا ۝ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَجِئْنَ الْيَاسِ ۝ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۝
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقِنُونَ ۝﴾ (٢ / البقرة: ١٧٧)

”نیکی بھی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا اللہ کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، قبیلوں کو، غربیوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو صیحت، تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی ہیں جو استبار ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ راستپازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایسا یعنی عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاق حسنة اور اللہ کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے، جن کے

اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورہ فرقان میں ارشاد ہوا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْسُوْنَ عَلٰى الْأَرْضِ هُوَنَا وَإِذَا خَاطَبَاهُمُ الْجِهَلُوْنَ قَالُوْنَا سَلَامًاۚ وَالَّذِينَ يَمْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَدًا وَقِيَامًاۚ وَالَّذِينَ يَقُوْنَ رَبِّنَا أَصْرَفُ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَۚ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًاۚ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقْرَرًا وَمُقَاماًۚ وَالَّذِينَ إِذَا آتَفْقَوْا الْمُسْرِفُوْنَ وَكُمْ يَقْتُرُوْنَ وَكَانَ بَيْنَ ذِلِّكَ قَوَاماًۚ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ أَخْرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفَسَ الَّتِي حَرَمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَرْتَنُوْنَ وَمَنْ يَقْعُلْ ذِلِّكَ يَلْقَ أَثَاماًۚ وَالَّذِينَ إِذَا ذَكَرُوْا بِالْيَتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمَّاً وَعُمَيَّاًۚ وَالَّذِينَ يَقُولُوْنَ رَبِّنَا هُبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَدُرِّيْتَنَا فَرَةً أَعْيُنَ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَقْيِنَ إِمَاماًۚ﴾

(الفرقان: ٦٣-٦٨ و ٧٣-٧٤)

”اور حرم والے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناس بھجو لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر، کہ اس کا عذاب بڑا تاداں ہے اور جہنم برائحتکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں، تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں، بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سید ہے گزریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں، کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پوسٹہ ہوگا..... اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغوبات پر سے گزرتے ہیں تو سمجھیگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب اللہ کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ انہیں ہے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔“

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگزرو میانہ روی اور قتل و خوریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکروہ در میں شرکیک نہ ہونا وغیرہ، اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ ہیں:

﴿وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كُلَّيْرِ الْإِنْجِ وَالْفَوَاجِحَ وَإِذَا مَا عَصَبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَهُمْ يُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَتَصْرُفُونَ وَجَزَّوْ أَسِئَةَ سَيِّئَاتِهِمْ فَمَنْ عَفَّ أَوْ أَصْلَحَ فَأُجْرَهُ كُلُّ اللَّهُ أَعْلَمُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنْ اتَّصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَيِّئَاتِهِمْ إِنَّمَا السَّيِّئَاتِ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَغْفِرُونَ فِي الْأَرْضِ بَعْدِ حِقْطَنْ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَرِّرَ وَغَرَّ فَإِنَّ ذَلِكَ لَوْنَ عَزَمُ الْأُمُورِ﴾

(٤٢/ الشوری: ٣٦-٤٣)

”اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نہماز ادا کرتے ہیں اور انکے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدله لیتے ہیں اور برائی کا بدله ویسی ہی برائی ہے، تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدله لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر اخ خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناقص فساد مچاتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبه جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سبھے لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔“

﴿أَعَدَّتُ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَاءِ وَالْكَاطِلِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(٣/١٣٣-١٣٤، آل عمران)

”جنت ان پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ اجھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿أُولَئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرْكَبَتِينَ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ الشَّيْئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَهُمْ يُنْفِقُونَ وَإِذَا سَمِعُوا الْغَوْآءَ عَرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَامِعِينَ لَا يَنْتَقِي الْجَهِيلِينَ﴾

(٢٨/ فصل: ٥٤-٥٥)

”یہ وہ ہیں جن کو دہرا ثواب ملے گا۔ اس لیے کے انہوں نے صبر کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی

بیہودہ بات سنتے ہیں، تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم نا سمجھوں کو نہیں چاہتے۔“

((وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُجَّتِهِ مُسْكِنًا وَتَبَيَّنًا وَأَسِيرًا)) (٧٦/الدھر: ٨)

”اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے، مسکین، شیم اور قیدی کو کھلادیتے ہیں۔“

ان آئیوں کی اور اسی قسم کی دوسری آئیوں کی جو شریعؐؑ کی خضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنة کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جواہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جودعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

((وَاهدِنِي لِأَحْسِنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسِنِهَا إِلَّا أَنْتَ وَاصْرَفْ عَنِي سَيِّئَاتِهَا
لَا يَصْرِفْ عَنِي سَيِّئَاتِهَا إِلَّا أَنْتَ)) *

”اور اے میرے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر، تیرے سو کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا، لیکن تو۔“

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا:

((اَكْمَلَ الْمُؤْمِنِينَ اِيمَانًاً اَحْسَنُهُمْ خَلْقًا)) *

”مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔“

یہ حدیث ترمذی، ابن حبیبل، ابو داؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو شہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے، کہبھی وہ پھل ہے، جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جواہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاق حسنة کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف

* صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب صلوٰۃ النبی ﷺ و دعاءہ باللیل: ۱۸۱۲۔

* ابو داؤد، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانہ: ۴۶۸۲؛ جامع ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها: ۱۱۶۲؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۲۵۰؛ صحیح ابن حبان: ۴۷۹۔

کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا:

((ان الرجل ليدرك بمحسن خلق درجة قائم الليل و صائم النهار))
 ”انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔“ *

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابو داؤد، ابن حبیب، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسن خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھادیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا:
 ((خیار کم احسنکم اخلاقاً)) *

”تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

((مامن شيء يوضع في الميزان انقل من حسن الخلق فان صاحب حسن
 الخلق ليبلغ به درجة صاحب الصوم والصلوة)) *

”(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوئی، لہ حسن اخلاق والا، اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔“

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حبیب، ابو داؤد) میں مختصر اصرف پہلا گلزار ہے، یعنی یہ کہ ”حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں۔“ * اس حدیث نبوی ﷺ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گران کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بنده کو اللہ کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے:

((خير ما اعطي الناس حلق حسن))

”لوگوں کو درت اللہ کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔“ *

۱۔ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق: ۴۷۹۸؛ صحيح ابن حبان: ۴۸۰؛ مستدرک حاکم، ۱/۶۰۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبي ﷺ: ۳۵۵۹؛ صحيح مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرة حیاته: ۶۱۳۳؛ مستند احمد، ج ۲، ص: ۱۶۱۔ * جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی حسن الخلق: ۲۰۰۳۔ * ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق: ۴۷۹۹؛ مستند احمد، ۶/۴۲؛ مستند عبد بن حمید: ۲۰۴؛ صحيح ابن حبان: ۴۸۱۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبیل، طبرانی اور ابن الہیشہ میں ہے، اس بشارت نے اخلاقی حسن کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے پالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((احب عبادَ اللَّهِ إِلَى اللَّهِ أَحْسَنُهُمْ أَخْلَاقًا)) ﴿۲﴾

”اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا:

((إِنْ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّي فِي الْآخِرَةِ مَجَالِسُ مَحَاسِنِكُمْ أَخْلَاقًا وَإِنْ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي فِي الْآخِرَةِ مَسَاوِيَكُمْ أَخْلَاقًا)) ﴿۲﴾

”تم میں میرا سب سے پیارا اور لذتمند تھے میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسدا اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک صحابی کی دو یویاں تھیں، ایک رات بھرنماز پڑھتیں، وہن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑویوں کی ناک میں دم کئے رکھتی تھیں، دوسرا یوی اس صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ”اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی اس بد خلقی کی سزا بھگتے گی۔“ اور دوسرا کی نسبت فرمایا کہ ”وہ جنتی ہوگی۔“ ﴿۲﴾ ان دونوں یویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پہنچ رہے تھے اسلام علیہ السلام کی زبان فیض تر زبان سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نہیاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بد وی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا: ”انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گرون کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلانی کے سوا اپنی زبان روک۔“ ﴿۲﴾ غور کیجئے کہ یہ حدیث

ابن ماجہ، ابواب الطب، باب ما انزل اللہ...، نسائی، الکبری: ۷۵۱۲؛ مستدرک حاکم، ۴/۳۹۹؛ احمد، ۴/۲۷۸؛ صحيح ابن حبان: ۶۰۲۹۔ ﴿۲﴾ معجم الکبیر للطبرانی: ۴۷۱۔

﴿۲﴾ صحيح ابن حبان: ۴۸۲؛ مستدرک حاکم، ۴/۱۹۳ میں بھی ہے۔ نوٹ: یہ تمام صدیشیں کنز العمال، ج ۲، کتاب الاخلاق باب اول سے مانوڑیں۔ ﴿۲﴾ ادب المفرد، امام بخاری، باب لا یوذی جارہ: ۱۱۹۔

﴿۳﴾ مشکل الآثار امام طحاوی، ج ۴، ص: ۲، حیدر آباد دکن۔

اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف و لوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی تدریس ایمان کے منشائیں زیادتی و کمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندر وی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیرِ دامن ہے، جس کی چک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا:

❶ ایمان کی ستر سے کچھ اور شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔

❷ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستے سے کسی تکلیف وہ چیز کو ہنا دو، (تاکہ تمہارے دوسرا سے بھائی کو تکلیف نہ ہو) ❸

❹ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے سے صرف اللہ کے لیے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں بٹتا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

❺ جس میں یہ تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مراجحت کے باوجود جھوٹ نے بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہست نہیں سکتا تھا۔

❻ تین باتیں ایمان کا جزو ہیں، مفلس میں بھی اللہ کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

❼ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے، جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

❽ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان: ۹؛ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۲۔ ❷ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۳۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوة الایمان: ۱۶؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال: ۱۶۵۔ ❹ کنز العمال: ۸۸، ۸۹۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان يحب لأخيه..... ۱۳۔

❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمين: ۱۰۔

- ⑧ ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ علیہ السلام! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ”(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا۔“ (سلام کرنا)
- ⑨ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے، فرمایا: ”اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا۔“ پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ”صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی کھانا۔“ (ساحت)
- ⑩ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلاکی نہیں۔
- ⑪ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے، نہ گالی دیتا ہے اور نہ بذریان ہوتا ہے۔
- ⑫ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہو گا، اللہ اس کی مدد میں ہو گا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔
- ⑬ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہیں، جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا، جب تک اس کا پڑاوی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔
- ⑭ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔
- ⑮ بے ایمان (منافق) کی نشانیاں تین ہیں، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت پر دکی جائے تو خیانت کرے۔
- ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے، کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخلیل کتنا اوپر انجام دیا جائے تو خیانت کرے۔
- ### اخلاق حسنہ صفات الہی کا سایہ ہیں
- لیکن اسلام نے اخلاقی حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخلیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ در حقیقت صفات الہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفات کالمہ کے اوپر تین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ
- بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام: ۱۲؛ مسلم، کتاب الایمان: ۱۶۰۔
 - ادب المفرد: ۳۱۲۔ ● صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم: ۲۴۴۲۔
 - صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحريم ایذا الجار: ۱۷۲۔ ● صحیح مسلم، باب الحث على اکرام الجار والضیف: ۱۷۳۔ ● صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۲۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۱۔ یہ تمام حدیثیں معتبر و مندرجہ کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد، ص: ۲۰۲۱ تا ۲۰۲۲ و ما بعد اور کنز العمال، جلد اول، کتاب الایمان، ص: ۱۱۶ تا ۱۱۷ سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں گرہم نے ان کے اتحاب میں مشہور و معتر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((حسن الخلق خلق الله الاعظم)) ﴿١﴾

(طبرانی) یعنی ”خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔“

ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں، جو صفات ربیٰ کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منانی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرا میں نہیں کیا جاسکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پر جلال صفتیں بھی ہیں جو صرف اللہ ہی کو زیبائیں، جیسے اس کی کبریائی اور برگائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے، کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، اللہ کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور اللہ کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تہذیب کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، ﴿۲﴾ اخلاق کا اس سے بلند تر تہذیب ممکن نہیں۔

﴿۱﴾ طبرانی فی الاوسط: ۸۳۴۴۔ ہم نے امامے الہی کی بحث میں اس اجھا کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۰۵، ۸۳۴۔ اطیع بذریعۃ موعود، ج ۳، ص ۳۳۲۔

اخلاقی معلوموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے، جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانوں کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق اس سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گز رجاء کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور حق یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے، وہ انہی کے صحیفہ تعلیم کا ایک درج ہے، مگر ایک تقدیمی نظریہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں پاہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درسگاه عالم کے سب سے آخری معلم ﷺ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے نوع انسانی کے اخلاقی معلومین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا ﷺ، بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے، جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انہی اور مصلحین دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے، تینیوں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا مأخذ "حکم خداوندی"، کو قرار دیا، اس حکم و فرمان الہی کے سوالان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقین نکتوں کی گرد کشاوی ہے اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و نایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے، مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو یہ کیف اور بے لذت مگر

ع یار ما این دارد و آن نیز هم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی و قیقری، فرمان الہی اور اخلاقی نکتہ دری، امر ربانی اور حکم فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انہی اور حکماء میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انہی کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی اور ان کے مقدس کارناٹے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر و برکت کی سلسلی، بن کر منتکتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا داناۓ روزو فلسفی جس کی اخلاقی تحریک طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا می خیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندر ورنی جذب، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سار غ لگایا ہے، عمل کے خاتما سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک اچھے بلند نہ ہوگی، وہ گودوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی راہنمائی کامدی بتاتا ہے، مگر خود عمل کی ہر رہا میں بھکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور شتموں سے محبت کرنا وہ نہیں

جانتا، وہ سچائی اور استیازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود چاہا اور استیاز نہیں ہوتا۔ اس واقعہ کا درس انتیجہ یہ ہے کہ جو نکہ وہ محض زبان یاد مانگ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے شناخت ہو جاتی ہے اور انبیا علیہم چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جوان کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جوان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے، اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نہیں کو معطر بنادیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیا اور حکما، یعنی موسیٰ علیہ السلام، سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کردہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھپن کر نکل رہی ہے۔ مگر اس وصف میں سارے انبیا علیہم یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادھر کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہل صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ رواجتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الفرض ایک کامل و مکمل اور آخري معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اتنا نہایت ضروری ہے۔

① اس کی زندگی کا کوئی پہلو پر وہ میں نہ ہو۔

② اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

③ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامیعت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کار آمدگروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پرده زندگی

تفقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیا اور نبیوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی تیغبر اسلام علیہ السلام کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں، دنیا کا کوئی تیغبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے، جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے ناقب ہو کر گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراة کے تیغبروں میں سے کون سا تیغبر ہے، جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے، جن کو توراة کے راویوں نے ان مخصوص بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزمات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام

سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطیریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے بھی موجود ہی؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تینتیس (۳۳) برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی مigrations و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پرداہ میں نہیں؟

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیان مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہتو تو معلوم ہو گا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر تاواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باور تھا اسمتح کے کہ ”یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو و زر و شن کی طرح نمایاں ہے۔“ ۱ آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمان راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوٹ میں کرتے دیکھو، اس کو جلوٹ میں بر ملا بیان کرو، جو جو جرہ میں کہتے سنواں کو پھتوں پر چڑھ کر پکارو، ((الافتیلیغ الشاهد الغائب)) ۲

قول کے ساتھ عمل

اب وسری حیثیت سے غور کیجئے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پرتا شیر واعظ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی مخصوصانہ باتیں، سچائی اور استعاری کی فضیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور لکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے نہیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس مخصوص واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجادی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو اللہ کی راہ میں لٹانا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے۔“ ۳ کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔“ کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”دشمنوں کو بھی پیار کرو۔“ ۴ کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”اگر تمہارے دانے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔“ ۵ کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔“ ۶

۱ با سور تھا اسمتح کی کتاب سیرت محمد ﷺ ص ۱۰۸۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ رب مبلغ ۶۷۔ ۳ انجیل، متی باب، ۱۹، ۲۳۔ ۴ انجیل متی باب: ۴۴-۴۵ ولوقا باب: ۶، ۲۷۔ ۵ متی باب، ۳۹۰۵۔ ۶ ایضاً ۴۱۔

کیا ایسی فیاضی اس سے خوب بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح غائبؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ انجلیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا ہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو عతنه دیا، کہ «أَنْعَوْنَ النَّاسَ إِلَىٰ لَيْلٍ وَتَشْوِيْنَ أَنفُسَكُمْ» (٢/ البقرة: ٤٤) ”کیا اور وہ کوئی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔“ اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ «إِنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مُفْتَحًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ يَقُولُوا مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝» (٦١/ الصاف: ٣-٢) ”تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔“

ایک شخص نے آ کر امام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: ”کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کان خُلُقُ القرآن -“ جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا، اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کہانے میں زہر دینے والوں سے درگز رکیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنہوں نے آپ ﷺ پر تیر بر سارے اور تکواریں چلا میں، مسلک ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مناگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور راہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم صورتوں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محسوس اللہ ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور پیغمبر کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا۔ فرمایا:

﴿فَقَدْ لِمِتُ فِي كُمْ عُمَراً إِنْ قَبْلَهُ أَفْلَأْ تَعْقِلُونَ﴾ (١٠ / يومنٌ ٦)

"(اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے یہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں

“

^١ أبو داود، كتاب التطوع، باب في صلوة الليل: ١٣٤٢؛ صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب في قيام الليل: ٢٥٤٢.

پھر آپ ملیٰ نبیم کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ حُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم: ٤)

”(اے محمد ملیٰ نبیم!) بیٹک آپ تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔“

کامل و مکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھوکر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلوموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدی اور بحری کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جن کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفہ وجی نے بار بار اعلان کیا:

﴿يَتَّلَوُ عَلَيْهِمْ أَيْتَهُ وَيَذْكُرُهُمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَبُ وَالْجِلَامَةُ﴾ (الجمعة: ٢)

”وہ ان کو اللہ کی با تم سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔“

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے، کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی با تم سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گناہگاروں کو نیک، انہوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنادیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملہ بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تھیس ہر دس کے بعد وہ اخلاق کے اس اون کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاقی کا تنوع

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نہیاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کتب میں عفو و رگز کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ اعظم میں آ کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پار ہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس

کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوئے ادب تھے کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوڑ ہوتے ہیں، مدینۃ النبی ﷺ کی اس درگاہ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت بھوروں کے پتوں سے اور ستون بھوروں کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی ﷺ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابو مکرم عمر عثمان وعلیٰ علیہما السلام جیسے فرمائز ازیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہ وزیر و معاویہ و سعد بن معاذ و سعد بن زبیر علیہما السلام جیسے ارباب رائے و مدیر ہیں، کہیں خالد ابو عبیدہ، سعد بن وقار، اور عمر بن العاص علیہما السلام جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مفمن بنئے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجتمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کلتی تھیں، کہیں ابوذر وسلمان وابودراء علیہما السلام جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسجح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفو والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت علیہما السلام فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاوں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشت ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تغزیت نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا ہے اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجود ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا غلس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ❶

❶ اس موقع پر مدرس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظرڈال لینے چاہیے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دریکے لیے فلسفہ اخلاق کے کامنوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے، جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب و مل کی تلاش، ان کے اصول و قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعمیں، یونانیوں کے عبید میں شروع ہوئی اور موجودہ عبید میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب و مل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلاسفوں میں قدموں قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگوتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکوں پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑھکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمجھنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدمیں مسلکوں کی تشریح ہیں، جنہیں یونانی اصطلاح میں ”رواقیہ“ اور ”لذتیہ“ کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ”ضمیریہ“ اور دوسرا کو ”افادیہ“ کہہ سمجھے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے، پہلا فریق اخلاق کی بنا ”خذ بات“ پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ”عقل“ پر، پھر اس منشاء اخلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسٹو اور اس کے تبعین نے اخلاق کا بنی نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی تحقیقت اور اصل مأخذ کی نسبت بھی بے انہا اختلافات ہیں، علماء اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، اللہ کا قانون، فطرت کا قانون، حاسمه اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تفہیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانین اخلاق کی وحی والہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی مأخذ سے، جو لوگ وہی و الہام پر ایمان نہ لاسکے، انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی مأخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی مأخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر جھوٹوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انہوں نے باختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص حاسمه اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخري طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا مأخذ قرار دیا، جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا مأخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم، یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لاحالہ اس بیرونی مأخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندر وہی مأخذ کو اصل مبنی قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے، مصنوعی اور ساختہ پر وارد تباہ پڑے گا، جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال دنیا کا کوئی مذهب ایسا نہیں جو اخلاق کا مأخذ اللہ کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا

ہے کہ اللہ نے اپنے ان احکام کو جی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے، تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الہی کی آواز اس کو پکار کر بشار کر دے، فسفیانہ کاوشوں اور موشاہگاریوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ نظریے باہم کی قدر مختلف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متفاہین کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں، ہو سکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا مأخذ اللہ کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی مأخذ اور حرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں، اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توفیق ممکن ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے، محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض بمحض کراس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحاںی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جھتیں ایک کام میں جمع ہو سکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، اللہ کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے سرست بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہو سکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جاری ہو، اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قوی کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لاکن ہے۔

الغرض اللہ کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسہ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی ہی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے، کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں، جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیاتِ الکیم، زبان، نہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ، صدھا اخلافات کے باوجود دنیا کی ساری قویں بلا دلیل متفق اور متجدد ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح نظرہ ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قوی اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مریئات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں، جس طرح

ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و فتح، خوبصورتی اور بد صورتی کا، میا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحاںی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تعلیمِ محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمانی اشارات کیے ہیں، مگر اس نے اس نکتہ کو فرماؤش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں، بلکہ ان کے عمل میں ہے، اس لیے ”علم با عمل“ کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ”عمل بلا علم“، کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں ان کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ فرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ اللہ کے احکام ہیں، وہ اللہ کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر رودیعت ہیں، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجودان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے، ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا روحاںی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کسی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقش ہوگا۔ ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اس کا وجودان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحاںی مسrt بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قوی میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہو گی، اتنا ہی اس کا روحاںی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس تو فتن میں کسی ہوگی کہ اللہ کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجودان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اس سے اس کو روحاںی مسrt اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحاںی و ایمانی کمال میں نقش پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیں، لیکن اگر ہمارا اندر وہی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو را سمجھاتی ہے، تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے اللہ کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحاںی تکمیل کا نقش ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجودان یا حصول مسrt یا افادہ عام کی غرض سے انجام دے، مگر اللہ کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور ترزیک یہ روح کا ذریعہ نہیں۔
بے غرضی

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے، اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی

نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کاموں کو چھوڑ کر، دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے، ہم کسی مہمان کی لئنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت جن دیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطرداری کی تدبیح میں ذاتی نفع، یا ریا کاری یا نمائش یا خوشامدیا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطرتواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے، لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں، تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہائی رہے گی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں، تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت

اسی لیے آنحضرت نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندر وہی غرض و غایت کو ہر اچھے اور بے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندر وہی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دوستالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کورات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلا یا کہ اس کو یقین تھا کہ رہا کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے، یا خخت تکلیف پہنچا میں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندر ہیرے میں بہک کر دوسرے راستے پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشریفوں کی تھیلی راستے میں پڑی ملی، تو گواں سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور یہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندر ہیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کورات کے اندر ہیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستے میں کسی گڑھے یا کنویں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مر تکب نہ ہو گا، کہ گوجانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب لکھا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹا اتحا، اتفاق سے وہ راستے میں گر گیا جب میں راستے سے واپس پلٹا، تو ایک بٹا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے، چکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مر تکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹا مجھ کو سڑک پر پڑا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستے میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی برئی نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا،

مگر در حقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف سے سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت میں اس کا دل گناہ گار ہو چکا اور دوسرا صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الناذع اب کا باعث ہو گا، اسی طرح آپ اگر کسی مغذو رکی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے، تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیک کام شمارہ ہو گا، سورہ آل عمران میں ہے:

﴿وَمَنْ يُرِدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدُ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾

(۱۴۵/آل عمران)

”اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے، جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔“

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھوا ہوا اسکی

حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تُبْطَلُوا صَدَقَاتُكُمْ بِالْمُنْعِنِ وَالْأَذْنِ لَا كَلَّذِنِي يُفْقِي مَالَكَ إِنَّمَا الْكَافِسِ

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۲۶۴/ البقرة)

”اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان و ہمدرکر اور ستار کر بر بادنہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو

بر باد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔“

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جن کی تفسیر میں آنحضرت نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

﴿إِنَّمَا الْأَعْمَالَ بِالنِّيَاتِ﴾

”انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔“

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

﴿وَلَكُلُّ امْرٍ مَانُوْيٍ فَمَنْ كَانَ هَجَرَتْهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهُمْ جُرْتُهُ إِلَى اللَّهِ

وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَ هَجَرَتْهُ إِلَى دُنْيَا يَصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٌ يَتَزَوَّجُهَا فَهُمْ جُرْتُهُ إِلَى مَا

هَاجَرَ إِلَيْهِ﴾

”هر شخص کے لیے وہی ہے، جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی هجرت اللہ و رسولہ فہم جوڑتے الی اللہ“

کی هجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی هجرت کی غرض دنیا کما نا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ

اس سے نکاح کرے، تو اس کی هجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے هجرت کی۔“

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو

**** ۱) صحیح بخاری، کتاب بدء الوضو: ۱ و کتاب الایمان، باب ان الاعمال بالنیۃ والحسنۃ: ۵۴۔ ۲) ایضاً۔

خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہوتا اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و تائش کے حدود سے باہر اور دھانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفہ اخلاق کی تائید

آنحضرت کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے، جس کی حرفاً بحرفاً تائید جدید فلسفہ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان ایں میکنزی، اپنی تصنیف "مینول آف آنھلکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے: جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے، یعنی فعل ارادہ، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت، ہی کا تلا نا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔

اس مسئلہ کی ایک دو مشالیں دے کر کیفیت کی رائے نقل کی ہیں:

"اسی لیے کیفیت نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو قصد یقین کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ "بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جاسکے۔"

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا، ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندر ورنی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے، جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجھ میں ہوں یا تہائی میں، انہیں میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے، جس کی آنکھیں اس کے دل کی تھے کو ہزار پر دوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے آپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا، جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جانکریں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اللہ اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے، کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تُبْطَلُوا صَدَقَاتُكُمْ بِالْمُتَّمَتِ وَالْأَذَى لَا كَلَّذُبٌ يُنْفِقُ مَالَهُ إِنَّمَا اللَّائِئَةُ لِلثَّالِثِ وَلَا كَلَّذُبٌ مَنْ يَأْتِي لَهُ وَالَّذِي هُوَ الْأَخْرَى﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۴)

● علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، ص: ۱۰، امتیاز جم پر فیسر عبد الباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ: ۱۹۷۳ء۔

”اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کریا ستا کر بر باد نہ کرو، جس طرح وہ بر باد کرتا ہے، جو اپنے ماں کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔“
یہی ایمان صحیح جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے، آب حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جونہ ہوتا ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

﴿وَالَّذِينَ كُفَّرُوا أَعْمَلُهُمْ كَسَرَابٌ يَقْعِدُهُ الظَّهَانُ مَا ظَاهِرٌ حَتَّى إِذَا جَاءَهُمْ نَهَمْ يَجِدُهُ شَيْئًا﴾ (۲۴/ النور: ۳۹)

”اور جو اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں، جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔“
یہی وہ مشعل ہے، جو ہماری تیرہ و تاریزندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہوتا ہم کو ہر طرف اندر ہیرا ہی اندر ہیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

﴿أَوْ كَظُلْمَتِ فِي بَحْرٍ لَّيْسَ يَقْعِدُهُ مَوْجٌ وَّنْ فَوْقَهُ مَوْجٌ وَّنْ فَوْقَهُ سَحَابٌ طُّلُمَتْ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ طِإِذَا أَخْرَجَهُ دَهَّ لَمْ يَنْدِرِيهَا طَوْمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ نُورًا فِي الْأَلَّهُ مِنْ نُورٍ﴾ (۲۴/ النور: ۴۰)

”یا (اللہ اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندر ہیرے میں گھرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے، اس لہر پر دوسرا لہر ہے، اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوچتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشن نہیں دی اس کو نہیں روشن نہیں۔“

جب تک کسی واقف اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہرجیش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا، دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایا اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غرض و غایت

اسی لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے، جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قابل ہے، تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قابل کس کام آ سکتا ہے، حکماء اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے، سفر اطا، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسوں نظریے قائم ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت کا راز اب تک آٹھ کار انہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضیں اور رعایتیں ہو سکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک با آرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پنج کے بڑھا خوش ہو کر ہم کو مزدوروی اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستے چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑائیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے، تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے مبتاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرك ہو سکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے، تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جار ہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گوپت مقصد ہے، بلکہ پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برداشت کرے، مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تدبیح میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی لگا ہوں گے گرجاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر نہ ہی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں، لیکن درحقیقت اس میں بھی گواں دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیمِ محمدی ﷺ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں:

سے طاعت میں تار ہے نہ مے و انگلیں کی لاگ دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلانی میں تمیز کر لیتا

ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرہ رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے، ہر اچھے یا بے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پرده سے تھیسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت، یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر درب بھی جاتا ہے، میں سبب ہے کہ ہرگناہ کے پہلے کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گناہ گاری کے تخلیل سے شدید ہنگی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی بخالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ درب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پیشانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات و دلیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿فَالْأَمْمَهَا مُجْوَرٌ هَا وَتَقْوَهَا﴾ (۹۱/الشمس: ۸)

”ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کرو دی ہے۔“

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر بارے ہر بارے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وہی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام ”نفس لومہ“ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورہ قیامد میں ہے:

﴿وَلَا أَقِيمُ بِالنَّفَسِ الْوَآمِةَ﴾ (۷۵/القيامة: ۲)

”اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برا بیوں پر ملامت کرتا ہے۔“

آگے چل کر فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَنْسَانَ عَلَى نَفْسِهِ بَوَيْرٌ وَلَوْلَا الْفَلْقِ مَعَاذِيرٌ﴾ (۱۵-۱۴/القيامة: ۷۵)

”بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔“

نواس بن سمعان انصاری رضی اللہ عنہ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا، فرمایا: ”نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کٹک جائے اور تھک کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں۔“ اسی طرح وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ نام ایک صاحب خدمت نبوی میں نیکی اور گناہ کی حقیقت

* مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم: ۶۵۱۷، ۶۵۱۶، مستند احمد، ج ۴، ص: ۱۸۲۔

دریافت کرنے کی غرض سے آئے چاروں طرف جان ثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ”وابصہ قریب آ جاؤ۔“ جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا: ”اے وابصہ! میں ہتاوں کشم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے؟“ عرض کی، حضور ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: ”وابصہ! تم مجھ سے یہکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو۔“ عرض کی بیچ ہے یا رسول اللہ ﷺ فرمایا:

((يا وابصه! استفت قلبك واستفت نفسك البر ما اطمأن اليه القلب واطمأنت اليه

النفس والاثم ما حاك في القلب وتردد في النفس و ان افتاك الناس)) ﴿١﴾

”اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر، اپنے نفس سے فتوی لیا کر، یہکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طہانتی پیدا ہوا اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھلکھلے اور نفس کو ادھیر بن میں ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتا میں۔“

یہی وہ حاسہ اخلاقی ہے، جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش میں آ کر جب تو بہ واستغفار کرتا ہے اور پیشان و نادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مت جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا ہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

((اَنَّ الْعَبْدَ اذَا اخْطَأَ حَطِينَةً نَكِتَتْ فِي قُلُوبِهِ نَكِتَةً سُودَاءً فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ

وَتَابَ صَقَلَ قُلُوبَهُ وَانْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّىٰ تَعلُوْقَلِيهِ))

”بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور اللہ سے مغفرت مانگی اور توبہ کی، تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔“

اس کے بعد فرمایا: ”یہی وہ دل کا زنگ ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿كَلَّا لَيْلَةً رَأَى عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (٨٣ / المطففين: ١٤)

”کبھی نہیں، بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔“

آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں فرمایا: ”منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ

﴿ مسنند احمد، ج ٤، ص: ٢٢٨۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

﴿ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر آیت مذکور: ۲۳۳۴۔

کے ادھر ادھر دونوں طرف دو یواریں کچھی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں، لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستے کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستے پر سیدھے چلے چلو اور ادھر مژونیں جب کوئی راہ گیر اللہ کا بندہ چاہتا ہے، کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پرداہ اٹھائے تو اپر سے ایک منادی والا پکار کر کہتا ہے: ”خبردار پرداہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔“ پھر فرمایا: ”یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پرداہ اس کے حدود ہیں اور راستے کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اور کامنادی جو پکارتا ہے.....:“

((هو واعظ الله في قلب كل مؤمن)) *

”وَهُنَّا كَاوِهٗ وَاعْظَمُهُ بَعْدَهُ جُوْهُرِ مُوسَى كَمْ قَلْبٍ مِّنْهُ هُنَّ“۔

کیا کسی بڑے سے بڑے خمیری نے بھی اخلاقی خمیری کی اس سے بہتر تشریع کی ہے۔

مسرت و انبساط

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصوں کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گوتمام ترجیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرك نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی ماڈی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی منائج ہیں، ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شرہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرك، عدالت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ اللہ اور اس کی رضا مندی کا حصول۔ اس تشریح کے بعد معلوم ہوا گا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی تعلیم نے حکماء اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترجمیں کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض و غایت نہیں، بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علماء اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ سرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفہ الہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَلِكُنَّ اللَّهُ حَسْبَكُمُ الْأَيَّامَ وَرَبِّكُمُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّةُ إِلَيْكُمُ الْكُفْرُ وَالْفُسُوقُ

وَالْعُصْبَانَ طَأْوِيلَكَ هُمُ الرَّشِيدُونَ ﴿٤٩﴾ (الحجرات: ٤٩)

”لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں ایچھا کر کے دھایا اور کفر

^{٤١} مشكوة، باب الاعتصام بالكتاب والسنة: ١٩١ بحوله احمد، ٤، ص: ١٨٢ ويعقى في شعب الایمان: ٦٨٢١ تبر مذى: ٢٨٥٩ مختصر ا.

اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ یہک چلن ہیں۔“

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

((اذا سرتک حستنک و ساء تک سینتنک فانت مؤمن)) ❶

”جب تمہاری نیکی تم کو خوش بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔“

((من سرتہ حسنة و ساء تہ سینہ فہو مؤمن)) ❷

”جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنادے وہ مومن ہے۔“

((من عمل سینہ فکرہها حین یعمل، و عمل حسنة فسر فہو مؤمن)) ❸

”جس نے جب کوئی برائی کی، تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو سرست ہوئی وہ مومن ہے۔“

غرض نیکی پر سرست و انبساط اور انشراح خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پیچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر تمیم کے ساتھ فرقہ، لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی لٹھج فرمادی ہے۔

رضائے الہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک بچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسرا غرض کو اپنے ٹھام کی بینا و نہیں بینا چاہیے، یعنی آکر فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نہیں ہوتا ہے، حکماء اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معلم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دیں چاہیے، انسان کے پاس دو ہی دو لیں ہیں، جان اور مال اور انہی مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، ایثار اور حسن عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

﴿وَعِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّقِي نَفْسَهُ أَيْغَأَهُ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعَبَادِ﴾

(۲۰۷/ البقرة)

”بعض ایسے ہیں، جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر

❶ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۲۵۱، ۲۵۲ و مستدرک حاکم، کتاب الایمان، ج ۱، ص: ۱۴ و مختصر شعب الایمان بیهقی، ص: ۵۲ مطبع سعادت مصر، وابن حبان: ۷۲۰۴؛ ترمذی: ۲۱۶۵ و ابو داود، و عن عمر بن الخطاب۔ ❷ طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ، کنز العمال، ج ۱، ص: ۳۷۔

❸ مستدرک - کم، کتاب الایمان، ج ۱، ص: ۱۳۔

مہربان ہے۔“
پھر مال کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَكَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ إِلَيْقَاءً مَرْضَاتٍ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنی دولت اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔“

﴿وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا إِلْيَقَاءً وَجْهَ اللَّهِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۲)

”اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔“

﴿وَمَنْ يَقْعُلْ ذَلِكَ إِلْيَقَاءً مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسُوفَ تُؤْتَنُهُ أَجْرًا عَظِيمًا﴾

(۴/ النساء: ۱۱۴)

”اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا، تو ہم اس کو برا جردیں گے۔“

﴿وَالَّذِينَ صَرُّوا إِلْيَقَاءً وَجْهَ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًا وَعَلَانِيَةً

وَيَدِنَّهُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أَوْ لَيْكَ لَهُمْ عَقْبَى الدَّارِ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۲۳)

”اور جنہوں نے اللہ کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جوان کو دیا ہے، اس میں کچھ چھپے

اور کھل طریق سے خرچ کیا۔ اور برائی کو نکلی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچلا گھر۔“

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورہ لیل میں کھوئی گئی ہے:

﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَرَكِّبُ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَكَ مِنْ يَعْمَلٌ مُجْزَى إِلَّا إِلْيَقَاءً وَجْهَ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾

(۹۲/ الیل: ۲۰-۱۸)

”جو اپنام صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے، جس کو

ادا کرنے کے لیے دیتا ہو، بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔“

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں:
یا رسول اللہ ﷺ اکوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنمیت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلانے، کوئی
اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو، تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے، فرمایا: ”اس کو جو اس لیے لڑتا
ہو کہ اللہ کی بات بلند ہو۔“ * ایک دفعہ ارشاد فرمایا: ”گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب، کسی کے لیے
پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو باندھتا ہے، تو اس
کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو تواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورتہ اس لیے باندھتا ہے کہ
اللہ نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ حرم و شفقت کے ساتھ

* صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب من قاتل لنکون کلمة الله هي العليا:- ۲۸۱۰

اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے۔^۱ اس تعلیم کا سب سے موثر بیان وہ ہے جس کو تمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زار زار روئے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہرامت اپنی جگہ پر لگھنے لیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہو گا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھنے گا، کیا میں نے تھوڑے سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارتھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا ”بار الہا میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے، تو دنیا میں تھوڑے کہا جا چکا، (یعنی تو اپنابدلہ پاچکا) پھر دو تمنہ سے اللہ فرمائے گا: کیا میں نے تھوڑا پر دنیا کو کشاوہ نہیں کیا، یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا، تو میں نے جو کچھ تھوڑا کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہو گا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا جنی ہے، تو یہ تھوڑا کو دنیا میں کہا جا چکا، (تو اپنابدلہ پاچکا) اس کے بعد وہ لا یا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا، تو اللہ اس سے دریافت کرے گا، تو کس بات کے لیے مارا گیا؟ کہہ گا اے اللہ! تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں اڑا، یہاں تک کہ مارا گیا، اللہ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، اللہ کہے گا تو تو اس لیے اڑا تھا کہ لوگ تھوڑا کو بہادر کہیں، تو دنیا میں تھوڑا کیا جا چکا۔^۲ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔“^۳ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حدیث کو سن کر بہت روئے، پھر بولے اللہ اور اس کا رسول چاہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یا آیت پڑھی:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نَوْفٌ إِلَيْهِمْ أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُغْنِونَ^۱
أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا التَّارُّ^۲ وَحَجَطٌ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَلِطَّلْ مَا كَانُوا^۳
يَعْمَلُونَ^۴﴾ (۱۱ / هود: ۱۵-۱۶)

”جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے،

^۱ صحيح بخاری، کتاب الجہاد، باب الخیل ثلاثة: ۲۸۶۰ و کتاب المناقب، باب علامات النبوة فى الاسلام: ۳۶۴۶ و کتاب الاعتصام بالكتاب والسنۃ باب الاحکام التي تعرف بالدلائل: ۷۳۵۶، صحيح مسلم، کتاب الزکوة، باب اثم مانع الزکاة: ۲۲۹۰، ۲۲۹۲، صحيح مسلم: ۲۲۹۲، ۲۲۹۰.

^۲ جامع ترمذی، ابواب الزهد باب ماجاء فی الریاء والسمعة: ۲۳۸۲۔

بے کم و کاست، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر دوزخ، اس دنیا میں انھوں نے جو بنایا وہ مست گیا اور جو کیا وہ بر باد گیا۔“

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضاۓ الہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذاتِ الہی ہو جاتی ہے:

﴿وَمَا تُفْقِدُنَّ إِلَّا إِيمَانَهُ وَجْهَ اللَّهِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۲)

”اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔“

﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا إِيمَانَهُ وَجْهَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۲/ الرعد: ۲۲)

”اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔“

﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ يَعْلَمٌ تُبْعَذِيَ إِلَّا إِيمَانَهُ وَجْهَ رَبِّهِ الْأَكْلِيَّ﴾

(۲۰/ الیل: ۹۲)

”اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتنا نے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔“

اخلاقی احکام کی شعیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَأَلَّا تَقْرُنِ حَقَّهُ وَالْمُسْكِنَ وَإِلَيْنَ السَّيِّلُ مَذْلُوكٌ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ

وَأَوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۸)

”تورشتہ دار کا حق ادا کرا اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔“

نمادب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اصول اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے، تورات نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریع نہیں کی جاتی، انجلیں میں لفظی صنایعوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیادی قائم نہیں کی گئی ہے، تاہم عیسائی نہ ہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر ان کی بنیاد حد و درج کمزور ہے، ان میں سے پہلا مسئلہ خودا صل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے، یا گناہوں سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہ کا ہو تو ابھی پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایہ غیر ہے، کیونکہ اس کے باپ

اور ماں حضرت آدم اور حضرت آکنہ ہگار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلواس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک تھسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہ ہگار مرا اور آسمانی باوشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیونکہ صحیح علیہ السلام کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔ لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جدا گا نہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے: ﴿فِطْرَةُ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ٣٠) "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔" پھر آئست بِرِتْكُم کے اذی سوال کے جواب میں بلی یعنی اللہ کا اعتراف، ہر انسان روز ازل کر چکا ہے، اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازالی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا، اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوح فطرت پر جوزریں حروف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اس کو ابھار کر چکا دیتا ہے، یا مٹا دلتا ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (الثین: ٤)

"ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔"

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿الَّذِي خَلَقَكُ فَسُولُكَ فَعَدَلَكَ فِي كُلِّي صُورَةٍ مَا شَاءَ رَبِّكَ﴾ (الانتصار: ٨٧)

"جس اللہ نے تجوہ کو بنایا، پھر تجوہ کو برابر کیا، پھر تجوہ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجوہ کو جوڑ دیا۔"

یہ آیت سورۂ انظار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا اوسرا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا ہے، اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں، یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخشنا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قوی کا اعتدال داخل ہے، دوسری آئیوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں ہے:

﴿سَيِّدِ اسْمَرِ إِلَكَ الْأَعْلَىٰ الَّذِي خَلَقَ فَسُولِيٌّ وَالَّذِي فَدَرَ فَهَدَىٰ﴾

(الاعلیٰ: ۲-۱)

"اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر، جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر را دکھائی۔"

راہ دیکھنا، یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح و دیعت رکھا ہے، جس طرح اس میں دوسرے میسوں تو کی اس نے دیعت رکھے ہیں، سورہ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۚ تَبَكَّلَ يَوْمَ بَعْلَهُ سَيِّعًا ۚ بَصِيرًاً إِنَّا هَدَيْنَاهُ إِلَى السَّبِيلِ إِنَّا شَاكِرًا وَإِنَّا لَغُورُوا﴾

(الدهر: ۲-۷۶)

”ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچکے سے پیدا کیا، پلتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو ستار کیتا، ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گزار (نیکوکار) ہوتا ہے، یا ناشکر (بدکردار)۔“

غرض اس کو یہ راہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد اللہ کا شکر گزار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا براہو جانا خود اس کا کام ہے، سورہ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

﴿وَنَفِيسٌ وَمَا سَوَّلَهَا فَأَلْهَمَهَا قُوَّرَهَا وَنَقْوَهَا ۖ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ ذَلَّهَا ۖ﴾

(الشمس: ۹۱)

”وقسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا اور ناکام ہوا، وہ جس نے اس کو متی میں ملا دیا، (گندرا کر دیا)۔“

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار اور عصيان کرنیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام و دیعت ہے، اس لیے یہ کہا گیا:

﴿فَأَقْمُدْ وَجْهَكَ لِلَّذِينَ حَدَّيْقَاطَ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ

﴿ذَلِكَ الدِّينُ الْقِيمُ ۗ وَلِكَنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾

(الروم: ۳۰)

”سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا فاقم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنانے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔“

یہ دین فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں، جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ”ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا جوئی بنادیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کن نہیں پیدا ہوتا۔“ * اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی ﷺ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازالی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے

* صحیح بخاری ، کتاب الجنائز ، باب اذا اسلم الصبي : ۱۳۵۸، ۱۳۵۹: مسلم ، کتاب الفدر ، باب معنی کل مولود بولد علی الفطرة : ۶۷۵۵۔

انسانی ارواح سے دریافت فرمایا: «اللَّهُمَّ بِرَبِّكُمْ» ”کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟“ انھوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، (تلی) ”باں بیٹک تو ہمارا پروردگار ہے۔“ یہی ازی اور فطری اعتراض انسان کا وہ عہد ہے، جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ”دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آ و۔“

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے مخصوص اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لا کر نہیں آتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَتَرَدَّ وَأَنْدَدَةً وَذُرْ أَخْرَىٰ ط﴾ (۳۵ / فاطر: ۱۸)

”اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔“

﴿كُلُّ اُمَّيٍّ يُبَآ كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ (۵۲ / الطور: ۲۱)

”ہر قوم اپنے ہی عمل میں گردی ہے۔“

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((ا) لا يجني جان على ولده ولا مولود على والده)) ﴿۱﴾

”ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نبیٹے کے جرم کا باپ۔“

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گناہگار اور داغدار ہی تھہرایا ہے، انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بو جھر کھو دیا ہے، اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ تاکہ اس کو اپنے بچھے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہوا اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔ اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، علمکیں دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ مخصوص اور ناکردار گناہ بچھی گناہگار اور جنم کا ایندھن ہے، آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش و حواس اور عقل و تمیز سے پہلے تک مخصوص اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ ”اللہ کا قلم بچ سے اس وقت تک کے لیے اٹھادیا گیا جب تک وہ عقل و تمیز کو نہ پہنچ۔“ ﴿۲﴾

باقی حقیقتی کی یہ انسانی کلپاں جو بن کھلے مر جھا گئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے بھوول میں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے، وہ اللہ کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور

﴿ سنن ابن ماجہ، ابواب المنساك، باب الخطبة يوم النحر، ۳۰۵۵. ﴾

﴿ صحيح بخاري، كتاب الطلاق، باب الطلاق في الأغلاق والكره، رقم الباب: ۱۱؛ كتاب الحدود، رقم الباب: ۲۲ وترمذى، أبواب الحدود ما جاء في من لا يجب عليه الحد: ۱۴۲۳. ﴾

ان کو جنت میں لے جائیں گے۔^۱ آنحضرت ﷺ کے شیرخوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا: ”یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پینے گا۔^۲ اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے؟ فرمایا: ”اللہ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے۔^۳ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی، ایک دفعہ رویا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا، فرمایا: ”یہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مر گئے۔^۴ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ”اور مشرکوں کے بچے بھی۔^۵ ان تصریحات کا تبیہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کسمی میں مرجانے والے بچے کو تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن جو نکل غائب پر حکم لگانا صرف اللہ کا کام ہے، اس لیے تصریح اکسی خاص بچے کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ نے مناسب نہیں سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سانحہ کوں کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ اس کو مبارک ہو یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔ فرمایا: ”اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کئے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ۔^۶

ایک طرف یہ سایت ہے جو پتھر پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھوکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعاء لکھنے کی تعلیم دیتا ہے، ”اے اللہ! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔“ احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ”وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔^۷

خوف و رجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلاسفوں میں دو گروہ گزرے ہیں، ایک کو رونے والے فلاسفی، دوسرے کوہنے والے فلاسفی کہتے ہیں، پہلاً اگر وہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نا امیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارز از نظر آتی ہے، دوسراً اگر وہ وہ ہے، جس کو دنیا میں چہل پہل،

^۱ صحيح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من يموت له ولد: ۶۶۹۶۔ ^۲ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلاة على ابن رسول الله ﷺ: ۱۵۱۱۔ ^۳ صحيح مسلم، کتاب القدر: ۶۷۶۲۔

^۴ صحيح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعییر الرؤيا بعد صلارة الصبح: ۷۰۴۷۔ ^۵ یہ حدیثیں صحيح مسلم، کتاب القدر: ۶۷۶۸ میں ہیں، نیز امام مودی کی شرح حلہم میں بھی یہ باب دکھنے اور باب فضل من يموت له ولد (د) ص: ۴۰۳، ۴۰۲

^۶ صحيح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عیسیٰ: ۱۹۳۔ صحيح بخاری، کتاب الحج، باب فضل حج البربر: ۱۵۲۱؛ ترمذی ابواب الحج، باب ماجاء في فضل الطواف: ۸۶۶۔

عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سو جھائی نہیں دیتا، پہلے گردہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو، کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کاظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دنوں رائیں تریم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوی سر دھو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا مل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تیزی نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دنوں گلیوں کے تجھ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سنا تا ہے، کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک اللہ کے سہارے جیسے کی تعلیم کرتا، اس کی شریعت میں اللہ سے نا امیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الظَّالِمِينَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۵۵)

”(ابراہیم) نا امیدوں میں سے نہ بن۔“

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی:

﴿وَلَا تَأْتِيَنَا مِنْ رَّوْحَةِ اللَّهِ لَا يَأْتِيُنَا مِنْ رَّوْحَةِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾

(۸۷: یوسف)

”اور اللہ کے فیض سے نا امید مت ہو، اللہ کے فیض سے نا امید وہی ہیں جو اللہ کے منکر ہیں۔“

اس امت کے گناہ کاروں کو کس پیارے خطاب ہوتا ہے:

﴿يَعْبَادُونَ اللَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللَّهِ﴾ (۳۹ / الزمر: ۵۳)

”اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو۔“

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر امید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گماں کے پاس رہتا ہوں۔“ * یعنی جیسا وہ میری نسبت گماں کرتا ہے، وہی اس کے لیے ہو جاتا ہے، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے:

﴿أَمْ مَنْ هُوَ قَاتِلٌ أَنَّهُ إِلَيْلٌ سَاجِدًا وَقَاتِلًا يَسْجُدُ إِلَّا الْخَرَقَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ﴾

(۳۹ / الزمر: ۹)

* جامع ترمذی، کتاب الزهد، باب ما جاء فی حسن الظن بالله تعالى: ۲۲۸۸

”بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھر یوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔“

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں یقینیں سیکھا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، اللہ کے غصب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ دراس کو غافل، پیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اس کو مایوس، غزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی، اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوئے انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے:

﴿وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ۝﴾ (النساء: ٤٠)

”اور تم کو اللہ سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔“

یہی وہ ذاتی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ابک مومن اور ابک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے، جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل ٹکستہ ہو جاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسرده ہو جاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے یہی کام کیا اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، اللہ کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنادیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خود کشیوں کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے متعدد ملکوں میں ذرا ذرا اسی ناامیدی پر خود کشی کر لینا ایک معنوی واقعہ ہن گیا ہے، جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خود کشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں، مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹی، امیر ہو کہ غریب، تدرست ہو کہ یہاں، اول دو لاکھ کے برابر اولاد، کامیاب ہو یانا کام، دو تین دن ہو یاد یوالیہ، ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے، مشکلات میں، بیکاریوں میں، بھتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ بہت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کافروں کو اس کے نمہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں، تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ

﴿أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ قِنْكُمْ﴾ (آل عمران: ٢٣)

”میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔“

اخلاق اور رہبانتی

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں، ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جور ہبانتی، تجدُّد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے، اسی لیے گوشه نشینی، عزلت گز نیتی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل و عیال، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو خود نیتی ہے، یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسرا کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دین داری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پرده اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظرؤں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اشکونمایاں کرنے اور اپنے کو بالاترستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسرا طرف اپنی زندگی کو زیر پرده رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دین داری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسرا طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملک و ملت کے فرائض و حقوق بجالانے کی تکلیف سے نج جائیں، اسی لیے اسلام نے اپنے اصول اخلاقی میں راہبانہ، جو گیا نہ اور مجردانہ زندگی کی بہت افرائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے، یہی طرز عمل خلافتے راشدین خلیفہ اور چند کے سواتماں اکابر صحابہؓ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجدُّد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا وپرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسرا کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مذکولات کو حاصل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ قیمتوں کے سر پرست ہیں؟ کیا وہ خلق الہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف، نهىٰ

عن انگلکار اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں؟ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے بھی بہترین موقع ہیں، اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿قُوَّةُ الْفُسُكُمْ وَأَهْلِنِيمْ نَارًا﴾ (۶۶/التحریر)

”تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔“

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ((کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته)) ”تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور مگر ان ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور مگر انی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چر وابا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوala اور بیوی اپنے شوہر کے مگر کی تکہبائی ہے۔*

جماعتی مصیبیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اس لیے وحی محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُبَيِّنُ الَّذِينَ طَلَّمُوا مِنْهُمْ خَاصَّةً﴾ (۲۵/الانفال)

”اور اس فساد سے بچو جو جن کو صرف گناہ کاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔“

بلکہ اس کی لپٹ گناہ کاروں بے گناہ سب تک پہنچ گی، کہ اگر جماعت اپنے تمدک کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پرواہ ہئے والے اشخاص کو بھی گناہ کاروں ہی میں شامل کیا ہے۔ دنیا درحقیقت جدوجہد اور دارو گیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستے میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں سبقیاً بہت کچھ تکلفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھا پنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معز کہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، یہی نے شب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے:

((الْمُسْلِمُ الَّذِي يَخْالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَا هُمْ خَيْرٌ مِّنَ الْمُسْلِمِ الَّذِي

لَا يَخْالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَا هُمْ))

”وَهُوَ مُسْلِمٌ جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف وہی پر صبر کرتا ہے، اس سے

بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف وہی پر صبر نہیں کرتا۔“

* صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المرأة راعية في بيت زوجها: ۵۲۰۰۔ * شعب الایمان بیہقی، ۶/۲۶۶ و جامع ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فضل المخالطة مع الصبر على أذى الناس: ۸۱۰۲، ادب المفرد، باب الذى يصبر على أذى الناس: ۳۸۸، ابن ماجہ، کتاب الفتین: ۴۰۳۲؛ احمد، ۴۲/۲۵۰۷

گوشه گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بچھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بچانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی بہت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر بالمعروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے یعنی وہ نہوں ہے، جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے داروہ میں اسی کی پیروی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا کچھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔“

امر بالمعروف و نهي عن المنكر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیمِ محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی گُمراہی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا دوسرا شرعی نام ”امر بالمعروف و نهي عن المنكر“ (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بُری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

﴿كُلُّمَا خَيْرٌ أَمْكَنَهُ أُخْرِجَتُ لِلْمُكَافِرِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

(آل عمران: ۱۱۰/۳)

”تم سب سے بہتر امت ہو، جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔“

﴿يَا أَمْرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْوَنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبۃ: ۹/ ۷۱)

”وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔“

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

﴿وَأَمْرُبِ الْمَعْرُوفِ وَإِنَّهُ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمان: ۳۱/ ۱۷)

”اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔“

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

﴿وَتَوَاصُوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصُوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر: ۳/ ۱۰۲)

* صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان - ۱۷۷ -

”اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدی کی ایک دوسرے کو فصیحت کرتے ہیں۔“

﴿وَتَوَاصُوا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصُوا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ (۹۰/ البلد: ۱۷)

”اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو فصیحت کرتے ہیں۔“

یہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور تو قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزان اور قوام کی تکمیلی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراة میں قائل کا یہ فقرہ کہ ”کیا میں اپنے بھائی کا رکھوا لہوں؟“ * عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ”شخصی آزادی کی بھائی“ ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوا لہا بنا یا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزر اک ((کلکم راع و کلکم مستول عن رعيته)) ”تم میں ہر شخص سے اس کے زریز مدداری لوگوں کی نسبت باز پر ہوگی“ * قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور بازار کھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہر لیا گیا ہے، تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضمالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیا بی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی مندر کے کنارے آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا اعلان یہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو بازار کھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور بازار کھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں بلاک کر دیا گیا ہے؟ لیکن ان پر جب عذاب الہی آیا تو صرف دوسرا گروہ نجی گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورہ اعراف کے بیسویں روکع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:

﴿وَإِذْ قَاتَلُتُ أَمَةً قَاتَلُهُمْ لَمْ يَعْظُمُنَّ قَوْمًا إِلَّا مُهْلِلُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا طَقَالُوا

مَعْذِرَةً إِلَى رَبِّكُمْ وَلَا هُمْ يَتَّقُونَ ﴿فَلَمَّا أَسْوَاهُمَا ذَكَرْلَهُ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَهُونُ عَنِ السُّوءِ﴾

* سفر تکوین: ۹-۴۔ * بخاری، کتاب النکاح، باب المراة راعیہ فی بیت زوجها: ۵۲۰۰۔

وَأَخْذُنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعْدَ اِبْرَيْسِنَ يَهُا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥﴾

(٧) الاعراف: ١٦٤ - ١٦٥

”اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کشم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا بر باد کرنے والا یا سزادینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتنا نہ کر لیے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گناہ گاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔“

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور رتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا ہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہ گار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتكب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھادینے اور بتادینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منواد یا اس کا فرض نہیں اور اس کا یہ بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں۔ فرمایا:

﴿مَا عَلِمَ الرَّسُولُ إِلَّا الْبَلْغُ﴾ (٥/ المائدۃ: ٩٩، ٢٤ / النور: ٥٤)

”رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔“

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اترگئی، اسی لیے سورہ مائدہ میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا الَّذِينَ أَمْنَوْا عَلَيْهِمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَعْتَدُونَ مَنْ ضَلَّ إِذَا هُدِيَّنَمْ﴾

(٥) المائدۃ: ١٠٥

”اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سید ہے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بلکہ بگاڑتا۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ”اوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے تھا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑنے لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔“ ۱۳ ایک دوسرے صحابی ابو تعلیم رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ ”نہیں بلکہ تیکی کا ہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیں جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی بیرونی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغربور ہے تو اس وقت عموم کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے

۱۳ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ المائدۃ: ٥٧ - ٣٠

جس میں ثابت تقدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے کپڑا نا ہے۔^۱

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ”کیا میں اپنے بھائی کا رکھوا لا ہوں؟“^۲ منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسم و آداب اور ایسی کیسی اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے بہرخض کے پرائیوریت اور رنج کی باقی معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر راگہری نظر سے دیکھنے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اثرات اور متاثر پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ پوری سوسائٹی میں پہنچیں جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہیاں ہیلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہرا تنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا براہونا بھی مغلکوں معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ”بُنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ أَخْلَاقِ تَزَلُّلٍ أَسْرَى طَرَحَ شَرْدَعَ هُوَا كَمَنْ جَبَ إِنْ مِنْ بَرَائِيَّةِ الْمُهَاجِلِ“ تو پہلے تو ان کے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ ندر کے توهہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤ دا اور عیسیٰ ﷺ کی معرفت ان پر لعنت کی۔^۳ اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ”نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑ و اس کو حق پر نہ جھکا دو۔“^۴

یہ بے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نبی عن انہنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا۔ یعنی سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔

قرآن نے کہا:

﴿أَتَأْمُوذُونَ النَّاسَ بِالْبَيْرَ وَتَنَسَّوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۴۴)

”کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔“

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ صیحت اور فہماں، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کی ساتھی کی جائے، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿أَذْعُمْ إِلَى سَبِيلِ رَبِيْكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمُوعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (۱۶/ النحل: ۱۲۵)

^۱ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ المائدۃ: ۳۰۵۸۔ ^۲ سفر تکوین، ۹۔۴۔

^۳ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ المائدۃ: ۳۰۴۸۔

”تو اپنے رب کے راستے کی طرف دنا میں سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔“

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيْسًا﴾ (۲۰ / طہ: ۴۴)

”تم دونوں اس سے نرمی سے با تمیں کرنا۔“

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

﴿وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِي الْفُسْدِمْ قَوْلًا لَّيْسًا﴾ (۴ / النساء: ۶۳)

”اور تو ان کو نصیحت کرو اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جائیوں بات۔“

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کہدا نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندر یہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا، امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نبی عن الہنکر کے ایسے فوج دارانہ اور زبردستی کے تجھمانہ انتقامات جن کے لیے تعزیزی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نبی عن الہنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معابر کی تحقیق و تفہیش کی جس کا نام تجویز اور نوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کرہے کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریپر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ ”محتب را درون خانہ چہ کار؟“

اس کا سبب بھی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لیے جماعت کو اس میں خل دینے کی ضرورت نہیں اور اسی کے ساتھ اور ایک نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم و حیا کا جو ہر ابھی موجود ہے۔ جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ذر ہے کہ ضد اور ہٹ کی باد تند سے اس کے دل کی یہ دھنڈی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی

ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرمادیا ہے کہ ((انما الاذن لاجل الرؤیة)) * یعنی ”کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔“ اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ بیشکے کے لیے بند ہو جائے چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اسی لیے تجویز اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور پر ممانعت کی، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ جَنَبُوكُلِّ أَثْيَرًا فِي الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِنَّمَا لَا يَحْكُمُوا وَلَا يَغْتَبُ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُّحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمًا أَخْيُهُ مِنْتَأْفِكِ هُنْمُوْهُ طَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ
تَوَكِّلُ عَلَى رَحْمَتِهِ﴾ (٤٩ / الحجرات)

”اے ایمان والوا بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بے شک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹوٹا کرو اور نہ پیچھے پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلام میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سوتم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شے اللہ معاف کرنے والا ہم برپا ہے۔“

پیچھے پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہر ہے ہو، اپنے الام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابل غرفت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلعغ نہیں ہو سکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری بردا خاہر ہو جاتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایان نہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی نوہ لگاتے پھر وہ گے تو ان کو بر باد کر دو گے۔“ *

غور تجھے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے اطیف سکلتے پہاں ہیں۔
تو سمت اور اعتدال

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا

* صحیح بخاری، باب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل ٦٢٤١؛ صحیح مسلم، باب الادب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ ٥٦٣٨؛ جامع ترمذی، ابواب الاستئذان، باب من اطلع فی دارقوم ۲۷۰۹۔
** سنن ابی داؤد، باب الادب، باب فی التجسس: ٤٨٨٨۔

انتظار کر رہی تھی جوان و نوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلہ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔ عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظامِ قوام رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوش نہ بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جزو بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعتِ مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان و درگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت میسیح علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے، اس کے مقابل میں حضرت میسیح علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

”تم نے یہ سنا ہو گا کہ آنکھ کے بد لے آنکھ اور دانت کے بد لے دانت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابله نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے دائبے گال پر ٹھانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کرو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری کپڑے لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو داپس نہ کرو۔“

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہو گا کہ اپنے عزیز دوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔“

حضرت میسیح علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہایا سنائی گیا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت میسیح علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتراز پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (النحل: ٩٠)

”بے شبه خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔“

یا ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی و میسیحی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل و احسان

”عدل اور احسان“ کے صحیح مفہوم کے بھنٹے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد

۱ یہود کی سمجھدی کے سبب سے۔ ۲ یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے۔

۳ یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔ ۴ متی، باب ۵، آیت: ۳۸۔

درحقیقت ”عدل“ پر ہے۔ ”عدل“ کے معنی ”برا برا“ کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ”عدل“ ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگز کرنا یہ ”احسان“ ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ شخص محظی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو منادیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال آبروسلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کوسرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توارۃ کے قانون عدل کا خاتمه کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابل عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانون عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسے پر زمین کے ایک چھپے پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو گئی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ یہی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور اختیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی علیقیہ میں پوری طرح برقراری کیونکہ دنیا کی دامی شریعت بننے والی تھی۔ پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگز کرنا اور بدله لینا آسان ہے اور بعض غصہ و رخت مزاج اور تند خوب پیدا ہوئے ہیں جو بدله اور بدله سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدله سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور ”برائی، برائی کے بعدر“ کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے جو تمدنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق اور گوان دونوں کا مشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تباہان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کی ہے۔ جس کی تلاشی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف

سے کراہت کا کوئی روحاںی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے یہ شخص کو بزرگ مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال لکھتا نہیں ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجلیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصے سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدفاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جنم کا اثر برہار است و سروں تک پہنچا ہے، قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً قتل، سرقہ، رہزی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرمات کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جاسکتی ہے اور جو باقی میں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق ہیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسی طرح شریعتِ محمدی ﷺ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا جمیع ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانون اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشتا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تربات یہ رکھی ہے کہ وہ انجلیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے مجائے اس کے ساتھ بھلانی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متفاہل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزرور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحاںی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ محسوس یکیکر ہے۔

عفو اور انتقام

موسیٰ، عیسیٰ اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاقی محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ

پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراة کا اصول عادلانہ انتقام پرستی ہے۔ اس کا حکم ہے: ”اور جو انسان کو مارڈا لے گا سو مارڈا لا جائے گا۔۔۔ اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بد لے توڑنا، آنکھ کے بد لے آنکھ، دانت کے بد لے دانت۔۔۔“ (احرار: ۲۲۔۔۔ ۷۔۔۔ خروج: ۳۵۔۔۔ ۱۲۔۔۔ گنتی: ۳۱۔۔۔ ۱۹۔۔۔ استثناء: ۱۱۔۔۔ ۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے: ”تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بد لے آنکھ اور دانت کے بد لے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گاں پر پھر مارے، دوسرا گاں بھی اس کی طرف پھیر دے۔۔۔“ (متی: ۵۔۔۔ ۲۸)

لیکن اس سرتاپار و حانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائیٰ قوم اور عیسائیٰ ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں اور جس مسئلہ کے متعلق توراة اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَبَّعُونَ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ إِلَّا هُرِبَّ إِلَيْهِ الْعَبْدُ إِلَّا عَنِ الْأَنْفُلِ إِلَّا لِلَّهِ أَنْفُلٌ﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۸)

”اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بد لے کا حکم ہوا، آقا کے بد لے آقا، غلام کے بد لے غلام، عورت کے بد لے عورت۔۔۔“

یہ معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

﴿فَمَنْ عَفَى لَهُ مِنْ أَخْيَهُ شَنِعَ عَفَاقِيَّاً عَلَيْهِ الْمَعْرُوفُ وَآدَأَءَ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ طَذِيلَكَ تَحْفِيفٌ قِنْ زَيْكُمْ وَرَحْمَةً طَقِينْ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِيلَكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۸)

”تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی بیروی کرنا اور بیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور سہرا بانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بھا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے۔“

ان آئیوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان محلی و شمنی کے بعد ان کے جذبہ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراة

کے حکم میں خون بھالے کر معافی کی دفعہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد لائی گئی اور مقتول کے رشتہداروں کو معاف کر دینے یا خون بھالے لینے کے بعد انقام لینے پر عذاب الہی کا ذرستایا گیا، ویکھو کہ اسلام کا حکم توراة اور انجیل، قانون اور اخلاق، انقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے سمجھا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسرا جگہ ظاہر کیا ہے:

﴿وَتَبَيَّنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ الْقُسْطَ إِلَيْهِمْ لِمَنْ يَرْتَدُهُمْ وَالْعِينَ يَا لِلْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذْنَ بِالْأُذْنِ وَالسَّنَقَ بِالسَّنَقِ لَا وَالْجُرْحَمَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ لَفَارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِهَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ وَقَرَبَيْنَا عَلَى أَنَّهُمْ بِعِيسَى اُنْ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لَهَا بَيْنَ يَدِيهِ مِنَ التَّوْرِيقِ وَأَنَّهُمْ إِلَّا تُحِيلُ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لَهَا بَيْنَ يَدِيهِ مِنَ التَّوْرِيقِ وَهُدًى وَمُوعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (۵ / المائدۃ: ۴۶-۴۵)

”اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراة میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بد لے جان، آنکھ کے بد لے آنکھ، ناک کے بد لے ناک، دانت کے بد لے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سمجھا جو اپنے آگے کی کتاب توراة کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں راہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراة کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔“

② یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانون و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَإِنْ يُبْشِمْ فَلَكُمْ رِءُوسُ أَمْوَالِكُمْ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۷۹)

”اور اگر تم سود سے ہاڑا آگے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔“

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے:

﴿وَكُنْ كَانَ دُوْعُسْرَةٍ فَنَظَرَ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَكُنْ تَصَدَّقُوا حَيْثُ لَكُمْ إِنْ شِئْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۸۰)

”اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مهلت ہے جب تک اس کو کشاٹش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو کبھی ہے۔“

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامیعت کو قائم رکھا ہے، فرمایا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَإِنْ صَرَّبْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلظَّالِمِينَ﴾

(۱۶/النحل: ۱۲۶)

”اور اگر سزا دو تو اتنی ہی حقیقی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔“

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبُغْضَى هُمْ يَتَعَصَّبُونَ وَجَرَأُوا سَيِّئَةً سَيِّئَةً مِّثْلَهَا فَمَنْ عَفَّ وَأَصْلَحَهُ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُبُوْتُ الظَّالِمِينَ﴾ (۴۲/الشوری: ۳۹-۴۰)

”اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدله لیتے ہیں اور برائی کا بدله ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ خالموں کو پیار نہیں کرتا۔“

آیت کے پہلے تکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً تناہی بدله لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلا تھی ہی برائی ہے جیسا کہ تورات میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلانی بھی کرے (وَاصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلا غلت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسلیم کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الفرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقش ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرا کے کو چھوڑ دینا نظامِ حقیقتی کو آدھار کھانا اور آدھا مٹا دینا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لیکر آئے، جس کی نظر انسانی حقیقت کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کہا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجر میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ ایک اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برقراری کرتی جائے۔

جماعی انتظامات کے قیام کے لیے ختنی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجر کے وقت حکم ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَأْخُذْهُمْ بِمَا رَأَفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ وَإِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (النور: ۲۴)

”اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گناہ گاروں پر ترس نہ آئے۔ اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔“

یعنی اس گناہ کی جو سزا اخدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا میں ہی دے دینا درحقیقت اپنے گناہ گار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نہیں کسی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقة کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آخر پرست ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا: ”اے لوگو! تم سے پہلے تو میں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کا قاتا۔“

دوسری طرف غفوکا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”آخر پرست ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ الیہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے۔“ تو اس کو (قانون) سلامی ہوا۔ یہ عمل تھا۔ تعییم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کی کہتے ہیں کہ ”میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اور درگز کرنے کا مشورہ دیا۔“ یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یادیت (زرتاوان یا خون بہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا: ”آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقع پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی۔“ یعنی جب مراغعہ اور استغاثۃ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے، تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اور اڑھے سورہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا تمیں

۱ صدیق بخاری، کتاب الحدود، باب کراہیۃ الشفاعة فی الحد: ۶۷۸۸۔ ۲ ایضاً، باب اقامۃ الحدود والانتقام لحرمات اللہ: ۶۷۸۶۔

۳ ابو داود، کتاب الدیات، باب الامام یامر بالعفو فی الدم: ۴۴۹۷، نسائی، کتاب الدیات، باب الامر بالعفو عن القصاص: ۴۷۸۸، ۴۷۸۷۔

۴ ابو داود، کتاب الحدود، باب یعنی عن الحدود مالم تبلغ السلطان: ۴۳۷۶۔

درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاتا جائے گا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔ فرمایا کہ ”میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا۔“ ۷ یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدی علی شیطون، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو در گزر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے، وہ عفو، در گزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگاٹ خزمیں کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدا نے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانوں کو پتا کیکی جاتی ہے کہ ”تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلانہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑی میں تمہارے خدا کو برآ کہہ بیٹھیں۔“

﴿وَلَا تَسْبُو الَّذِينَ يَذْهَبُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُو اللَّهَ عَدُوًاٰ بَعْدَ عَلِيهِمْ﴾

(۱۰۸/۶) الانعام:

”اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پا کرتے ہیں ان کو برآنہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔“

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ سمجھیں کہ خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرُوا بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضُ عَنِ الْجَهَلِينَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَعُكُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ فَزُغْ فَأَسْتَعْدُ بِاللَّهِ إِلَهَ سَمِيَّةِ عَلَيْهِ ۝﴾ (۲۰۰-۱۹۹) (۷/ الاعراف)

”معاف کرنے کی خوبی اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کرو اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھپیڑا بھاروے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑو وہ ہے سنتا جانتا۔“ سکون کی حالت میں عفو در گزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔

صحابہ علیهم السلام کی تعریف میں فرمایا:

۷ ابو داود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز:- ۴۳۹۴

﴿وَإِذَا مَا غَصَّوْا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ (٤٢ / الشورى: ٣٧)

”اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔“

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا

ذریعہ ہے:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(آل عمران: ١٣٤)

”اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَكُنْ صَبِرَ وَغَفَرَ أَنِّي لَيْنُ عَزِيزُ الْأُمُورِ ﴾ (٤٢ / اس سوری: ٤٣)

”اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔“

اس برداشت اور غفوکو وحی محمدی ﷺ نے اپنے الفاظ میں ”عزز“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انہیا بِلِّيْلَهُمْ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبِرَ أَوْلُوا الْعَزْمُ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦ / الاحقاف: ٣٥)

”اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔“

یہی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ فرمایا:

﴿وَأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزِيزِ الْأُمُورِ ﴾

(لقمان: ١٧)

”اچھی بات بتا اور بردی بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔“

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔ فرمایا:

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزِيزِ الْأُمُورِ ﴾ (٣ / آل عمران: ١٨٦)

”اور اگر صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔“

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو در گزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا

کی مجبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھنے کے حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

(قُلْ لِلّٰهِ دُّنْ أَمْنُوا يَغْفِرُ وَاللّٰهُ دُّنْ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللّٰهِ) (٤٥ / الجاثیة: ١٤)

”(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔“

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر، شرک ہیں اب دیکھنے کے کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید پیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزراور معافی کو اپنا خاص و صفت بتا کر ان کو اپنی بیروی کی تلقین فرماتا ہے:

(إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوا عَنْ سُوءِ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفًّا قَدِيرًا)

(٤ / النساء: ١٤٩)

”اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔“

یعنی جب گناہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلا غلط اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

(وَلَيَعْفُوا وَلَيَصْفَعُوا أَلَا لَجُبُونُ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ كَوْفُرُ رَّحِيمٌ)

(٢٤ / النور: ٢٢)

”اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بنی شہنشاہ وال امیر بان ہے۔“

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم و معاف کرے گا اس میں عفو و درگزرا کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔ براہی کی جگہ نیکی

عفو و درگزرا کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، ن صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے

والوں کا نام خدا نے صابر اور دُو حَظٌ عَظِيمٌ یعنی ”برآ خوش قسمت“ رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنانے کی یہ بہترین تدبیر ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا سَنَّوْيَ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ إِذْفَعَ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي يَئِنَكَ وَيَئِنَكَ عَدَاوَةً كَانَهُ وَلِئِنْ حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا دُوْحَظٌ عَظِيمٌ﴾ (۴۱/ خم السجدة: ۳۵-۳۶)

”نیکی اور بدی برآ نہیں، تو برآ کی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کر وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ اسیا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔“
اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ”بڑی خوش قسمتی“ سے تعییر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برآندہ مانو۔ کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کریں چنان شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھنسنے سے بچا لے اور غصہ سے محظوظ رکھے:

﴿إِذْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ كَمَا تَعْنَى أَعْلَمُ بِمَا يَصْفُونَ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَرَتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَمْضِرُونَ﴾ (۹۸/ المؤمنون: ۲۳)

”مشرکوں کی برآ کی کا جواب بھلانی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کے اے میرے پروردگار امیں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔“

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور غفوکا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام ذکر مذکورہ بالائیکوں میں سے دوبارہ صرف صبر کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَصْلُوْنَ مَا أَمْرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْصَلَ وَيَخْتَوْنَ رَبِّهِمْ وَيَخْأُوْنَ سُوْءَ الْحِسَابِ وَالَّذِينَ صَبَرُوا إِتْقَاءَ وَجْهَ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًا وَعَلَانِيَةً وَيَكُوْنُ رَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُلْئِكَ لَهُمْ عَذَابُ الدَّارِيَّةِ جَنَّتُ عَدِيَّنَ﴾ (۱۲/ الرعد: ۲۱-۲۳)

”جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑ نے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ذرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو

اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلانی کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر، بیشتر ہے نے کے باغ۔“

ان سے کہا جائیگا: **(سَلَّمَ عَلَيْهِمْ يٰبَا صَبَرُوْنَ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ) (۱۳ / الرعد: ۲۴)** ”تم پر سلامتی ہواں کے بد لے میں کتم نے صبر کیا، سو خوب مل پچھلا گھر۔“ آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غبی میں نہ نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا۔ صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی ہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو پہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نو مسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلائل از فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلانی کرتے ہیں:

﴿أُولَئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرًا هُمْ مَرْتَبُّونَ يٰبَا صَبَرُوْنَ وَيَدْرَغُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَهُنَّا رَزَقُنُهُمْ يُنْفِقُونَ وَإِذَا سَمِعُوا الْغَوْلَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا إِنَّا أَعْمَلْنَا وَلَنْ نَأْعْمَلْ مُلْمَدَ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ لَا تَبْغِي الْأُهْلَيْنَ﴾ (۲۸ / الفصل: ۵۴-۵۵)

”وہ لوگ صبر کے سب سے اپنا حق دھرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلانی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیکھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نیکی بات سنتے ہیں تو اس سے درگز رکر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔“

ان آئیوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگز رکرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعاۓ خیر بھی کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدلسوکی پر سلوک کرتا ہو۔“ **❶** ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے پیغمبر ﷺ نے امیرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدلسوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لئے منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روشن پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔“ **❷** حدیثہ ثوبانؓ کہتے ہیں کہ

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمعکافی: ۵۹۹۱۔

❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم: ۶۵۲۵، حامد: ۲۰۰/۲

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پر سکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو۔“

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کا رانہ معابدوں اور پفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو سیکھی بدایت ہوئی:

﴿لَا إِذَا أَنْزَلْنَا طَهْرًا عَلَىٰ كُلِّ أُنْثَىٰ مَنْهُمْ لَا يَقِيلُّا مِنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۳)

”اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو ان کو معاف کراو ان کے قصور سے درگزر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“
غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کا رقوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگزر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنیوالوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوش خبری دیتا ہے۔
ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

● جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في الاحسان والعفو: ۲۰۰۷ (غريب)۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کار نامہ

تمدن کے زمانہ میں نظام حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظام حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرا بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جواب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پا ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقع واردات کا سراغ دیتے ہیں، مال مسرود کو بینچتے یا خریدتے ہیں، وغیرہ وغیرہ بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنابر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظام حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمون ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری

نمہب بھی ایک عظیم الشان روحاںی سلطنت ہے اور جس اصول کی بناء پر ایک دینیوی حکومت کو دوسرا حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے، اسی کو مختلف نماہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً: اصولی شریعت میں دنیا کے اکثر نماہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحت عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسی طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصلحت عامہ کے موافق تھیں، ان کی ترغیب دی، لیکن امر و نبی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان نماہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنابر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیوں کا تمام ترستہ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے، جس نے محسن اور مفسد کا سب سے زیادہ استقصا کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے بہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے، اسلام کو دوسرا نماہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا

ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے، مثلاً تو حیدر تمام مذاہب کا ام الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعریف نہیں کی، اس بنابر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام عمل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تجدید کی اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو تو حیدر کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جوان بتوں کی یاد کوتا زہ کر کے تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلیتی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے، جس نے ام قدر یہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے بر سر منبر تھی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی:

((لا تطرونى كما اطرت النصارى ابن مریم فانما انا عبد الله
ورسوله))

”میری شان میں مبالغہ کرو، جس طرح نصاری نے ابن مریم کی شان میں کیا میں تو اللہ کا
بنہد ہوں، تو کہو کہ اللہ کا بنہد اور رسول۔“

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشه کو بتاتا کر اس کی بخچ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روشن اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرمادیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لیے باقی نہیں رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہیں، جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔
آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتوں سے فرمائی ہے:

① تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

② ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالى: «وَذُكْرٌ فِي الْكِتَابِ مَرِیم.....» ۳۴۵۔

③ نرمی و گرمی، عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے موقع کی تحدید۔
اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا، اس راز کو فاش کروے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنائی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام جو نبی ابراہیم کو کہہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں، جو حسب ذیل ہیں: (دیکھو خروج باب ۲۰ آیت: ۳۰ تا ۱۲ آیت)

تورات کے اخلاقی احکام

① تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

② تو خون مت کر۔

③ تو زنا مت کر۔

④ تو چوری مت کر۔

⑤ تو اپنے پڑوی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

⑥ تو اپنے پڑوی کی جور و اور اس کے غلام اور اس کی لوڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوی کی ہے لائق مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خرون باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں، یعنی مسافر، یہود اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے:

① تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

② تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

③ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

④ تو اپنے پڑوی سے دغabaزی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

- ⑤ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے انہے کوٹھو کر گے، انہے کے آگے مت رکھ۔
- ⑥ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔
- ⑦ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کرو اور اپنے بھائی کے خون پر کمرنا باندھ۔
- ⑧ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔
- ⑨ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلتے اور نہ ان کی طرف سے کینڈ رکھ۔
- ⑩ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہوا دربوڑھے مرد کو عزت دے۔
- ⑪ اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو۔
- ⑫ تم حکومت کرنے میں، پیاس کرنے میں، تولے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔
- انجیل کے اخلاقی احکام**

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بُنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراة، حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور، حضرت سليمان علیہ السلام کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ میں پہ ترتیب حسب ذیل بتیں بیان کی گئی ہیں۔ دل کی غربی، غلیکینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کرو، ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ یہ اخلاقی تعلیمات پیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں، اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ تمام قوموں اور

زمانوں تک وسیع کیا گیا، اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں، ان سب کو استقصا کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی، گزشتہ ضمیموں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا، ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک جملہ فہرست درج کرتے ہیں، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام غنو و درگزر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، اللہ کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قربت داروں، قیمتوں، مسکنیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایضا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاهدوں کا الحافظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلائی کہنا، کسی کو نہ چڑانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گناہ گاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کرنے چلنا، صلح گوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، لگاگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور، بڑی بات سے روکنا، اولاد کشی، خود کشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، تیم کی کفالت، اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شری کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، غلو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحلیل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگزر، بدی کے بدلتیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور منافقوں سے گفتگو میں آداب کا الحافظ، مشکوں کے بتوں تک کو برآئہ کہنا، فیصلہ میں عدل و انصاف، دشمنوں تک سے عدل و انصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان و ہر نے کی برائی، الائے ہنے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہنگنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، ول کا تقوی اور پاکیزگی، پاکہ بازی جتنے کی برائی، رفارمیں وقار و ممتازت، مجالس میں حسن اخلاق، ضمیموں، کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، یہوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی

برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑوں کی پا کیزگی اور طہارت، شرم گاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھوڑنا، یقین کو نہ دبانا، اللہ کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نہماں کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، بڑائی کے گھسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جواکھینے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شری کی باتوں سے پر ہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہماں، معاملات میں چائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں، جن کا ماغذہ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک تا سب کے بڑی تقطیع کے ۱۸ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۲۳۴ سطراں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تمیں ہزار نو سو چھھ حدیثیں ہیں، جوڑھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکر ربات میں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہو گا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزو نہ ہو گا جو دائی اسلام ﷺ کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔ صدر حجی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پروردش، تینیوں کی پروردش، بیوہ کی خبرگیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریادرسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیرخواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکرگزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، بڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلائی، خوش خلقی، فیاضی، بدبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ و ضبط کرنا، غفو و درگزر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخری کی نہ ملت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیچھے پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور

استغنا، گداگر کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغل خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، لفظ و کیش کی ممانعت، دوسروں کی کٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گامی کی ممانعت، منہ پر مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخیل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی ندامت، ہنسی مذاق کی ممانعت، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصباً کی ممانعت، تمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت، خواری و غم گساری، توکل، لاچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، بھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض شد رہے، منافقت اور دروغی چال کی ندامت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زنا کاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تجیہ، مصافحہ و معانقة، دیگر آداب ملاقات، آداب مجلہ، آداب طعام، آداب لباس، آداب نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جانے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان براہمنہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشه کو کھول دیا جائے اور اس کی یہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پختہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیے جائیں، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اس کی توضیح کے لیے امر و نہیٰ دونوں کی ایک ایک دو دو مشائیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام نہ ہیوں میں ثواب کا سب سے برا کام سمجھا گیا ہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انہیں نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو سمجھا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزو کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مہم تھا، کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا ز کو ہفڑا فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے، شریعت محمدی ﷺ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانی کی

پوری پوری تعین کر دی، وہ اجتناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ تادیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی تشریع کر دی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ اللہ کی راہ میں لانا کر خود مفلس اور کرگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنِفِّعُونَ هُنَّ قُلُّ الْعَوْظَةِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۹)

”لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔“
مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر چھوڑی تکلیف اٹھا کر، دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالی خلق کی دلیل ہے، انصار جہنوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتوں درکیں، ان کی تعریف میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَيَوْمَرُونَ عَلَى آنَفِيهِمْ وَلَوْ كَانَ يِهْمُ خَاصَّةً هُنَّ﴾ (۵۹/ الحشر: ۹)

”وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح میں فرمایا:

﴿يَطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُتْمَهِ مُسْكِنَتِهِ وَيَدْعُونَهُ وَأَيْمَنَهُ﴾ (۸/ الدھر: ۷۶)

”خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔“

قرآن پاک سراپا اتفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔
اکثر لوگ وہ چیز اللہ کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکلنی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے ترکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دنایت اور آسودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

﴿لَنْ تَأْلُوا إِلَيْهِ حَتَّىٰ تُتَفَقُّوْا مِمَّا أُتْحِبُّوْنَ هُنَّ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ يِهْ عَلَيْمٌ﴾

(۳/آل عمران: ۹۲)

”تم ہرگز پوری نیکی کو شہ پاؤ گے، جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو محظوظ ہے اور جو بھی تم خرچ کرو، اللہ کو اس کا علم ہے۔“

پھر فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفَقُوا مِنْ طَيْبَاتِ مَا كَسْبَتُهُ وَمِمَّا أَخْرَجَنَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ سَوْلَكُ تَكَبَّرُوا إِلَيْهِ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاَخْذِنِي هُنَّ لَا أَنْ تُعْصِمُوْفِي هُنَّ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۷)

”اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو، اس میں کی اچھی چیزوں اور جو تمہارے لیے زمین

سے نکلتے ہیں، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوش کر لو اور یقین کرو کہ اللہ بے برو اور خوبیوں والا ہے۔“

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ”وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔“ یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے، کہ وہ ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پرواہ ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔ سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بارتم پر ہے، اہل عیال، دست گفر عزیز و قریب، پھر دوسرا محتاج و مسکین اور تیام اور مسافر۔

**﴿يَسْكُونُكُمْ مَاذَا يُنْفِقُونَ هُنَّ مَا أَنْفَقُتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الْأَكْلُ الْمُبِينُ وَالْأَقْرَبُينَ وَالْيَمِينُ
وَالسَّكِينُ وَإِنِّي السَّمِيعُ طَوَّافُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلَيْهِمْ عَلِيمٌ﴾** (۲۱۵: ۲) (البقرة: ۲۱۵)

”لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہ دے، جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ داروں، تیاموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس سے واقف ہے۔“

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے۔“ لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی تدریت نہ ہو، تو فرمایا: ”مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے۔“ صحابہؓ نے عرض کی، اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا: ”تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچ یہ بھی صدقہ ہے۔“ ① دوسرے موقع پر فرمایا: ”اچھی بات کہنا اور بڑی بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھسلے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستے سے پھر، کاشا اور بدی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔“ ② غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد ملت دلاؤ، نہ اپنا احسان اس پر جتا، نہ اس سے اس کے شکر یہ کے طالب ہو، نہ نماش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برپا ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی دھی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا:

① ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقہ: ۲۲۵۔

② جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔

﴿وَلَا تَسْنُنْ شَنَلَتِرُ ﴾ (٧٤/المدثر: ٦)

”اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔“

عام مسلمانوں کوتاکیدی گئی:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْعَيْنِ وَالْأَذْيَى كَمَا أَنَّذَنَا يُنْفَقُ مَالُهُ بِرَأْءَةِ النَّاسِ

﴿وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾ (٢٦٤/البقرة: ٢)

”اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر بر باد مت کرو، جس طرح وہ بر باد کرتا

ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔“

پھر فرمایا کہ اپنی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے:

﴿قُولُ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةُ حَيْرٍ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَبَعُهَا أَذْيٌ وَاللَّهُ عَنِّي حَلِيمٌ ﴾

(٢٦٣/البقرة: ٢)

”اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے

والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور اللہ بنے نیاز اور بردابار ہے۔“

ریا اور نمائش سے پچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصود ہو تو دکھا کر کے بھی دے

سکتے ہو:

﴿إِنْ شَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَيُعَذَّبُونَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفَقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ وَيَكْفِرُونَ

﴿عَنْهُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ حَيْرٌ ﴾ (٢٧١/البقرة: ٢)

”اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غربیوں کو دو تو وہ تمہارے لیے

سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہوں اللہ اس سے

خبردار ہے۔“

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْيَقِينِ وَالَّذِينَ إِسْرَاقًا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا

خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَخْرُنُونَ ﴾ (٢٧٤/البقرة: ٢)

”جو لوگ اپنامال رات اور دن، پچھے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو ان کا ثواب ان

کے رب کے پاس ہے، میان کو خوف ہو گا اور نہ غم۔“

صدقة اور خیرات کھلے دل سے فسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی

نشانی ہے:

﴿وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ﴾ (٥٤/التوبۃ: ٩)

”اور وہ اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔“
صدقہ و خیرات کے دل سے اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے:
﴿وَمِثْلُ الَّذِينَ يُفْقِدُونَ أَمْوَالَهُمْ إِيْغَاءً مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَهْبِتَنَا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَشْ جَنَّةٌ يُرَبُّوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنامال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پا کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی تیلہ پر ہو۔“
 بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود اللہ ہو:

﴿وَمَا تُنْقِدُونَ إِلَّا إِيْغَاءً وَجْهَ اللَّهِ وَمَا تُنْقِدُونَ مِنْ خَيْرٍ يُوْفَ إِلَيْكُمْ وَأَنَّمَا لَكُمْ مَنْ لَظَّلَمُونَ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۷۲)

”اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے، وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ دباند رہے گا۔“

صدقہ و خیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہو گا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے لئے تنگ گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً: مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے تدبیب اور شہک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخري فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض بیک لوگوں نے شراب کا پینا پھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف شخص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا اور خود اشخص بھی اس کے اثر سے کلیتہ محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً: ایک شخص شراب نہیں پیتا، لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے، لیکن ان برتوں کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((لعن اللہ الخمر وشاربها وساقيها، وبانعها ومبتعها
وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة الیہ))

آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس

کے بینے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نجڑنے والے پر، اس سے اپنے لیے
نجڑوانے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی
جائے، ہفت کرتا ہے۔“

مہدہ ب قانون کا سب سے برا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی
منطقی حقیقت (تعریف) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا
اٹر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خرکا لفظ استعمال کیا
گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرمادی۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من

العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعير خمرا)) * *

آپ ﷺ نے فرمایا: ”انگور سے بھی شراب بنتی ہے، بھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے
بھی اور جو سے بھی۔“

قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ((ان الخمر من العصير والزبيب والتمر

والحنطة والشعير والذرة و انى انها کم عن كل مسکر)) * *

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ”شراب انگور، متفق، بھجور، گیہوں،
جو، جوار اور ہر چیز کے نجڑ سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشاہ اور چیز سے منع کرتا ہوں۔“

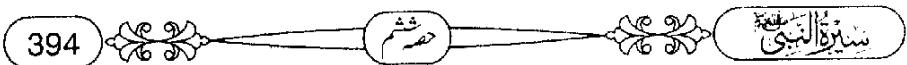
عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی، اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف
شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری
قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لیے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو
تمام اقسام شراب پر حاوی تھی:

((کل مسکرٰ خمر و کل مسکرٰ حرام)) * *

”ہر نشاہ اور چیز شراب ہے اور ہر نشاہ اور چیز حرام ہے۔“

((کل شراب اسکرٰ فهو حرام)) * *

* ابو داود، کتاب الاشربة، باب الْخَمْرِ مِمَاهِي: ۳۶۷۶۔ ۲ ایضاً: ۳۶۷۷۔ ۳ ابو داود، کتاب
الاشربة، باب ما جاء في السكر: ۳۶۷۹؛ صحيح مسلم، کتاب الاشربة، باب بیان ان کل مسکر خمر:
۵۲۱۸، ۵۲۱۹؛ ترمذی، کتاب الاشربة، باب ما جاء في شارب الخمر: ۱۸۶۱؛ نسائي، کتاب الاشربة: ۵۵۸۹
احمد، ج ۱، ص: ۲۸۹۔ ۴ ابو داود، کتاب الاشربة، باب ما جاء في السكر: ۳۶۸۲؛ بخاری، کتاب
الاشربة، باب الخمر من العسل: ۵۵۸۵؛ مسلم، کتاب الاشربة، باب بیان ان کل مسکر خمر: ۵۲۱۲۔



”ہر پینے کی چیز جو نہ لائے وہ حرام ہے۔“

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستبط ہوتی ہے، نہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نہ نہ آئے، اس لیے فرمایا:

(ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام) ﴿١﴾

”جو چیز زیادہ مقدار میں نہ لائے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔“

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں؛ جو نہ نہیں لائیں، تاہم اعصاب میں ایک حد تک کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نہ کہا ابتدائی مقدار میں ہوتی ہے، بھگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مضر جات کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی:

نهی رسول الله عن كل مسکر و مفتر. ﴿٢﴾

”آنحضرت ﷺ نے ہر منشی و ممندر چیز سے منع فرمایا۔“

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرف اخمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خربیات میں داخل فرمایا:

(ليشربن ناس من امتى الخمر يسمونها بغير اسمها) ﴿٣﴾

آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔“

اس کے علاوہ عرب میں جن برتوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی:

نهي عن الدباء والحنتم والمزفت والنغير. ﴿٤﴾

”آپ ﷺ نے کدو، بز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔“

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لیے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب

۱ ابو داود، ایضاً: ۳۶۸۱۔ ۲ ایضاً: ۳۶۸۶۔ ۳ ایضاً، باب فی الداذی: ۳۶۸۹، ۳۶۸۸۔

۴ ابو داود، کتاب الاشربة، باب فی الاواعیة: ۳۶۹۰۔

کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند تیم بچوں نے وراشت میں شراب پائی تھی، حرمت خر کے بعد وہ بیکار چیز ہو گئی، حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکر کیوں نہ بنایا جائے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی۔

ایک بار دیلم حمیری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی، کہ ہم سردار ملک میں رہتے ہیں اور رخت کام کرتے ہیں، اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا: ”کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے۔“ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو اس کو چھوڑ دو۔“ انہوں نے کہا: لیکن اور لوگ نہیں چھوڑ سیں گے، ارشاد ہوا کہ ”اگر نہ چھوڑ سیں، تو ان سے جہاد کرو۔“ ﴿۱﴾ اسلام سے پہلے توراة نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجلی نے بھی ”نار و انفع“ سے لوگوں کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت محلی ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس قسم کا ربانا جائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم میں جو لوگ کسی طرح بھی شرک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربنو و موکله و شاهدہ و کاتبہ۔

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔“

رشوت کی حرمت میں استقصا

لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی۔

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔“

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں بنتلا ہو جاتا ہے، اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹانے دیا جائے اس چیز کا کلیتہ قلع دفع نہیں ہو سکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری

مسیحی فلسفہ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی، کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار

﴿۱﴾ ابو داود، کتاب الاشربة، باب ماجاء فی الحمر تخلل: ۳۶۷۵۔ اس سرکر کے جواز و عدم جواز میں فقیہ کا اختلاف ہے۔

﴿۲﴾ ابو داود، کتاب الاشربة، باب ماجاء فی النسکر: ۳۶۸۳۔ ﴿۳﴾ ابو داود، کتاب البيوع، باب فی اکل الربو: ۲۲۲۲۔

﴿۴﴾ ابو داود، کتاب القضا، باب فی کراہیۃ الرشوة: ۳۵۸۰۔

اخلاق کی صرف منفعل اور ہر دو قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غربی، غلگتی، وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتحان کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے، جس طرح غنو و دو گز رباند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتظام بھی بسا ضروری ہے، مگرمانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قیامت پسندوں کے لیے ضروری ہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود نہیں چاہیے، کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نشیش کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفہ نے تکی اخلاق پر جادو بجا اعتراض کے جو تیربر سائے اور ان تکی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ نہ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم، عزت نفس اور خودداری کے جو ہر پیدائشیں ہو سکتے، وہ کہتا ہے:

”مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناں کر دیا ہے۔“ *

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ سچ غایلہ کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخراں مان کاظھور ہوا ہے، جس نے تکی نظام اخلاق کی غلطیوں کی صحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دو سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی، کہ گھومنے نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، تکی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہیں کی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریہ قبول نہیں کیا۔

نقوں کا اختلاف استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر یہاں کی اندرونی یہاں پریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور

* نیشن از ایم اے ملکے ہترجم مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم، ص: ۲۷۔

بہادر بھی ہیں اور غضباناً بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، لگاگر بھی ہیں اور فیاض بھی، نامید بھی ہیں اور پر امید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کار آمد نہیں ہو سکتی، بہترین اخلاقی معانی وہ ہے، جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نئے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تدرست ہنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ نامید کو پر امید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کوئی سمجھائے، کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ اللہ سے مل رہا ہے، وہ قانون کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اللہ سے مانگنے والا کر دے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مفرد رہنادے، وہ اچھی قتوں کو نشوونما دے اور بری قتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کا رجانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قتوں پر ہے، قوت غصب اور قوت شہوت، غصب نام ہے اپنے نفس کے مناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مaufعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے پیکروں اچھے برے اخلاقی جزیيات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غصب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو، تو اس کا نام مثباعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ترقی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبة حق، جدوجہد، حق و محنت، جہاد پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی تو تہذیر بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبیر، ترفع، دوسروں کی تھیقر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برا بیان پیدا ہو جاتی ہیں اور جب یہ قوت تغزیط کی طرف حکمی ہے، تو ذات پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دنائست کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہیں، یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پر ہیز گاری، وجود و خنا، شرم و حیا، صبر و شکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی سرست کی مناسب

طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس سے حرص و طمع، بے شرمنی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، ریشک وغیرہ اوصافِ ذمہد پیدا ہو جاتے ہیں۔
مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

میسیحیت کی تعلیم کا منشاء انسان کی ان دونوں غصیٰ اور شہویٰ قوتوں کا استعمال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، میسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ بھی کبھی ان کے استعمال کا موقع محل برآ ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم نہیں ہے کہ اپنی قوت غصب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو" اور یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے مجرور ہو اور مفلس غمگین بن کر زندگی گزار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتری ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انھیں بدایت ملے اور اللہ کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے بھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ نَهْيَنَ﴾ کہا ہے، وَالْفَاغْدِينَ الْغَيْظَ نَهْيَنَ کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں

دنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، اولاد و انبساط، رونق و ترقی، جدوجہد جو کچھ ہے، وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مث جائیں، یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آہنی دنیا مر جائے، نصفت کا کوئی مفہوم ہو، ناصحت کے کوئی معنی ہوں، نعدل کا وجود ہو، نہ امن و امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند بختی، استقلال، ثبات قدم اور ستمی و محنت کے جو ہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اللہ کی یہ دنیا ایک ایسا دیرینہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش کا نام نہ رہے۔ میسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملاحظہ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے، بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیز ہیں، اسی قدر وہ معاویہ بھی جوان دونوں قوتوں کی تفریط اور کسی سے پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً: بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائست، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، مستقی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں، اسلام نے اپنے پیروکاروں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہاں ان کو ﴿رَحْمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۸ / السفتح: ۲۹) "آپس میں حمدل" اور ﴿أَذْلَلَةُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵ / المسائد: ۴) "مُونوں کے فرمابردار" کی تعلیم دی و ہیں ﴿أَشَدَّ أَءُمَّةُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾

* احیاء العلوم، ج ۳، ص: ۱۲۱ مطبوعہ مصر۔

(٤٨/الفتح: ٢٩) ”کافروں پر بھاری“ اور (أَعْزَّةُ عَلَى الْكٰفِرِينَ) (٥/المناد: ٥٤) ”کافروں پر گرائیں“ بنے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف اللہ اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے، (وَلِلٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ) (٦٣/المنافقون: ٨) میکی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا، جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹست ہن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکن کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

لیکن تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

”لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر میسیحیت کا پیدا کردہ ہے..... اور گویہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزون ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں، خانقاہانہ طرز زندگی کا مشہ، فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودداری خودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مثاد یا جو خانقاہانہ زندگی کا مطعن نظر ہے، کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبے سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں، لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے متراffد ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماء اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مناظر ہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری، انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹست ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حیمت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتوں ملک ملاقوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کے بجائے دنائست، پست، ہمتی، کم ظرفی، بزدی اور گلگاری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔“ *

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلام علی نقیب کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ علی نقیب کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے، فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يَحُبُّ مَعَالِي الْاَمْوَرِ وَيَعْسُدُ سَفَسَافَهَا)) *

”بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے“

* فصل: ١١، ص: ١٢٤ ، مترجمہ عبد الماجد دریا آبادی۔

** مجمع الزوائد و منبع الغوائد، ج: ٨، ص: ١٨٨ بر الوایت طبرانی۔

”معالیٰ امور“ سے مقصود عالیٰ حوصلگی کے بڑے کام اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو اللہ کا دوست بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظر بھیشہ اور پیشی اور مقصد بھیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔ اسی کے ساتھ آنحضرت کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((المؤمن القوى خير واحب الى الله من المؤمن الضعيف وفي كل خير
احرص على ما ينفعك واستعن بالله ولا تعجز وان اصابك شيء فلا تقل
لواني فعلت كان كذا وكذا ولكن قل قدر الله وما شاء فعل فان لو تفتح عمل
الشيطان))

”کمزور مسلمان سے قوت و مسلمان زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلانی ہے، ہر وہ چیز جو تجھے لفغے دے اس کی پوری خواہش کر اور اللہ سے مدد چاہ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ کہہ ”اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا“ بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا، کیونکہ یہ اگر (اوگر) شیطان کا کاروبار کھوتا ہے۔“

تقدير، تو كل، صبر او شکر

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے، جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، تو کل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضاؤ قدر کے ضمن میں جلد چارہم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد ختم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پرامیدی، استقلاں اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ اللہ پر ہمدردی اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے، اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا اور اگرنا کامی ہو تو دل میں یاس اور نا امیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اللہ کا مشاہدین تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

﴿فَإِذَا عَزَّزْتَ فَتَوَكَّلْتَ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ اُنْ يَعْصِمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ

لَكُمْ وَإِن يَخْذُلُكُمْ فَنَّ ذَا الَّذِي يَصْرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ قَلِيلٌ تَوْكِلُ كُلُّ الْمُؤْمِنُونَ ۝

(آل عمران: ۱۵۹-۱۶۰) (۳)

”جب تو پاک ارادہ کر لے، پھر اللہ پر بھروسہ کر، میشک اللہ متوكلوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تھہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غائب پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کوئن تھہاری مدد کر سکتا ہے، اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔“

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ قَبْلُ أَنْ تَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۚ لَكِنَّا لَا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فِي الْأَنْكَمْ وَلَا تَفْرُحُوا بِمَا أَنْكَمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يُجِيبُ كُلَّ حَفْتَكَالْفُحْرَةَ﴾ (الحدید: ۲۲-۲۳) (۵۷)

”کوئی مصیبہ نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لیے، تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائی کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابتت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام خطرات سے نذر ہو کر بڑی بڑی سلطتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے، ان کو مشکلات میں اللہ کے دوسرا سے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

﴿رَبَّنَا أَغْرِيْنَا صَبِرًا وَتَبَّتْ أَقْدَامُنَا وَالصُّرُنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكُفَّارِ ۝﴾

(آل البقرہ: ۲۵۰)

”اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر و ثبات کا پانی بھا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یا ب کر۔“

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پنج بیوں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

﴿وَكَانُنَّ مِنْ نَّبِيِّنَّ قُتُلَ لَا مَعَهُ رِبِّيْوَنَ كَثِيرٌ فَهَا وَهُنَوْا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَحْكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَاتُلُوا رَبِّيْنَ اغْفِرْلَهُمْ ۝ ذُؤْبِنَا وَإِسْرَافُنَا فِي آمْرِنَا وَيَسِّرْ أَقْدَامَنَا وَالصُّرُنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكُفَّارِ ۝﴾

(آل عمران: ۱۴۶-۱۴۷) (۳)

”اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی، تو اللہ کی راہ میں جو

مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا، لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہماراحد سے بڑھ جانا معااف فرمائے اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھا اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔“

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ يُرَاكِبُونَ أَوْ صَابِرُونَ أَوْ رَأَيْطُوا هُنَّ الَّذِينَ لَعَلَّهُمْ تَفَهَّمُونَ﴾

(آل عمران: ۲۰۰)

”اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہا اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو، تاکہ کامیاب ہو۔“

ان آئیوں سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثبات قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اس کے نزدیک توضیح، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اس طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محجوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو

یعنی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو، اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیر ہو جاتی ہیں، لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجلیں کے مفسروں ﷺ نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعاۓ خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقی محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، بر اچاہنے والوں کے ساتھ بھلانی کرو، جو تم کو بد دعا کیں دیں، ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں، ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں، ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا كُوَنُوا قَوْمٌ يُنَاهِيُ اللَّهَ شُهَدَاءَ بِالْقُسْطِ وَلَا يَجِدُونَ مَنَّكُمْ شَانٌ قَوْمٌ عَلَى الْأَنْعَادِ لَوْلَا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَتَقُولُوا اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

(الماائدۃ: ۸)

”اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو، کہ انصاف کرنا پر ہیزگاری سے اسکات صاحب کی تغیرتی۔“

بہت زدیک ہے اور اللہ سے ڈر کو اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔“

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ إِذْعَنْ بِالْقُوَّىٰ هِيَ أَخْسَنُ فَإِذَا الَّذِي يَبْنَىٰكَ وَيَبْنَهُ عَدَاؤُهُ كَانَهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِي هُنَّا إِلَّا لِلَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِي هُنَّا إِلَّا دُوْحَقٌ عَظِيمٌ﴾ (حُمَّ السَّجْدَة: ۳۶)

”اور بھائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھائی سے دفع کرو، تو فعیل وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمن ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسم والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جانے والا ہے۔“

① اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

② اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

③ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اخلاقی محمدی ﷺ کے حیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

④ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگز کرنے کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے، تو اللہ ان کو شیطان کے پنجھ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔“

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بذریبائی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور پچھے بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا: ”اے ابو بکر! جب تک تم چپ تھے، اللہ کا فرشتہ تمہاری

* صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة حم السجدة في ترجمة الباب؛ وابن جرير، ج ۲۴، ص: ۶۸ مصر۔

طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔ **❶**
آپ ﷺ نے فرمایا: ”صلدر حم یہ نہیں ہے کہ صلدر حم کرنے والوں کے ساتھ صلدر حم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلدر حم کرو۔ **❷** یعنی دشمنوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کی: یا رسول اللہ ا مجھے وہ بات بتائیے، جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں، مجملہ ان کے فرمایا: ”نظامِ رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔ **❸**

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہب دشمن نہیں ہو سکتا، ایک دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی انفو در گزر کی کسی صریح تعلیم دیتا ہے:

﴿قُلْ لِلّٰهِ دِيْنُ أَكْمَلُوا يَغْفِرُوا لِلّٰهِ دِيْنُ لَا يَرْجُونَ أَيْمَانَ اللّٰهِ لِيَغْزِيَ قَوْمًا يَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ **❹** (الجاثیہ: ۱۴)

”(اے پیغمبر!) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تاکہ اللہ ایسے لوگوں کو ان کے کرتوں کا بدلا دے۔“

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ”ریا کار فریسوں“ اور سانپوں ”سانپوں کے پچوں“ **❺** والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے، جس نے فاتح بن کر، مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر مکوم بن کر نہیں، بیک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا، جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسارہ چکا تھا، **❻** جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا، **❼** جس نے خیر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا، **❽** جس نے اپنے بچا کے قاتل کو معاف کیا تھا، **❾** جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگہ کو چبانے والی کو معاف کیا، **❿** جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا، **⓫** جس نے تنعمیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا، **⓬** جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک

❶ سنن ابن داود، کتاب الادب، باب فی الانصار، کتاب الادب، باب لبس الواسل بالملکافی: ۵۹۹۱۔ **❷** صحیح بخاری، کتاب المکاتب، باب فی الانتصار: ۴۸۹۶۔ **❸** صحیح بخاری، کتاب المکاتب، ج ۲، ص: ۲۱۷ حیدر آباد دکن۔ **❹** انجل متی: ۲۳، ۲۵، ۳۲۔ **❺** مسلم، کتاب الجهاد، باب فتح مکہ: ۴۶۲۴ تا ۴۶۲۲، سنن الکبری للنسائی: ۱۱۲۳۴۔ نیز یہ کھیں کتب یہر کے الوب فی کرد۔ **❻** صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۰۶۔ **❼** صحیح بخاری، کتاب الہبیہ، باب قبول الہدیۃ من المشرکین: ۲۶۱۷۔ **❽** صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزہ بن عبدالمطلب: ۴۰۷۲۔ **❾** صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر هند بنت عتبۃ: ۳۸۲۵۔ **❿** کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہار یا فتح مکہ و اصابة ذکر ہمارین اسود، ج ۶، ص: ۲۷۹ وزرقانی، ج ۳، ص: ۳۲۳۔ **⓫** جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن من سورۃ الفتح: ۳۲۶۴۔

نگستان میں جب وہ خواب تھا، اپنے ایک تین بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا، جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی جنہوں نے اس پر کمی پھروں کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤں خون آ لو دیو گئے تھے، جس نے احمد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی، جس نے دشمنوں کے حق میں بد دعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں، بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں، انتہایہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معادہ کو پورا کرنا تقویٰ (پر ہیز گاری) کی شان بتائی ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ أَعْهَدُوا لِهُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ كُنْتُمْ تَنْقُصُونَهُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُطَاهِرُوا عَلَيْنَا مَا حَدَّا

﴾ فَأَنْتُمُ الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِّهِمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝﴾ (التوبہ: ۴)

”لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو، اللہ پر ہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معارض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل عیحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے باñی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے مخالفوں کے میں جوں، رازداری اور رفاقت سے روک دے، جوز دو یا ساڑش سے اس کے مٹانے اور بر باد کر دینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیقظ خجراً اور فوج و شکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شہبے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ بر گثیت کرنا چاہتے ہوں، چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

﴿لَا يَغْنِيَنَّ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفَّارُ إِذْ أُولَئِكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَقْعُلْ ذَلِكَ فَلَكِيسْ مِنَ

اللَّهُ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَكْفُوا مِنْهُمْ تُقْلِيَةً ۝﴾ (آل عمران: ۲۸)

”ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَأْتُمُ الْأَتَّيَدُونَ ۚ أَبَا ءَلَمْ وَأَخْوَالَمْ وَأَلْيَاءَ إِنَّ اسْتَحْيُوا الْكُفَّارَ عَنِ الْإِيمَانِ ۝

﴾ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُنَّا مُنَذَّرٌ ۝﴾ (التوبہ: ۹)

* صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب تفرق الناس عن الاماں: ۲۹۱۳۔ # ابن سعد غزوة طائف مغاری، قسم اول، جزء ثانی، ص: ۱۱۴؛ تفسیر ابو حیان تفسیر سورہ الفتح، ج: ۸، ص: ۹۸۔ * فتح الباری، ج: ۷، ص: ۲۸۶ باب احمد۔ # صحیح مسلم، کتاب البیر والصلة، باب انہی عن لعن الدوآب: ۶۶۱۳۔

”اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا، تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔“

اسی موقع کی چیز، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آ را ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃؑ ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی، جو اس حق کے مقابلے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں، اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ”شہزادہ امن“ کے اعلان کے ہیں:

”یہ مت سمجھو کرہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں، بلکہ تواریخ لانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہیں۔“ (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۲)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰ ﷺ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم و لی اور رقیق اللطفی نہ تھی، جو دوسرے نادان بنت پرستوں اور گناہگاروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب ججاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلے مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دوراندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی، کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں، تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے محرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَنْجِذُوا إِلَيْهُودَ وَالظَّاهِرِيَّ أَوْلِيَاءَهُمْ بَعْضُهُمْ أُولَيَاءُ بَعْضٍ طَوْمَنْ
يَتُوَلَّهُمْ مَنْكُمْ فَإِنَّهُمْ مِنْهُمْ طَ اِنَّ اللَّهَ لَا يَهِدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ
مَرْضٌ يَسِّرِأُمُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ تَخْشَى أَنْ تُؤْصِبَهُمْ وَآءِرُكَمْ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْشَرِ أَوْ
أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيَصِّرُعُوا عَلَى مَا أَسْرَوْا فِي أَنْفُسِهِمْ مُنْدِمِينَ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهُؤُلَاءُ
الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهَدَ أَيْمَانِهِمْ لَا إِنْهُمْ لَعَلَمُ طَ حَرَكَتْ أَعْمَالَهُمْ فَأَصْبَحُوا خَسِيرِينَ ۝
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَ مِنْهُمْ عَنْ دِينِهِ فَسُوفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ سُجِّلُونَ كَأَذْلَلَةٍ

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعْزَّهُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴿٥﴾ (۵/ المائدۃ: ۱)

”اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناو، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے، وہ انہی میں سے ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے، جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو دوڑ ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتا نے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو اللہ کی کپی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل، پھر وہ گئے نقصان میں، اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لاے گا، جن سے اللہ راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَنَحَّدُو إِلَيْنَا الظُّنُودُ وَإِذْنَكُمْ هُرُونَ وَأَعْبَارُ أَهْلِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارُ أُولَئِكَ أَرْتَهُمْ وَأَنْقَلَوْهُمُ اللَّهُ أَنِّي لَكُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴽ٥﴾ (۵/ المائدۃ: ۵۷)

”اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ٹھیک مذاق بنتے ہیں اپنا رفیق نہ بناو اور اللہ سے ڈرو، اگر یقین رکھتے ہو۔“

ان آئیوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، حرم اسرار اور مددگار نہ بناو اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَنَحَّدُو بِطَائِنَةَ قِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُو نَكْمَ خَيْلَ الْأَعْدَادِ وَدُونَا مَا عَنَّتُمْ قَدْ
بَدَّتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَا وَهِمُ ۝ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۝ قَدْ بَيَّنَ اللَّمْكُمُ الْأَيْتَ إِنْ لَكُنْتُمْ
تَعْقُلُونَ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۸)

”اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناو، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، ان کو خوشی ہے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتیں جنمادیں، اگر تم کو عقل ہے۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملاماکر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوی کرتے تھے اور بھیدیوں کا پتہ چلا تے تھے، جس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح سورہ متحہ میں ہے، فرمایا:

﴿لَيَاكُهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لَا تَتَحَدُّ دُوَّنِي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلَاءُ الْقُوَّةِ إِلَيْهِمْ بِالْمُوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُجْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِلَيْكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جَهَادًا فِي سَيِّلٍ وَأَبْيَاعَ مَرْضَانٍ تُسْرُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمُوَدَّةِ وَإِنَّا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَمُ بِمَا يَعْلَمُ وَمَنْ يَعْلَمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلُ إِنْ يَسْقُفُكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءٌ وَيَمْسِطُوا إِلَيْكُمْ أَيْرَبِّهِمْ وَالْسَّيْتَهِمْ بِالشَّوْءِ وَوَدُوا لَوْلَكُفُورُنَّ لَكُنْ تَنْعَمُمُ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يُوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (٦٠ / الممتتحنة: ٣-١)

”اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ ہنا تو کتم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہیں، وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروار دگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خون شودی کی طلب میں نکلو، تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب معلوم ہے، جو تم چھاپتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بخواہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھاپا پیغام بھیجے ہو) تم کو موقع سے پا کیں، تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہیں تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور براہی کے ساتھ اپنی زبانیں کھویں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔“

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنئی:

﴿لَا يَهْكِمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقْاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُجْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبْرُدُهُمْ وَنَقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِلَيْكُمْ لَا يَهْكِمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهِرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوْهُمُمْ وَمَنْ يَتُوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (٩٨ / الممتتحنة: ٩-٨)

”اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا، جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکلتے ہیں، اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں، جوان سے دوستی کا دم بھرے گا، تو وہی بے انصاف ہوں گے۔“

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہو گی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا:

﴿عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادُتُمْ مِنْهُمْ مُوَدَّةً وَاللَّهُ قَرِيبٌ﴾

(٧٠) الممتحنة

”امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قادر تر والا ہے۔“

ان آئیوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جانے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے، تیاریاں ہو رہی تھیں، کہ ایک مسلمان حاطب بن جبلؑ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا، کہ قریش خبردار ہو جائیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو گئی، آپ ﷺ نے دوساروں کو بھیجا کہ راستے سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“ عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! جلدی نفر مائیے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں، وہاں ان کی قراۃتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں، تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دین حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بدر والے لوگ ہو اندھے تمہارے گناہ معاف کیے ہیں۔“ اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا يَأْكُلُهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لَا تَنْجُذُهُوا﴾ ”اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنادوست نہ بناؤ۔“ یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے:

”اے خدا! تو یقیناً شریوں کو قتل کرے گا، پس اے خوبیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیر انام عبث لیتے ہیں، اے خداوند! کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں، بیزار نہیں، میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں، میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔“ (۱۳۹-۲۲)

یشور کے صحیفہ میں ہے:

”اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپوچو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا، بلکہ وہ تمہارے لیے پھنڈے اور دام اور

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ الممتحنة: ۴۸۹۰۔

تمہاری بغلوں کے لیے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرز میں پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے،، (یشور باب ۲۳-۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں، جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گناہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

﴿وَذُوَاٰتُكُفُّرُوْنَ كَمَاٰكُفُّرُوا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءٌ فَلَاٰ تَكُنْجُذُوا مِنْهُمْ أَوْ لِيَأْتِهِ حَتّٰىٰ يُهَاجِرُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۴/ النساء: ۸۹)

”وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انہوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناو، یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں بھرت نہ اختیار کریں۔“

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِيَّ أَيْتَنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيْثٍ غَيْرِهِ وَإِذَا يُسْيِّئُنَّكَ الشَّيْطَنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الرِّجْرِيِّ مِمَّ الْقَوْمُ الظَّالِمِيْنَ﴾

(۶/ الانعام: ۶۸)

”اور جب تو ان کو دیکھیے، کہ جو میری آئیوں کی شان میں لغو کئے ہیں، تو ان سے کنارہ کر لے، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجوہ کو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان گناہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔“

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْنِّمُ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمُ الْأَيْتَ اللّٰهُ يُكَفِّرُ بِهَا وَيُسْتَهْزِءُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيْثٍ غَيْرِهِ إِنَّمَا إِذَا مُشْتَهِمُهُمْ﴾

(۴/ النساء: ۱۴۰)

”اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتنا رچکا کہ جب سنو اللہ کی آئیوں سے انکار ہوتے اور ان پر پنی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی انہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔“

یہ احکام اس لیے ہیں، تا کہ بری صحبت کا براثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان نقروں کے ہیں:

”میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لا جھیوں یا لشیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو، نہیں تو تمھیں دنیا سے لکھنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمھیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لا جھی، یا بت پرست، یا گاگی

دینے والا، یا شرابی، یا لیٹرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا..... غرض کتم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو۔“ (اول قرآنیون ۵)

”اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت بجٹے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کوئی سماج چھاہے اور روشنی اور تاریکی میں کوئی سائل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، اللہ کی یہیکل کوبتوں سے کوئی سی موافقت ہے..... اس واسطے اللہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوو۔“ (قرآنیون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحاںی غیرت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ إِسْتَيْكَارَكَ فَأَجْزُهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَا مَأْمَنَهُ طَذِيلَكَ يَا أَنْتُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (٩: توبہ: ٦)

”اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تھے سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو تو اس کی اسن کی جگہ تک پہنچا دے، یہ اس لیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔“

کیا ایک جنگجو نہیں دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے مال باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بحالا نا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا:

﴿وَإِنْ جَاهَدُكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطْعِمُهُمْ وَاصْحَابُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفٌ وَالثِّيَقُ سَبِيلٌ مَّنْ أَنْتَابَ إِنَّهُمْ لَمَّا أَتَيْكَ مَرْجِعَكُمْ فَإِنَّكُمْ بِمَا لَنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

(١٥: لقمان: ٣١)

”اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ یہیکی کا برداشت کرو اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آن ہے، پھر میں تم کو جتاں گا، جو تم کرتے تھے۔“

ندیہی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ ندیہی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ یہیک برداشت میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں

”منافقین“ کہتے ہیں، بعض موقوں پر ختنی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں، وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شہوں اور انواعوں سے مسلمانوں کی جمیعت میں پریشانی پیدا ریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی ختنی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ جان کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جوں سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑپڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑ جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس نہ موم حرکت سے باز نہ آ جائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورہ توبہ میں ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِي جَاءَهُ الرُّكْنَارُ وَالْمُنْفَقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا وَهُمْ جَهَنَّمُ وَإِنْسَنٌ الْمُصْبِرُونَ يَحْلِفُونَ بِأَنَّ اللَّهَ مَا قَاتَلُوا وَلَقَدْ قَاتَلُوا كُلَّمَةَ الْكُفُرِ وَلَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَتَّوْبِيَ الْمَبْيَالُوا وَمَا نَفَقُوا إِلَّا كُنَّ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنَّ رَبَّنَا يُحِبُّ خَيْرَ الْهُمَّ وَإِنَّ رَبَّنَا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾

(۷۳-۷۴ التوبہ)

”اے چنبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر ختنی کرو اور ان کی جائے بناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بڑی بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا، جس کو وہ پاٹ سکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا، لیکن یہی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دوامند کر دیا ہے تو اگر وہ باز آ جائیں، تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ انکو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہو گا نہ مددگار“

یہ آیتیں اس ختنی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین کوئے کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں ﷺ کے مقابلہ میں اپنی پوری ختنی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْوَأْتُمُوا قَاتِلَوَالَّذِينَ أَيُوْجُكُمْ فِيَنَ الْكُفَّارِ وَلَيَجِدُو فِيْكُمْ غُلْطَةً وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (۹/۱۲۳ التوبہ)

”اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر

• تفسیر ابن جریر، طبری، ج ۱۰، ص ۴۶۔ مصر۔

سختی یا کمیں اور یقین کرو کہ اللہ برہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے، تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان رحمند کی نیت نہ کرس۔

تحريم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہل بیت نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افراط اور امتشار پیدا کرنا جاتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھیتی سے پوش آنے کا حکم ہوا:

﴿لَا يَكُنْهَا النَّيْرٌ جَاهِدُ الْفَقَارِ وَالْبَنِفَقَتِينَ وَأَغْلَظُ عَلَيْهِمْ طَرِيقًا وَمَا وَهُمْ حَمِيمٌ طَبِيعَتْ بَشَرَةُ الْمَسْحَةِ﴾

(٦٦/التحميـه: ٩)

”اے پیغمبر! ان کا فردوں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر ختنی کرو اور ان کا مٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی لئنی بڑی چکر ہے۔“

یہ تمام موقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی برپا دی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملًا شر مک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے، جس سے مخالف جو اسلام پر منگدی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورہ فتح کی حسب ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری اور دوسرا طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدی کی تعریف ہے:

(مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشَدُّ أَعْنَاءً عَلَى الْكُفَّارِ حَمَاءٌ بِيَنْهُمْ) (٤٨ / الفتح: ٢٩)

‘محمد اللہ کے رسول اور جوان کے ساتھ ہیں وہ کافروں رنجت (پھاری) ہیں اور آپکی میں مہر و

اَشَدَّ اَءُ عَلَى الْكُفَّارِ كَا يَرْجُمَهُ كَهْ وَهُ كَافِرُوں پر سخت ہیں۔ ”اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی بہت استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں، کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں، کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے، اس لیے محاورہ کے مطابق اَشَدَّ اَءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجیح نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابلہ میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمشیری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر الحیط میں، قاضی یضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیے ہیں، جو سورہ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

﴿أَوْلَئِكُمْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعْرَثُتُمْ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (٥٥) / المائدة: ٥٥

”فرما بردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔“

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورہ ہود میں ہے:

﴿يَقُولُ أَرْهَطْنَا أَعْزَّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ﴾ (۱۱ / ۹۲: هود)

”اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔“

دوسری آیت میں ہے:

﴿عَزَّ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۱۲۹: التوبہ / ۹)

”تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔“

لسان العرب میں ہے:

وَرَجُلٌ شَدِيدٌ قَوِيٌّ وَالْجَمْعُ أَشَدُّ أَعْدَاءَ۔

مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں ﴿أَشَدُّ قُوَّةً، أَشَدُّ خَلْقًا، أَشَدُّ تَشْيَّتاً، أَشَدُّ مُنْهَمٍ بَطْشًا﴾ وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں:

﴿أَشَدُّ دِيَةً آزِيْفِيٌّ﴾ (۲۰ / طہ: ۳۱)

”اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔“

﴿وَبَيْنَنَا فَوَقَكُمْ سَبْعًا شِدَّادًا﴾ (۷۸ / البای: ۱۲)

”اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔“

﴿وَشَدَّدْنَا مُلْكَةً﴾ (۲۰ / ص: ۲۸)

”اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔“

﴿فَشَدَّدُوا الْوَتَاقَ﴾ (۴۷ / محمد: ۴)

”پھر مضبوط پاندھو۔“

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرام ﷺ کی صفت تھی، انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پرواہ کی، تکلیفوں اور مژاحتوں کا پر زور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تکلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہو لہاں ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دونہ کہا اور جس کی تصدیق کر جکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی

قوت کارعب ان پر بینہ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ «سَالِقُ فِي قُلُوبِ الظَّيْنَ لَفَرُوا الرُّعْبَ» (آل عمران: ۱۵۱، ۸ / الانفال: ۱۲) کہ ”میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔“ وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا: «وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ» (الاحزاب، الحشر: ۱) ”ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔“

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَأَعُدُّوا لَهُمْ مَا أُسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ﴾

(الانفال: ۶۰)

”ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا بندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مروع کرو۔“

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور تنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا: ”جو شخص گھوڑا اللہ کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے، اس کے لیے پردہ پوش ہے اور جو نماش کے لیے باندھتا ہے، وہ اس کے لیے عذاب ہے۔“ * اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدی میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا نشاذ اتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور اللہ کے لیے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برداوے سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے ناراضی

یہاں کوئی مفترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمه کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضا مندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد، انہی دو برادر کے جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اس لیے یہ ممکن ہے اور نامناسب ہے، کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے

* صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل لثلاثة: ۲۸۶۰۔

فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رحمات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر بچینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع محل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزادگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و ف Hassan کے لیے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو، دوستی و دشمنی، رضا مندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو، وہ اللہ کے لیے ہو، "الحب في الله والبغض في الله۔" یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فانہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع محل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہو گا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علیحدہ بھی ہو گا، مومن سے خوش ہو گا تو منافق سے ناخوش بھی ہو گا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دلوں کی محبت کیجا نہیں ہو سکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبِينَ فِي جَوْفِهِ﴾ (۳۳/الاحزاب: ۴)

"اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔"

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"کوئی آدمی دو آقاوں کی خدمت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرا سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرا کو ناچیز جانے گا، تم اللہ اور مال دلوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" (متی: ۶-۲۲)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس ﷺ نے اللہ اور آدمی، یعقوب ﷺ نے اللہ اور دنیا، یوحنا ﷺ نے اللہ اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہر اکر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا، وہ دوسرا سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کا ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دلوں صرف اللہ کے لیے ہوئی چاہیے، اپنی ذات کے لیے نہیں، یعنی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذر گنڈو سے پوچھا کہ ایمان کی کونی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟ عرض کی: اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے۔ فرمایا یہ کہ "بہمی میل جوں

ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب مجانبة اهل الاهواء۔ ۱۴۶/۵، ۴۵۹۹، احمد۔

گلبیوں کے نام (۱۰۱)۔ یعقوب (۲۵۲)۔ یوحنا (۱۵۲)۔

اللہ میں ہو، محبت بھی اللہ ہی میں ہوا اور ناراضی بھی ہو تو اللہ ہی میں ہے۔» ۱ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ ”کون ہی نیکی اللہ کو زیادہ پیاری ہے؟“ کسی نے نماز کہا، کس نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا: ”تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اللہ کو یہ نیکی پسند ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے مخالفت ہو۔“ ۲ اسلام میں کسی سے دائی یا م سوروثی نفرت کی تعلیم نہیں

اللہ کے لیے کسی سے ناخوشی پا مخالفت یا نارضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو، بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو، جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿حَسِبَ الْيَهُودُ الْإِيمَانُ وَزَيْنَةٌ فِي قُلُوبِكُمْ وَمُكَرَّهَةٌ إِلَيْكُمُ الْكُفُرُ وَالْفُسُوقُ وَالْعُصَيَانُ ۚ﴾

(۴۹ / الحجرات: ۷)

”اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک کرو رہا ہے۔“

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود موسیٰ یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فرقہ و فنور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کافر و منافق ہے، یہ در ہو جائے تو وہ میں برابر کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿فَإِنْ تَأْبُوا وَآتَأْمُوا الصَّلَاةَ وَلَوْلَا الرِّزْكُوَةُ قَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ ۖ﴾ (۹۱: التوبۃ: ۱۱)

”تو اگر وہ کفر سے تو پر کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔“

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃ کراہت محبت سے دشمنی دوستی سے اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں شخصی یا انسانی یا اولٹنی کسی پیدائشی یا دائی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قبل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے نہ چند اہ ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ محسوسیوں کی طرح کوئی پاک نہ ادا اور بدگیر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپیں غیر یورپیں کی قسم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابو جہل و ابوالعبہ ہو سکتا ہے اور ایک معمولی جبشی و جنمی، مومن و موحد ہو کر بلال جبشی، صہیب روی اور مسلمان فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمر، وہی سفیان، وہی عکرمسد، وہی خالد بن اسد جو کل تک کافر کے علمبردار ہیں کر مسلمانوں کے خنت ترین دشمن تھے،

۱ شعب الایمان بیہقی: ۹۵۱۴؛ مشکوٰۃ المصایب، کتاب الادب، باب الحب فی: ۵۰۱۴۔

۲ مسند امام احمد، ج ۵، ص ۱۴۶۔

بیک نظر ان کی وہ کاپلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگرد ہو گے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

﴿إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَّتُمْ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصَبَّتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) (۲/۲)

”(یاد کرو) جب تم با ہم دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں با ہم الفت پیدا کر دی اور تم اسکے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔“

نائپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ ہے، جس کی بنا کسی انسان کی گناہگاری اور عصیان کاری پر ہے، توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشر عالم، نے ایسے گناہگاروں کو اللہ کی زبان سے یہ مژده سنایا کہ

﴿لَعْنَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْطُلُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِٗ إِنَّ اللَّهَ يَعْفُرُ الْذُّنُوبَ

﴿جَمِيعًا طَالِهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (آل الزمر: ۵۳) (۳۹/۳)

”اے میرے وہ بندوں جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشش والا اور رحم کھانے والا ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: ((الَّتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ)) ❶ ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔“ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گناہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترجم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضاۓ الہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کوشراپ پینے کی عادت تھی، وہ اس کی سزا بار بھگتئے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہؓ نے کہا: اللہ اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت نے یہ الفاظ سنتے تو فرمایا: ”تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد کرو، مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔“ ❷ اس واقعہ سے علمانے یہ مسئلہ مستحب کیا ہے، کہ گناہگار پر بد دعا نہ کی جائے، ❸ ماعز بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتكب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھوں نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت نے کئی دفعوں کی درخواست روکی، لوگوں سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہیں؟ سب نے کہا: ایسا تو نہیں ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کیے گئے اور ان پر سنگ باری کی گئی اور اسی حال میں انھوں نے جان دی، صحابہؓ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے

❶ ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب ذکر التوبۃ: ۴۲۵۰۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر: ۶۷۸۱، ۶۷۸۰۔

❸ فتح الباری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من ...، شرح حدیث مذکور، ج ۱۲، ص: ۶۸۔

باجود ماعز کو برا کئتے تھے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: "ماعز کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔" ❶ اسی طرح قبیلہ غامدی ایک حاملہ عورت نے آکر خودا پے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی، آپ نے فرمایا: "وضع حمل کے بعد آتا۔" وہ اس کے بعد آئی، فرمایا: "بچہ کی پرورش کرو، جب بچہ دو دھچکوؤں دے تب آتا۔" وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبک دوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احسان گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینیں اڑ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے منہ پر پڑیں، انہوں نے عورت کو برا کہا، آنحضرت ﷺ نے سناتو فرمایا کہ "خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشنا جاتا۔" ❷

ترک ہوئی

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا ہے، کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ اللہ کی خوشنودی اور رضا مندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیک نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ہوئی ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہوئی سے پاک رکھے، کہ انسان کا حقیقی اللہ ہی ہے، جس کے لیے وہ کام کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیروں نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش و ہوئی کے بت چھے ہیں، قرآن نے فرقان اور جا شید و سورتوں میں متنبہ کیا:

﴿أَفَرَعِيْتَ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا هَوْنَهُ﴾ (٤٥ / الحاثۃ: ٢٣)

"اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اللہ بنا رکھا ہے۔"

اسی لیے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعت محمدی ﷺ نے ترک ہوئی کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ پھر بے گی اور وہ اس کا کوئی حرکت باقی رہے گا، اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا وہوں کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وہی محمدی نے فرمایا:

﴿وَمَنْ أَصْلَىٰ وَمِنْ أَنْهَمْ هَوْنَهُ بِغَيْرِ هُدًىٰ مِنَ اللَّهُ﴾ (٢٨ / القصص: ٥٠)

❶ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنی: ٤٤٣١۔ ❷ ایضاً: ٤٤٣٢۔

”اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے اللہ کی راہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔“

پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُ الْهُوَىٰ فَيُفْسِدُكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۲۸/ ص: ۲۶)

”اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کر وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔“

عدل درستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ہوئی کے زہر قاتل سے مرجاتی ہے، فرمایا:

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهُوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوْا﴾ (۱۳۵/ النساء: ۴)

”عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔“

ہوائے نفسانی تمام برا ایسوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے، فرمایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَىٰ النَّفْسَ عَنِ الْهُوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْأَوَىٰ﴾

(۴۱-۴۰/ النازعات: ۷۹)

”اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو پیش جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔“

اخلاق اور محبت الہی

دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو اللہ کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لا زوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے، عقائد کے باب میں محبت الہی کے زیر عنوان اس کی طرف محمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو قرآن اور انحصار میں بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیوں کر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصر ایک کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبت الہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی زبان سے فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّ كُنْتُمْ تَعْبُونَ اللَّهَ فَإِنَّمَا يُعْبُونَ بِمَا يَنْهَا اللَّهُ﴾ (۳۱/آل عمران: ۳)

”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

اس لیے آنحضرت کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر تقاضت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنا م اس نے بتایا ہے کہ اللہ

کی محبت کے متعلق اور سزاوار کوں کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں؟ اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ بھی میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو اللہ کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بد اخلاقی اور بد کرداری بھی ہے۔
پہلی صفت میں حسب ذیل خوش قسم انسانی جماعتیں داخل ہیں:

﴿وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ٦٨)

”اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْجُنُودَ﴾ (آل البقرہ: ١٩٥) و المائدة: ١٣

”اللہ اپنے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَابِينَ﴾ (آل البقرہ: ٢٢٢)

”اللہ تو بہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران: ١٥٩)

”اللہ تو کل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (آل عمران: ٤٢) حجرات: ٧

”اللہ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَقِّلِينَ﴾ (آل التوبہ: ٤)

”اللہ تو قوی والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (آل عمران: ١٤٦)

”اور اللہ صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُظَاهِرِينَ﴾ (آل التوبہ: ٩)

”اور اللہ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ﴾ (آل الصفہ: ٦١)

”اللہ ان کو پیار کرتا ہے، جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔“

ان آیات پاک میں نوباتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت اللہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقوی، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت اللہ کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران: ٣٢)

”تو اللہ کا فروں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۰)

”اللہ سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ حُكْمًا لَا فُقْرَارًا﴾ (۴/ النساء: ۳۶)

”اللہ اس کو پیار نہیں کرتا، جو ترانے والا ہو شکنی مارنے والا ہو۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ حَوَّانًا أَيْمَانًا﴾ (۴/ النساء: ۱۰۷)

”اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کا راوی گناہ ہگار جو۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَالِقِينَ﴾ (۸/ الاتفال: ۵۸)

”اللہ خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ حَوَّانٍ كُفُورٌ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۸)

”اللہ کسی خیانت کارنا شکر کے کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرَجِينَ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۶)

”اللہ ترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُقْسِدِينَ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۷)

”اللہ فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۶/ الانعام: ۱۴)

”اللہ فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ (۱۶/ التحـل: ۲۳)

”اللہ مغوروں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (۴۲/ الشوری: ۴۰)

”اللہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔“

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كُفَّارَ أَثْمَمْ﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۶)

”اللہ ناشکر گناہ ہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔“

کفر، بدگوئی، بدله لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر، غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف،
ظلم، گناہ، وہ بد اخلاقیاں ہیں، جو انسان کو محبت الہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہو گا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت ﷺ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملہ بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آرامستہ و پیغمبر استہ بنانا، اسی لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

﴿وَيَعْلَمُهُ الْكِتَابُ وَالْجِلْمَةُ وَيَذَّكُرُهُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۱۲۹)

”وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔“

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

﴿وَإِنَّمَا يُعْثِثُ مُعْلِمًا﴾

”اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم رباني نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر تختی اور نری دلوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشرت ہو، جس سے زخم کو چیز کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرا ہے ہاتھ میں مرہم ہو، جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشٹ اور چیزے کی پروش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشٹ پوست کی جگہ تندرست گوشٹ و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ

آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں تختی اور نری کے موقع محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلنیں لیا، مگر یہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے، ﴿ قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتے تھے اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے حکام مثال جاتے تھے۔“ ﴾

یہ تختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثالیں یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد بنوی میں ایک بدودی آیا، اتفاق سے اس کو اتنی بخی کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے گھن میں بیٹھ گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوزے، آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا: ”تم بخخت کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیج گئے ہو۔“ اس

۱ ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فضل العلماء: ۲۲۹۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب الادب باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تمسروا: ۶۱۲۶۔ ۳ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب کراہیۃ الشفاعة فی الحدود: ۶۷۸۸۔

کے بعد اس بدھی کو بلا کر فرمایا: ”یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں، یہ اللہ کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں۔“ پھر لوگوں سے فرمایا: ”اس پر یانی بہارادو۔“ *

ای طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہو گئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا، یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا: ”ایک غلام آزاد کرو۔“ عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا: ”دو مسینے لگاتار روزے رکھو۔“ عرض کی، روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا: ”تو اچھا سائھ مسکینوں کو کھانا کھلادو۔“ عرض کی، ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا: ”اچھابنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے سائھ مسکینوں کو کھانا کھلادو اور جو بیچ وہ تم اور تمہارے گھروالے کھائیں۔“ وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور ﷺ نے کتنی زمی کی۔ ②

یہ اور اسی قسم کے واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برقراری جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ ﷺ نرمی سے سمجھادیتے اور لطف و محبت سے فرمادیتے تھے۔

ع قاہری با دلبری پیغمبری است
اخلاقی فضائل و رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم الہی بتا کر، کہیں اچھی اچھی موثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس عمل کرنے کو فوراً تمار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمان الٰہی کی صورت اختصار کی اور کہا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَا عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾

وَالْبَغْيُ يَعْظِمُ لَعْلَكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ ۚ (١٦ / النَّحَا : ٩٠)

”بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور نامانند یہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو۔“
یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شبۂ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون و چوں کی گنجائش نہیں۔ تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشییبوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یسروا ولا تعرضاً: ٦٢٨ وکتاب الوضو: ٢٢٠؛ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب غسل البول: ٦٦١۔ **ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی الظہار: ٢٢١٣۔**

سنے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگردان ہو جائے، مثلاً: اللہ کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں چھپی گئی کہ «**كَمْثُلٌ حَتَّةٌ**» (۲/ البقرہ: ۲۶۱) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر آگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربائی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریاد نماش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی بدله ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا «**كَمْثُلٌ صَفْوَانٌ**» (۲/ البقرہ: ۲۶۳) ”اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا شجاعتی چیز ان پر چھینٹ دے، جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا ذرور کی بارش ہوئی تو پتچ اور مٹی سب بہہ گئی اور چیز ان دھل کر صاف ہو گئی، اس پتچ سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ بے ایمانی سے تیمور کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ”جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنے بیٹت میں آگ بھرتے ہیں۔“ (۲/ الشارع: ۱۰)

پیغمبر پیغمبре مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی: ”کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشہ نوج نوج کر کھاتا ہے۔“ (۲۹/ الحجرات: ۱۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: ”جودے کرو اپنی لیتائے ہو گیا قے کر کے پھر چاتا ہے۔“ * اس سے زیادہ کوئی عکر وہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے؟ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یاد اثر ہوا کہ خود آ کر عدالت نبوی ﷺ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگار کیے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگار ہو چکا، تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرا سے یہ کہتے تھے کہ اس کو دیکھو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتنے کی طرح سنگار کیا گیا۔ حضور ﷺ نے پکارا کہ ”فلا اس فلان صاحب کہاں ہیں؟“ انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یا رسول اللہ افرمایا: ”اڑوا اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ۔“ انہوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ اس کو کون کھائے گا، فرمایا: ”تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے۔“ * غیبت کی برائی کو زہر نہیں کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعمیم کا تیرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور بے کاموں کے بے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے، جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور بے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً: شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان

صحیح بخاری، کتاب الہبة، باب لا يحل لاصدأن یرجع فی هته: ۲۶۲۱۔

ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ما عز بن مالک: ۴۴۲۸۔

کیا: ”مسلمانوں اشراب، جو اور پانے کے تیرنا پاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔“ (۵/۹۰-۹۱) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھلیے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجے جانی و مالی بر بادی ہوتی ہے۔ اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے مخالن میں اور رذائل کو شیطان کے مخالن میں داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے ابتلاء کا شوق ہوتا ہے، مثلاً: عفو و درگز کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

﴿إِنْ تُبَدُّواْ خَيْرًا وَّ تُخْفُواْ أَوْ تَعْقُواْ عَنْ سُوْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَقُوْاْ قَدِيرًا﴾

(۴/ النساء: ۱۴۹)

”اگر تم کوئی بھلانی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا القدر والا۔“

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، ”خلقو باخلق اللہ“ گوصرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جواب اچھا ہو، تو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا: ”نہیں۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَانَ﴾

”اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔“

اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دیتی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۳/الاحزان: ۲۱)

”تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔“

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ سے دی گئی:

﴿لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ (۶۰/المتحہ: ۴)

تفسیر بحر محیط، ابن حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ۳، ص: ۳۸۵۔ ۲ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحريم الكبر و بیانہ: ۲۶۵؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الكبر - ۱۹۹۹۔

”تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیر وی کا اچھا نمونہ ہے۔“
ان دونوں آئیوں میں اخلاق کی بعض صفتیں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی
ہے اور ان کی پیر وی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی براہی کو یوں ذہن نشین کرایا:

﴿إِنَّ الْمُبَدِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۲۷)

”بے شے فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔“

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی
برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی، جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ ایک صحابی دربار نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا تصد
بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں،
میں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا، اے اللہ کے
رسول ﷺ! آپ پر سلام، (علیک السلام) آپ ﷺ چپ رہے، پھر فرمایا: ”علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا
سلام ہے، السلام علیک کہو۔“ میں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ کے رسول ہیں؟ فرمایا: ”ہاں میں اس اللہ کا رسول
ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور اس سے خنک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اگا
دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لاق و دلق بے نشان بخبر میں ہو، تمہاری سواری و ماں گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو تو
وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے۔“ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا:
”کسی کو برانہ کہہ۔“ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو
کے غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برانہیں کہا، آپ ﷺ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ ”تم کسی چھوٹی سے چھوٹی
نیکی کو بھی حیرانہ جانو یعنی اس کو کیسے جاؤ اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے بھائی سے بھائی کو اپنا تہبند کو بھارتار ہے، یہ
بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا کر کو، اگر یہ نہیں تو نخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت
نیچے تک لے کر ناگزور کی نشانی ہے ॥ اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمھیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ
جاناتا ہے، تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو، اس کو عار نہ دلاؤ، کہ اس کا وباں اسی کی
گردن پر ہوگا۔“ ॥

اس طریقہ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے، کہ آپ ﷺ نے بدھی کو اللہ کے آگے جھکنے اور اس سے گزگڑا
کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں اللہ جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے، اس کا اثر یہ

۱۔ عرب امراء غرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عباد کے دامن یا گون کو زین پر کھیست کر چنان دسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی۔

۲۔ سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔

ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکارا تھا اور حضور اقدس سے دین و دنیا کی صحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باقی بتا کیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تبلیغات بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ ”غصہ نہ کر۔“ اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرا لیا، آپ نے ہر دفعہ بھی جواب دیا کہ ”غصہ نہ کر۔“ ۱۰۱۳۲ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہو گا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برا ایساں ہو جاتی ہوں گی، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا، جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے ہر بار بھی فرمایا: ”غصہ نہ کیا کرو۔“

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟ فرمایا: ”اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا،“ پھر پوچھا، کس غلام یا باندی کو ازاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا: ”جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو۔“ پھر دریافت کیا کہ اگر ان یہیں کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا: ”تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بد سلیقہ کا کام کر دو۔“ پوچھا: اگر یہ بھی نہ بن سکے؟ فرمایا: ”شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو۔“ ۱۰۱۳۳

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ﷺ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جوان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہ ﷺ سے آپ نے پوچھا: ”کتم جانتے ہو مفلس کون ہے؟“ لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا: ”میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گونماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہو گی، اس پر تہمت لگائی ہو گی، اس کا مال کھا گیا ہو گا، اس کا خون بھایا ہو گا، اس کو مارا ہو گا، تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا، اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برا ایساں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔“ ۱۰۱۳۴ مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

ای طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے یہ دریافت کیا کہ ”پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟“ لوگوں نے کہا، جس کو لوگ

۱۰۱۳۴ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ۶۱۱۶ و الترمذی، ابواب البر والصلة، باب

ما جاء في كثرة الغضب: ۲۰۲۰۔ ۱۰۱۳۵ ادب المفرد للبخاری، باب ان كل مصروف صدقة: ۲۲۵۔

۱۰۱۳۶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۹۔

کشتی میں پچھاڑنے سکتیں، فرمایا: ”نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔“ * اس شخص کو جس کے پنج نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ ”بے اولاد تم کس کو کہتے ہو؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، جس کے پچھے نہ جیتے ہوں، فرمایا: ”وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگئی نہیں تھی۔“ ** (احادیث میں ہے کہ جو پنج کمسنی میں مر جائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ ”کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برآکون ہے؟“ حاضرین چپ رہے، (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور بے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسرا بار پوچھا، ایک شخص نے کہا، ہاں، یا رسول اللہ! فرمائیے، ارشاد ہوا: ”تم میں سب سے اچھا ہے، جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برادہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔“ *

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، میں اے اللہ کے رسول! ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں: ”گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، اللہ نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسانہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔“ ** (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا: ”کون مجھ سے اپنے دوجڑوں اور دونوں پاؤں کے پیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔“ *** کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے، ان دو فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے پیچ میں زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے پیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ ”کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا

* صحيح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من يمليك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔ ۲ ایضاً۔

** ترمذی، کتاب الفتنه، باب حدیث خیرکم من يرجى: ۲۲۶۳ و باب في خيار الأمراء و شرارهم: ۲۲۶۴۔

*** جامع ترمذی، ابواب الرہد، باب من اتفى المحارم فهو اعلم الناس: ۲۳۰۵۔

**** صحیح بخاری، کتاب الرفاقت، باب حفظ اللسان: ٦٤٧٤۔

ہوں۔ آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا، میں اے اللہ کے رسول! فرمایا: ”کسی سے کچھ مانگناہ کرو۔“ چنانچہ انہوں نے بھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ ۱

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، جب تک الوداع میں آنحضرت منی میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا: ”لوگو! آج کونسا دن ہے؟“ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی، اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا: ”کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔“ سب نے کہا: جی ہاں، پھر پوچھا: ”یہ کونسا مہینہ ہے۔“ پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ آپ ﷺ اس کا نام پکھا اور بتائیں گے، فرمایا کہ ”کیا یہ ذی الحجه نہیں۔“ سب نے کہا، جی ہاں، پھر فرمایا: ”یہ کونسا مقام ہے۔“ پھر سب خاموش رہے، کہ آپ ﷺ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ ”یہ بلکہ حرام نہیں ہے۔“ سب نے کہا، جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھنی تو فرمایا: ”مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔“ ۲ کبھی خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص طور کی بصیرت فرماتے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ گویا فطرة تارک دنیا تھے، برے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا: ”اے ابوذر! جہاں رہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو منداڑا لوگے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔“ ۳

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ بیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس نگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تمہارا پنے بھائی سے ملت وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھلکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پھر، ہڈی، یا کاغذ بھار دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرا بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے۔“ ۴

صدقہ کی جواہیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنابر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بھاولی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ ”جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار دلیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلکے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی۔“ ۵ (۶۰ / المحتagna: ۱۲)

۱ مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۷۵۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام میثی: ۱۷۴۱، ۱۷۴۲۔

۳ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی معاشرة الناس: ۱۹۸۷۔

۴ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔

عبدہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ”ہم ہر حالت میں رسول ﷺ کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل والصف کے ساتھ تھیک رکھیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“ ❶

یہی عبادہ جیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مکہ میں بھرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ ﷺ نے نقیب بنیا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت ﷺ نے ہم نصیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی: ”ہم اللہ کا کسی کوشش کی نہ بنایں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحک کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مارنیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کسی کی تواں کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔“ ❷ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہو گا۔

بعض دفعہ حضور ﷺ ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دے دیتے تھے، دریافت فرمایا کہ ”افتر اس کو کہتے ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا: ”وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا۔“ ❸ ایک بار ارشاد ہوا کہ ”تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔“ لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے، فرمایا: ”تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کر دکھائیں گے کونا پسند ہو۔“ کسی نے کہا، اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا: ”اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔“ ❹ ایک موقع پر ارشاد ہوا: ”میں تمھیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: ”ہر کمزور زمد جس کو لوگ حقیر جانیں یا جومتواضع ہو، (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے۔“ پھر فرمایا: ”کیا میں تمھیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ”ہر درشت مزاج، شنجی خور، مغرور۔“ ❺

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دھراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ ﷺ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرزیت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا: ”اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا۔“

❶ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۳۱۸۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الدیات: ۶۸۷۳۔

❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم النميمة: ۶۶۳۶۔

❹ ایضاً، باب تحريم الغيبة: ۶۰۹۳۔

❺ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب النار یدخلها الجبارون: ۷۱۸۷۔

صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یا رسول اللہ! فرمایا: ”جس کا پڑوی اس کی برائیوں سے اُس میں نہ ہو۔“ * ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ”دین داری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے۔“ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کس کے ساتھ، فرمایا: ”اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔“ *

اخلاقی تعلیمات کی فضیلیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریع کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کا نات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے سچے فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھرا د کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بدندی ہے، اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً: حج بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔ تیسرا قسم، کاموں کو اچھے اور مدد طریقہ سے بجالانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً: اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور و طریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ائم من لا یا من جارہ بواهله: ۶۰۱۶؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحريم إینا الجار: ۱۷۲ میں ((لا يدخل الجنة من لا یامن جارہ بواهله)) کے الفاظ ہیں۔

** صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان أن الدين النصيحة: ۱۹۶۔

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی

حقوق کی جمل تشریح تو اور ہوچکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿خَلَقَ لَكُم مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲/ البقرة: ۲۹)

”اللہ نے تمہارے (کام کے) لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔“

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گوند گاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمدادی کا نام حق ہے، جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَنِّي أَمْوَالَهُمْ حَقٌّ لِّلْسَائِلِ وَالْمَعْرُوفٌ﴾ (۱۹/ الذاريات)

”اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔“

﴿وَالَّذِينَ فِي آمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِّلْسَائِلِ وَالْمَعْرُوفٌ﴾ (۷۰/ المعارج)

”اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے، جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔“

﴿وَاتِّذَا الْقُرْبَى حَقَّةٌ وَالْمُسْكِينُونَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل)

”اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور سافر کو۔“

﴿فَاتِّذَا الْقُرْبَى حَقَّةٌ وَالْمُسْكِينُونَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾ (۳۰/ الروم)

”تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور سافر کو۔“

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیزیں ملی ہے، ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

﴿وَأُنُوا حَقَّةٌ يَوْمَ حَسَادَةٍ وَلَا سُرْفُوْاطٌ﴾ (۱۴۲/ الانعام)

”اور پیدا کو اس کے کائیں کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔“

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پہل پھول نکلے اور ہری بھری کیجی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور

اس میں سے ان کو بھی کچھ دے، جن کو نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

((ان لزو جلک علیک حقا و لزورک علیک حقا)) ❶

”تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقی کا بھی تم پر حق ہے۔“

((ولأهلك علیک حقا)) ❷

”تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔“

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ”بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلانے، کپڑے پہنانے اور اس کے چہرہ پر تھکرنہ مارے۔“ ❸ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرا انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((فان لنفسك علیک حقا)) ❹

”بیٹک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔“

((فان لجسدك علیک حقا و لعينيك علیک حقا)) ❺

”تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔“

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے، جتنی عام طور سے کچھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، بنا تات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم: ۱۹۷۵۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الahl فی الصوم: ۱۹۷۷۔ ❸ ابو داود، کتاب النکاح، باب فی حق المرأة علی زوجها: ۲۱۴۲۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التهجد: ۱۱۵۳۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم: ۱۹۷۵۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو قنام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط عظیم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمشتا ہوا بذریعہ کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کا کائنات ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا اسا مزید اشارہ، تو چھ مقصود کے لیے منید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جان دار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں، ان سے وہی کام لیا جائے، دوسری یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر کئے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

﴿خَلَقَ لِكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲۹: البقرة)

”زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔“

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کیلئے یہ سب چیزوں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کیلئے وہ بنائی گئیں اور اس لیے، تاکہ وہ وقت مقررہ تک انسانوں کو اپنا فرع پہنچا سکیں، ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ”ایک دفعہ ایک آدمی نیل پر سوار جا رہا تھا کہ وفعۃ اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں، میں تو کھیت کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔“ * اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا: ”جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا چانور یا انسان اس کا چھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔“ ** اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاشنا پسندیدہ ہے۔ * ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک شخص صرف اس لیے بخشش گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔“ *** اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بیلوں کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سک سک کر مر گئی۔ **** ایک اور شخص نے چیزوں کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔“ *****

* صحیح بخاری، کتاب الحرج والزارعہ، باب استعمال البقر للحراثة: ۲۲۲۴۔

** صحیح بخاری، باب فضل الزرع والغرس: ۲۳۲۰ و مسلم کتاب المساقاة: ۳۹۶۸ تا ۳۹۷۳۔

*** فتح الباری شرح صحیح البخاری، شرح باب مذکور، جلد خامس، ص: ۷ مصر۔

**** صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الآثار على الطريق: ۲۴۶۶۔

***** صحیح بخاری، کتاب بدء الخلائق، باب اذا وقع الذباب في... ۳۳۱۸۔ ۳۳۱۹۔ ۳۳۲۰۔ ایضاً: ۳۳۱۹۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی بیان کیے گئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وصرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب بلوظار کی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔ اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراة و انجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا یعنی صرف ”محبت کرنا“ کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے، جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو“۔ * اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہتا اور پسند کرنا توراة و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سر عنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سر عنوان تشریع کا حتاج ہے اور اس تشریع کے ضمن میں انسانی تعلیمات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی میشی اور دوری و نزدیکی کی تدریجی ترتیب کے ساتھ تعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً: ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ میں اس غیرہ بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدھض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصیت (تعصیب) ہے، جس سے بچنے کی ہر مسلمان کوتا کید کی گئی ہے۔

اسلام کے سواد و سرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً: بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان و حیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تباہ نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برادر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہ بودھیت اور عیسائیت میں تمام

¹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان: ۱۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۱۷۱، ۱۷۰۔

² سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العصیۃ: ۵۲۱۔

قربت داروں کو چھوڑ کر صرف مال باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برتراند حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قربت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے، اس کے ساتھ تعلقات کی واحدگی دو ہری تہبری ہو جاتی ہے، مثلاً: ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیماریاں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوںی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا اہم محلہ دار بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی مدد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دو ہرے تہرے حقوق پہلے مال کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوںی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہو گی کہ اپنی غریب اور بیمار مال کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوںی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے، یہ ایسا نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مراحتت گوارہ کر کے، دونوں کے حقوق سے عہدہ برا آ ہو، اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاق اس کو مذور سمجھا جائے گا، شریعت محمدی علیہ السلام نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے:

**﴿وَيَا أَيُّهُ الَّذِينَ إِحْسَانًاٰ وَيَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَاهِمِيٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنْبِ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَإِبْرِيزِ السَّيِّئِلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾** (٤/ النساء: ٣٦)

”اور مال باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور قبیلوں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ داروں پڑوںی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوںی کے ساتھ اور ساختی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لوئڈی، غلام کے ساتھ۔“

**﴿فُلْ مَا آنَقْتَمْ قُنْ خَيْرٌ قَلْلُوا الَّذِينَ وَالْأَقْرَبُونَ وَالْيَاهِمِيٰ وَالْمَسْكِينِ وَإِبْرِيزِ السَّيِّئِلِ
وَمَا تَعْلَوُ امْنٌ خَيْرٌ فَإِنَّ اللَّهَ يَهُ عَلِيمٌ﴾** (٢/ البقرة: ٢١٥)

”اے پیغمبر علیہ السلام ان سے کہہ دو کہ تم جو خرج کرو، وہ اپنے مال باپ اور عزیزوں اور قبیلوں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ اس سے آگاہ ہے۔“

﴿وَأَتَ ذَا الْقُرْبَىٰ حَكْمَةً وَالْمَسْكِينَ وَإِبْرِيزِ السَّيِّئِلِ وَلَا تَبْدِرْ تَبَذِّيْرًا﴾ (١٧/ بنی اسرائیل: ٢٦)
”او رشتہ دار کا حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور رسول خرچی نہ کر۔“

عام طور سے اکثر مدد ہوں نے سب سے زیادہ اہمیت مال باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ یہوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتہوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تو رات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

”تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے،
دراز ہو۔“ (خرون ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

”تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔“ (احمار ۱۹-۳)

انہایہ ہے کہ تو رات نے قانون نامی حکم نافذ کیا کہ

”اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مارڈا لاجائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی
ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔“ (احمار ۶-۹)

”اوروہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مارڈا لاجائے گا۔“ (خرون ۲۱-۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں میں انہی احکام کو دہرا لیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعلیم نہ کی جائے، بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

”کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجوہ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔“

نبوتِ محمدی علیہ السلام جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے تو رات و انہیں کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا شفیعی بخش جواب دیا۔

① اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حشیثت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو پہنچی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل وہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی

● اسکے علاوہ انہیں کے دوسرے ابواب اور صحیحوں میں تو رات کے لفاظ کا بعضیہ اعادہ ہے مثلاً: متی ۱۹-۱۹، مرقس ۱۵-۱۵، ۱۹-۱۹، لوقا

سب سے بڑی دلیل ہے:

﴿وَصَّيَّنَا إِلَيْنَا نَبِيًّا إِلَيْهِ حَمَلَتُهُ أُمَّةٌ وَهُنَّ عَلَىٰ وَهُنَّ وَفَصِلُهُ فِي عَامِينَ﴾

(۱۴/ لقمان)

”اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس کو تحکم تحکم کرائے پیش میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔“

﴿وَصَّيَّنَا إِلَيْنَا نَبِيًّا إِلَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتُهُ أُمَّةٌ كُرْهًا وَضَعْتُهُ كُرْهًا وَحَمَلَهُ وَفَصِلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ (۱۵/ الاحقاف)

”اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیش میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیش میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ پوچھا، پھر کون؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ اس نے عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا: ”تیری باپ۔“ * ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو فردا دیا اور فرمایا: ”تمہارے خدالے ماں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔“ * ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا: ”کیا تیری ماں زندہ ہے؟“ جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا: ”حال ہے؟“ گزارش کی، ہے، فرمایا: ”تو اس پر نیکی کر۔“ * یہی اس کی توبہ تائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا: ”کیا تمہاری ماں ہے؟“ جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا: ”تم اسی کے ساتھ چھٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔“ *

ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنس لطف کی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کامنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی ماڈی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت قاعده ذات کے بعد مان

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبة: ۵۹۷۱۔ ** صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدين من الكبار: ۵۹۷۵۔ *** جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب في بر الحالة: سنن النسائي، کتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدة: ۳۱۰۶؛ ابن ماجہ، ابواب الجهاد، باب الرجل يغزو وله أبوان: ۲۷۸۱؛ ترغیب و ترهیب منذری، ج ۲، ص: ۱۲۴۔

اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے، جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور جتنی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جتنے کی ناقابل برداشت تکلیف کو بُنی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پیدا منصف گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلا پلا اور اس کی پرورش اور غور پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر ایمان ترک اور اپنی ہر خوشی ثنا کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا تھانج ہے؟ اس لیے شریعت محمدی ﷺ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اس کی سزاوار ہے۔

② ماں کے ساتھ جو دوسرا ہستی پچ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شکنیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں، اس لیے جب پچان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے، تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ”عزت“ کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت، ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی ولدی، ہر چیز پر فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے بھکرے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا چہارہ ہے، بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیک اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر تعلیم، توجیہ اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علتِ فاعلی اور دوسرا علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:

﴿وَإِذَا أَخَذُنَا مِنَ النَّاسِ إِيمَانَهُ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا إِلَّا لَدَنَا إِحْسَانًا﴾

(۸۳: البقرة)

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوچھو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو“

یہ آیت پاک گواں حکم کا اعادہ ہے جو تورات کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں تورات کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ”نیکی کرنے“ کا وسیع معنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزم کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔ اسی صورت میں دوسرا جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نیخت ہے:

﴿فَلْمَا آنَفَقُتُمُّ مِمْنُ خَيْرٍ فَلِلَّٰهِ الْدِيْنُ وَالْأَكْفَارُ بَيْنُ﴾ (۲۱۵: البقرة)

”فَأَمَدَهُ كَيْ جو چیز نم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور شستہ داروں (وغیرہ) کے لئے۔“

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (٤٠/ النساء: ٣٦)

”اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔“

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلال و حرام کی ہزاروں رسمیں اور خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم تباہیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا:

﴿فُلْ تَعَالَوْا أَثْلَى مَا حَرَمَ رَبُّكُمْ عَلَيْنَمَا لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

(٦/ الانعام: ١٥١)

”کہہ (اے پیغمبر ﷺ!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔“

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعاۓ خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ الْأَنْتَهِيَةَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَلْفَقَ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كَلِمَهَا فَلَا تَقْلِلْ لَهُمَا أَفْ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاحْفَضْ لَهُمَا جَنَاحَ الدُّلُّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّنِي صَفِيرًا﴾

(١٧/ بنی اسرائیل: ٢٣-٢٤)

”اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یادوں توں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کو اف بھی نہ کرو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو۔ اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاوا اور کہو کہ اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرماجس طرح انہوں نے چپن میں مجھے پالا۔“

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائیٰ اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے باتھ اخہنارا و انہیں، بجز اس کے کہاگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

وَوَصَّيْنَا إِلَيْكُمْ بِوَالدِّيَةِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَكُمْ لِتُشْرِكُوا بِنِي مَا لَيْسَ لِكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلَا

نُطْعِمُهُمَا إِلَيْكُمْ فَإِنِّي أَنْهِمُ مِمَّا لَنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥﴾ (٢٩ / العنكبوت: ٨)

”اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ یہ نیکی کرو اور اگر وہ تجوہ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجوہ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تھہارے کرتوں سے آ گاہ کروں گا۔“

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تھہارے بت پرست مال باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں ہیں اپنی جگہ پر قائم رہے فرمایا:

وَوَصَّبْنَا إِلَيْكُمْ بِوَالدِّيَةِ حَمَلَتْهُ أُمَّةٌ وَهُنَّا عَلَىٰ وَهُنَّا فِي عَامِيْنَ أَنِ اشْكُرُنِي

وَلَوَالدِّيَكَ إِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٦﴾ إِنْ جَاهَدَكُمْ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكُوا بِنِي مَا لَيْسَ لِكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلَا

نُطْعِمُهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴿٧﴾ (٣١ / لقمان: ١٤ - ١٥)

”اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ یہ نیکی کرو اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دوسال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آتا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجوہ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر۔“

اس انتہام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے، راس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جانا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں ان کا ادب، ان کی اطاعت، ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت مہاجر ابی یم علیہ السلام کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا گر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی دعائے مراد یہ ہو گی کہ وہ ایمان لا کر حسن خاتمه پر مرجے:

﴿رَبَّنَا أَغْفِرْ لِنِي وَلَوَالدَّيَ﴾ (٤١ / ابراهیم: ١٤)

”اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخشن دے۔“

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی سبھی دعا کی:

﴿رَبَّ اغْفِرْ لِي وَلَوَالدَّيَ﴾ (٢٨ / نوح: ٧١)

”میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخشن دے۔“

اس لیے والدین کے حسن خاتمه اور مغفرت کی دعاء مانگنا انبیا علیهم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجالاتے ہیں اور ان کے لیے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدله میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ يَوْمَ الْرِّيْهُ أَحْسَانَ أَطْهَرَهُ مَحْمَلَةً أُمَّةٌ كُرْهَا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلَهُ وَفَصَلَهُ
ثُلُّونَ شَهْرًا طَحَّى إِذَا بَلَغَ أَشْدَدَهُ وَلَمَّا زَوْجَيْنَ سَنَةً لَا قَالَ رَبٌّ أُوْزَعْنِي أَنْ أَشْكُرْ بِعَمَلَكَ
الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالدَّيْرِ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضِيهِ وَأَصْلِحُ فِي فِي دُرْبِيَّتِيْنَ إِنِّي
تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ تَسْقَبَ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَتَنْجَوْزُ
عَنْ سَيَّأَتِهِمْ فِي أَصْلَحِ الْجَنَّاتِ وَعَدَ الْعَصْدُقِي الَّرَّبِّيْنِ كَانُوا يُوعَدُونَ﴾

(الاحقاف: ٤٦-٤٧)

”اور ہم نے انسان کوتا کید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ یہی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تمیں مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پر دگار! مجھ کو تو نیش دے کے تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد بیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اپنے کام ہم قبول اور ان کے برے کاموں سے درگز رکرتے ہیں، یہ جنت والوں میں ہوں گے، یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔“

ان آئیوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی مشارعِ الہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ ”ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔“ * کبھی ارشاد ہوا: ”رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔“ ** کسی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ نے میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ سُخّن کون ہے؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ”تیری ماں۔“ گزارش کی، پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا: ”تیرا باپ اور اس کے

¹ نسائي، كتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدة: ٣١٠، مستند امام أحمد، ج ٣، ص: ٤٢٩۔

² جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل في رضا الوالدين: ١٨٩٩۔

بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔ * ایک دفعہ حضور انور علیہ السلام مجلس قدس میں تشریف فرماتھے، جان نثار حاضر تھے فرمایا: ”وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا۔“ صحابہ نے پوچھا، کون؟ یا رسول اللہ علیہ السلام! ارشاد ہوا: ”وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھا پے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل کر لی۔“ * ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کوئی سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا: ”وقت پر نماز پڑھنا۔“ عرض کی، پھر کون سا؟ ارشاد ہوا: ”ماں باپ کے ساتھ یتکی کرنا۔“ دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ”خدا کی راہ میں محنت اٹھانا۔“ (جہاد) *

ایک دفعہ آپ علیہ السلام نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ ”تین مسافر راہ میں چل رہے تھے، اتنے میں موسلا دھار پانی برستے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضاڑا ایک چٹان اور پرستے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انہوں نے پورے خصوص و خشوع کے ساتھ دربارِ اللہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص یتکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے، ایک نے کہا، باراں تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چڑھاتا تھا اور انہی پران کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا تو دودھ دو دو کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چڑھانے کو درنکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سوچکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سر پانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آ جاتا اور نہ ہتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچہ ہوک سے بلکہ رہے تھے مگر مجھے گواران تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سر ہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خونخواری کے لیے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے مند سے ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخوبی جبکش ہوئی اور غار کے مند سے ٹھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو سیلہ بنانے کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔“ *

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سرھنی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر

* جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۷۔

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم من ادرک ابویه او احدهما عند الكبر: ۶۵۱۱، ۶۵۱۰: ۶۵۱۱۔

* جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۸۔

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اجابة دعاء من بر لوالدیه: ۵۹۷۴۔

وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم دجان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا، اسی لیے انہی اور پرگزرن چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمت اقدس میں شرکت چہار کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا: ”تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔“ عرض کی، جی ماں، ارشاد ہوا: ”تو پھر انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو۔“ *

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درج رکھا گیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ”تم پر خدا نے ماوں کی نافرمانی حرام کی ہے۔“ ^۲ ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ ”کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟“ انہوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ علیہ السلام افرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تک لگائے بیٹھے تھے سید ہے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے: ”او رجھوئی گواہی۔“ ^۳

تورات میں حقوق والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے۔ وحی محمدی علی یا نہیں
بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً: تورات کا یہ حکم
تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے
بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو
اپنے فعل پر نظر ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلات سے فائدہ ناٹھایا تو پھر عذاب بھی
ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی
اولاد کے قتل کا مرتكب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہو گا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہو گا،
کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضای بھی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے
اتفاقی سمجھا جائے، تاکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔ اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف
اشارة کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کوہ اہمیت دے کر دوسری طرف یہوی کے سامنے ان کو بالکل

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لا یجاهد الاباذن الابوین: ۵۹۷۲۔ ۲ صصحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوف الوالدین من الکبار: ۵۹۷۵۔ ۳ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوف الوالدین من الکبار: ۵۹۷۶۔ ۴ تمام واقعات اور اقوال عامہ کتب حدیث میں مذکور ہیں تھوڑیت کے ساتھ دیکھو، بخاری، کتاب الادب، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، جامع ترمذی کتاب البر والصلة۔ مشکوکہ باب مذکور۔ ۵ فقہاء اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریع کے تعلق مختلف ہیں، احناف اور شافعی کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک تبکیر کے نزدیک اگر وہ برخی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص کے درست نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی حر صورت میں قصاص ہے اور سنی قرآن کا نہ معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے دو فریشافت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قاصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا بھی کر قصاص کے بجائے اس بردیت لازم کی ہے الائی کہ دلائل و قرائی باب کے سوئے قسم کو ظاہر کرتے ہوں۔

بے قدر کردیا ہے، لکھا ہے:

”اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملار ہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔“ (پیدائش ۲۳-۲۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جو گو (انجیل) کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نآشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰: ۷-۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبور اترنجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو نوٹ کر جز سکتا ہے اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت مصلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔ ﴿

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی الرجل بسأله أبوه ان يطلق زوجته: ۱۱۸۹۔

اولاد کا حق

اصول تعلیم

جس طرح مال باب کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق مال باب پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے، جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باب پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو نہبہ لے کر تعریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریع کی جائے، یہ متن ان سب پر محیط ہے، فرمایا:

((لِسْ مِنَ الْمِرْحَمَ صَغِيرُونَ وَلَمْ يُوقَرْ كَبِيرُونَ)) ❶

”جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔“

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے، جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں، افراد، ماتخوں، آقاوں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزیوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزار دیگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے، کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں اور مقووں کے بنائے ہوئے نظام و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی ای معلیٰ ﷺ کے یہ دو منحصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانون کا بارگراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔ اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ نہیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مارڈا لئے کی جا بلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

❶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الصبيان: ۱۹۱۹۔

اولاد کاشی کا انسداد

عرب کے سفا کانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سگدی کا کام مخصوص بچوں کو مار دانا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو نہ ہی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود نجع کر کے ان پر چڑھادیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچکی قربانی کریں گے، یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی برت پرست قوموں میں جاری تھی، رومہ الکبری کے عظیم الشان متعدد قانون میں ”اولاد کو مارڈا لئے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کاشی کا علاویہ کثرت سے رواج تھا“، اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راجپتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی سنتی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جو ہر کی صورت میں راجح تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذر رانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے:

﴿وَكَذَلِكَ زَيْنَ لِكَثِيرٍ قِنَ الْمُشْرِكِينَ قُتْلَ أُولَادُهُمْ شُرَكَاءُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلَيَلِسُوا عَلَيْهِمْ دِيَنَهُمْ وَلَا يَشَاءُ اللَّهُ مَا فَعَلُوا فَذُرُّهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾ (۶/الانعام: ۱۳۸)

”جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگایا ہے، اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں، تاکہ یہ دیوتا ان کو (بیشہ کے لیے) بلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ اللہ پر افترا کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو جھوڑ دے۔“

اسی سلسلہ میں آگے چل کر اللہ فرماتا ہے:

﴿فَذُرْ خَسِرَ الَّذِينَ قُتْلُوا أُولَادُهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶/الانعام: ۱۴۱)

”لگائی میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا،“

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہو گی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہو گا، اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبک دوش ہوتے

سیرۃ ابن حنبل و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب یہ میں عبدالمطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ، نیز موطا امام مالک، کتاب النذور، باب مالا یجوز من النذور فی معصیة الله: ۱۰۳۰۔

لیگی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول، ص: ۲۲۰۔ کشف ریختی تفسیر آیت ذیل۔

تھے، نبوت محمدی ﷺ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسم ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ اللہ سی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَّابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (۱۱ / هود: ۶)

”اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض اللہ ہی پر ہے۔“

اس لیے جا بل عربوں کو تعلیم دی گئی:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا الْوَالَادَّ كُمْ خَشِيَّةً إِمْلَاقٍ طَّمْخُنْ نَرْزُقُهُمْ وَإِلَيْكُمْ إِنَّ قَاتِلَهُمْ كَانَ خَطَّالٌ كِبِيرًا﴾

(۱۷ / بنی اسرائیل: ۳۱)

”اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مارنے والا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی

دیتے ہیں، ان کا مارڈ النابے شہبہ بڑا گناہ ہے۔“

قل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتا دو کہ اصل چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

﴿فُلْ تَعَالَوَا أَنْلُ مَا حَرَمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَا شَرِّكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَنْقِتُوا﴾

﴿أَوْلَادَ كُمْ قِنْ إِمْلَاقٍ طَّمْخُنْ نَرْزُقُهُمْ وَإِلَيْهِمْ﴾ (۶ / الانعام: ۱۵۱)

”کہہ دے اے بغیر! آدمیں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مغلسی کے ذر سے اپنے بچوں کو نہ مارڈا، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔“

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ اس سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: ”شرک۔“ پوچھا، اس کے بعد، فرمایا: ”والدین کی نافرمانی۔“ پھر عرض کی، اس کے بعد، فرمایا یہ کہ ”تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مارڈا تو کہہ دے ساتھ کھائے گی۔“ یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پر توفیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق اللہ ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا اور عرب کی سرزی میں اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو گئی۔ اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو خخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی

* صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۰۲۰ و کتاب التفسیر: ۴۴۷۷، ۴۴۷۶۱ و کتاب الادب: ۶۰۰۱ و کتاب المحاربين: ۴۸۱۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الشرک اقبع الذنوب: ۲۵۷۔

لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کوڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہوا اور اللہ کوڑکیوں کا باب کہو تو شرم نہ آئے فرمایا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَهْدُ هُمْ يَمَا ضَرَبَ لِلَّهِ حِلْ مَثَلًا طَلاقٌ وَجَهَةٌ مُسْوَدًا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ ۱۷

(۱۷/ الزخرف: ۴۳)

”اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوش خبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کامنہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔“

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پرده خاک میں چھپا کر باب اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَهْدُ هُمْ بِالْأَنْتَيْ طَلاقٌ وَجَهَةٌ مُسْوَدًا وَهُوَ كَظِيمٌ يَوْمًا مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءَ مَا يُفْرِيْهُ طَأْيِسْكُهُ عَلَى هُوْنِ أَمْيَدْسَهُ فِي التُّرَابِ﴾ ۱۶ / النحل: ۵۸-۵۹

”اور جب ان میں سے کسی کوڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کامنہ کا لاپڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھوٹ پی کرہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کوئی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)۔“

یوں تو اس رسم بدکار رواج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا، *بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے، *یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجمام دی جاتی تھی اس کا حرستاک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

داری میں وضیں تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے، *کہ ایک شخص نے آ کر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، ہتوں کو پوچھتے تھے اور اولاد کو مارڈا لئے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلا تا تو دوڑ کر میرے پاس آئی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی، تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ اپا اپا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ رحمت کوئی نہیں ﷺ اس پر درد افسانہ کو سن کر آنسو پڑھتے۔

* مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران، ص: ۳۴۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی، ج ۱، ص: ۲۸۷ مطبعہ خیریہ مصر، زیر مثال اصل من مروءۃ۔

** ابن جریر، ابن کثیر و در مشور سیوطی بحوالہ سنن یہوی

و مسنند براز (مصنف عبد الرزاق ریز تفسیر سورہ تکویر)۔

*** سنن دار میں المقدمة، باب ما كان عليه الناس قبل مبعث النبي ﷺ من الجهل والفاللة: ۲، یہ روایت کو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لیے لائق کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخلی ہی ہمارے سامنے آجائے۔

نہ کر سکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو ملکیں کر دیا، فرمایا: ”اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔“ پھر ان صاحب سے فرمایا: ”ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ۔“ انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے رو تے رو تے ریش مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا: ”جاوہ کے جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔“ قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ فن کی ہیں۔ فرمایا: ”اے قیس! اہل لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو۔“ عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا: ”اے قیس! اہل لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو۔“ مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تجуб انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، ما میں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعراہی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی المؤذمن ظلم اُمّہ
”زندہ فن ہونے والے بچے نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور
عامرنے اٹھائی۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا: ”ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو۔“

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دونیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے داد صعده نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی، یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہو گا؟ فرمایا: ”ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ اللہ نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔“ اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو بشت نبوی سے پہلے دین ابراہیم کے پیر دتھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوش شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو۔ یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہو سیں، لیکن بشت محمدی ﷺ کی رحمت عام کی جب بھار آئی، تو ان شقاوتوں کے موسم پر بھیش کے لیے خزاں چھا گئی۔

تفسیر ابن جریر طبری بروایت فضادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزار و در مشور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکتب و بیهقی فی السنن زیر سورۃ اذا الشمس کورت۔ ۲ مؤطا امام مالک، کتاب النذور، باب النہی عن النذور فی معصیۃ اللہ: ۱۰۳۔ ۳ تفسیر در مشور بحوالہ طبرانی - تفسیر اذا الشمس کورت۔ ۴ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸۔

لوگ عموماً لاکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوت محمدی علیہ السلام نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا: ”جو کوئی ان لاکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں بہلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پرده بن کر حائل ہو جائے گی۔“ * نیز فرمایا: ”جو دولاکیوں کی بھی پروردش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں، تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دوالگیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہو گا۔“ * غور کیجئے کہ وہی حقیرتی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عبدالحمدی علیہ السلام میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انداد کے لیے آپ علیہ السلام نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں، ان سے تو بکی جو بیعت لی جائے، اس میں ایک دفعہ بھی ہو کر (وَلَا يَقْتُلُنَّ أُولَادَهُنَّ) (۶۰ / ممتحنة: ۱۲) کہ ”وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔“ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جو ق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انہوں نے اقرار کیا۔ * عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے اور دوسرا باتوں کے علاوہ اس کا بھی عبدالیا کر دیا کہ وہ قتل اولاد کی مرتكب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربار رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عبدالیا جاتا تھا، * بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام کے پیش نظر عرب کی جواب تدائی اصلاحیں تھیں، ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عبدالیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ”وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔“ *

حضرت عبادہ بن صامت علیہ السلام کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ”ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بد کاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عبدالیا کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ اللہ پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی

* صحيح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۵؛ صحيح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الاحسان الى البنات: ۶۶۹۳۔ * صحيح مسلم، ایضاً: ۶۶۹۵۔

* صحيح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الممتحنة: ۴۸۹۵؛ صحيح مسلم، کتاب الامارة، باب كيفية بيعة النساء: ۴۸۳۴۔

* صحيح بخاری، کتاب العبدین، باب موعظة الامام النساء يوم العيد: ۹۷۸، ۹۷۹۔

* ترمذی: ۱۵۹۷، نسائی: ۴۱۸۶، ابن ماجہ: ۲۸۷۵، ۲۸۷۴، مسنون امام احمد حدیث امیمة بنت رقیۃ، ج ۶، ص: ۳۵۷ و سلمی بنت قیس، ج ۶، ص: ۳۷۹۔

* تفسیر ابن کثیر، ج ۹، ص: ۴۴۳؛ بر حاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم۔

رہا تو اللہ کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے۔ ﴿ صحابہ سے فرمایا کہ ”اللہ نے تم پر ماوس کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔ ” ﴿ ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصری آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدیلوں اور ان تمام سفا کیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی جگہ کھڑے ہیں، غصب الہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دنائے غیب قاضی اپنی معدالت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے نہیں نہیں معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اسے نہیں معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں؟

﴿ وَإِذَا الْمُؤْمَنَةُ سُيْلَتٌ فَإِذَا ذَبَّتْ قُتِلَتٌ ۝﴾ (٩١/ التکویر: ٩-٨)

”یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔“

کس درجہ بلیغ اور موثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زماں آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہ بن شعیب کی تیمیں بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی، بچا بچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؑ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے بچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؑ کے سے کے بھائی حضرت جعفر طیار بن شعیبؓ کا دعوی کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے، کہ یہ میرے بچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زید بن شعیبؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور ایلہ کی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؑ کا دعوی ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ اس دل خوشک منظر کو دیکھتے ہیں، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ ”خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔“ ﴿

کیا یہ وہی جنس نہ تھی کہ جس کی هستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہروں کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعۃ صارچا رگوں خالی ہو جاتے ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی، آنکھوں کی مٹھنڈ کا ذریعہ بنتی ہے۔

﴿ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸، و کتاب مناقب الانصار: ۳۸۹۲، ۳۸۹۳؛ مسلم، کتاب الحدود: ۴۴۶۱، ۴۴۶۳ و مسند احمد، ج: ۵، ص: ۳۱۴؛ مستدرک حاکم، ج: ۲، ص: ۳۱۸۔ ۵۹۷۵ و کتاب فی الاستقرار: ۲۴۰۸؛ صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ، باب النہی عن کثرة المسائل: ۴۴۸۳۔ ۴۲۵۱۔ ﴾ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاۃ: ۴۲۵۱۔

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبُّنَا هُبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتَنَا قُرْبَةً أَعْيُنٍ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷۴)

”جنت ان کو بھی ملے گی جو.....) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی مھنڈک عنایت فرماء۔“

اور آخروہ زمانہ آیا کہ ایک بدوسی شاعر کو طنزہ اکھنا پڑا:

غدا الناس مذ قام النبي الجواريا۔

”یغیرہ کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔“

رضاعت و حضانت

ولاد کے جینے کا حق تسلیم کرنے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی مگر اپنی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھہ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، تھبا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریع فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلانے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کردی گئی ہے:

﴿وَالْوَالِدُتُ يُؤْضَعُنَ أَوْلَادُهُنَ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِهُنْ أَرَادُ أَنْ يُتَمَّمَ الرَّضَاعَةُ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رُزْقُهُنَّ وَكُسُوْلُهُنَ إِلَّا الْمَعْرُوفُ﴾ (۲/ البقرة: ۲۳۳)

”اور ماں میں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلانے میں، یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماں کا کھانا اور کپڑہ اسٹور کے مطابق واجب ہے۔“

اور شیر خوارگی کے دونوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے، جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا:

﴿وَأَتَهْمَمُ الَّتِي أَرْضَعْنَاهُمْ وَأَخْوَلْنَاهُمْ فِي الرَّضَاعَةِ﴾ (۴/ النساء: ۲۲)

”اور تمہاری وہ ماں میں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلا یا اور تمہاری دودھ شریک بھینیں۔“
دکھانا یہ ہے کہ ان نئھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نبی رشتہ

داریوں کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ مجھیں تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہوتا دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ درجہ پر ہے۔
تعلیم و تربیت

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحاںی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل و تشریع میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْتُنَا فَوْزًا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِنَّمُ نَازًا﴾ (التحریم: ٦٦)

”اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔“

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرایوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنادیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور عگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”بَارَ اللَّهُ إِنَّكُمْ كُوْنَاتُنَّا كُوْنَاتُنَّا فَرَّقْتُمُ أَعْيُنَ“ اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں آنکھوں کی محنڈک بنا، فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هُبْ لَنَا هُنَّ أَرْوَاحُنَا وَدُلُّتُنَا فَرَّقْتُمُ أَعْيُنَ﴾ (الفرقان: ٧٤)

”اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی محنڈک عنایت فرماد۔“

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے، ایک سورہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق پا جائتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں:

﴿وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرْتَنِي هُنَّ إِنِّي تُبُتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (الاحقاف: ٤٦)

”اور (اے اللہ)! میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بناء، میں اپنے گناہوں سے تیری طرف بازاً یا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارامہ بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی میں آیا، حضور ﷺ حضرت حسن بن ثابتؓ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا، کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا: ”جور حم نہیں کرتا اس پر حم نہیں کیا جاتا۔“ * دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ * ان دونوں کا منشاء یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے کہ جو اپنے بچوں پر حم نہیں کرتا اللہ اس پر حم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمیں بھی تھیں، اس وقت کاشانہ نبوی ﷺ میں ایک بھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المؤمنینؓ نے وہی ایک بھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتنانے گوارانہ کیا کہ وہ بھجور آپ کھالے اور ان نہیں جانوں کو اس سدر مق سے محروم رکھے، اس نے اس بھجور کے دوآدھے نکڑے کر کے دونوں بچوں کو ایک ایک نکڑا دے دیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تجھب ہوا، آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: ”جب کسی کوڑا کیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھی ہی کر لے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔“ * نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص دوڑا کیوں کی پورا شکرے بیہاں تک کر دے عمر تمیز کو تینچھی جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہو گا کہ وہ اور میں (دواں) کیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔“ * اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”باپ کا اپنے بچوں کوئی ادب سکھانا ایک صاف صدقہ سے ہوتا ہے۔“ * ایک دفعہ یہ فرمایا: ”کوئی باپ اپنے بچوں کو اس سے بہتر کوئی عظیم نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔“ *

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اڑ کے کوڑا کی پر صرف جس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے،

* یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷ میں ہے، نیز دیکھو ابو داؤد، کتاب الادب، باب قبلة الرجل ولدته: ۵۲۱۸۔ * بخاری، ایضاً: ۵۹۹۸۔

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة باب فضل الاحسان الى البنات: ۶۶۹۳۔ * ایضاً: ۶۶۹۵۔

* ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في ادب الولد: ۱۹۵۱۔ * ایضاً: ۱۹۵۲۔

ارشاد ہوا کہ ”جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باتی رہنے دے اور اس کی بے تو قیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔“ * باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابری نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطا یہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت کی شہادت ہو، انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ ”تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟“ عرض کی نہیں، فرمایا: ”تو میں ایسے ظالمانہ عطا یہ پر گواہ نہ بنوں گا۔“ * اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائزیداد کا مالک بنے، یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کردی گئی اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

* سنن ابن داود، کتاب الادب، باب فضل من عالیاتامی: ۵۱۴۶۔

* ابو داود، کتاب البيوع، باب فضل بعض ولدہ فی النحل: ۳۵۴۲۔

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن و شوکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوجوہ کی تسلیم روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر تنہ بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوق زوجین کی تشریع پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و سرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان میں بودھ، جیمن، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام ہیر و اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجدار و عورت سے بے تعقیب ہی کمال رو حانی کا ذریعہ تھا، ﴿اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تیکھیل جس تجدیں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا تعلق ازدواج میں ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہرن نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کا ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نسکی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطر رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تیکھیل کے لیے اس کوون سے فطری مواقف میں سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قابل روح ہے، اس تجدی زندگی میں کتنی یقینی ہے، مذہبی تجدی کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے لکب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا:

﴿وَأَنْكُحُوا الْأَيَامِيْ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءً يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ طَوَّالَهُ وَاسِمَّ عَلِيهِمُ﴾ (النور: ۳۲)

”اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا راند) اور اپنے غلاموں اور لوئڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ نجاش رکھنے والا اور علم والا ہے۔“

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ”اگر وہ غریب و تخلق دست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا۔“ یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید وسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرا کو فائدہ پہنچے

گا اور دنیاوی لحاظ سے دوستیوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہلی دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشت کار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکنے سے نکنے آدمی پر بھی بار بڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لیے جو بے کاری سے غریب ہے یہوی کے بوجھ سے مجبور ہو گا، کہ وہ کام نہیں سے پیدا کرے، خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کر دے گی، جس کے لیے وہ بغیر اس نشر کے بھی آمادہ نہ ہو سکتا، آخر میں فرمایا کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لیے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔ پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا: اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے، فرمایا:

﴿وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْهُمْ طَوْلًا أَنْ يَتَكَبَّرَ الْمُحَصَّنَيَّ الْمُؤْمِنَيَّ فَإِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيَّبَتْهُ الْمُؤْمِنَيَّ طَوْلَهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ طَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ﴾ (۴ / النساء: ۲۵)

”اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔“

آیت کا آخری مکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد یہوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہاں سے دو شبے پیش آتے ہیں کہ یہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا: کتنے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور اللہ کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شہری تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم مرتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا: یہ تغیریں بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بني آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔ یہاں تمام بیان اس لیے محوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وہ سوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ شخصی مسrt کی تکمیل میں کسی رفیقة حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اتزوج النساء فهن رغب عن سنتي فليس مني)) *

”میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔“

* صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح: ۶۳؛ مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح: ۵۰۶۳۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک بھم جس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن و شوکے باہمی اخلاص و محبت کو اللہ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿وَمِنْ أَلْيَهَا أَنْ حَكَقَ لَكُمْ مِنْ أَفْسِكُمْ أَرْوَاجًا تَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً﴾

﴿وَرَحْمَةً طَيْنَ في ذَلِكَ لَأَيْتَ لِقَوْمٍ يَتَغَرَّبُونَ﴾ (۲۰ / الرُّوم: ۲۱)

”اور اس (اللہ کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جس سے تمہاری یہویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون پاوا اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔“

قرآن پاک نے ایک لفظ ”سکون“ سے یہوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹنے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاش، دنیا کے حادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لیے میاں یہوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشنگواری ہوئی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے اللہ نے اس زناشویٰ کے تعلق کو اپنے عجیب و غریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر و محبت، سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یادوں میں سے ایک کا قصور ہے۔ میاں یہوی کی باہمی موافقت اور میل جوں کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت رہائی کی ہے، جو زن و شوکے باہمی میل جوں اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں، فرمایا:

﴿وَيَعْلَمُونَ مَا يَعْتَهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَكَفَدَ عَلَمُوا لَمَنِ اشْتَرَهُ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقِهِ﴾ (۱۰۲ / البقرة: ۲)

”تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی یہوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں..... اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔“

یہ باہمی میل جوں کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یہوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر یہوی کی دلجوئی کرے، زن و شوہرا ہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گوبابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے، کہ وہ عورت کی دلکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھاٹھاتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا:

﴿أَلْرِجَالُ قَوْمُونَ عَلَى النِّسَاءِ يَبْلَهُنَّ فَصَلَّ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَيَبْلَهُنَّ أَنْفَقُوا مِنْ

أَمُولَهُمْ فَالصِّلَاةُ قِنْتَ حِفْظُ الْغَيْبِ بِمَا حَفَظَ اللَّهُ ۝ (٤ / النساء: ٣٤)

”مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک یہ بیان فرماتا بدار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔“

آیت کے آخر حصہ کا یہ مطلب ہے کہ نیک یہ بیان شوہر کی غیر حاضری میں، اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو حفظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تودہ فعل خلاف فطرت ہے۔

مرد عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پرده پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلا غلت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک آشیبہ میں ادا کر دیا ہے:

هُنَّ لِيَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِيَاسٌ لَهُنَّ ۝ (٢ / البقرة: ١٨٧)

”عورتیں تمہاری پوشک ہیں اور تم ان کی پوشک ہو۔“

اس پوشک کے پرده میں جیسا کہ ابھی کہا گیا ہمیں یوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری یہی نکاح کے اغراض ہیں اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے:

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریع کی ہے، فرمایا:

لِيَكُلُّهَا النَّاسُ اتَّقْوَارِ بِكُلِّمَنْدِ الَّذِي خَلَقَنَّ مِنْ لَقَنِينَ وَاحِدَةٌ وَخَلَقَ مِنْهَا رُوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقْوَا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (٤ / النساء: ١١)

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنا لیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔“

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے نطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیوں میں انسانیت کے

پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ تیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو بھرچا ہے کہ ہم اپنے کار و بار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا، اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطہ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔ نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مردوں عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے: «مُحْصِنُونَ غَيْرُ مُسْفِعِينَ» (۵/المائدۃ:۵) ”پاک و امنی کے لیے، نہ شہوت رانی کے لیے۔“ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ”اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں پنجی اور شرم گا ہیں محفوظ رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کہ اس سے شہوت کا زور نہ تھا ہے۔“

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نہیاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو تھیس لگنے کا ذر ہو، باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہیے، اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا: (إِنَّ أَرَادُوا إِصْلَاحًا) (۲/ البقرۃ: ۲۲۸) ”اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں۔“ (وَإِنْ تُصْلِمُوا وَتُنَقَّلُوا) (۴/ النساء: ۱۲۹) ”اگر اصلاح کرو اور تقوی کرو۔“ کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدود کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

﴿الآتَيْقِيمَ حَدُودَ اللَّهِ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۲۹)

”یہ کہ میاں یوں دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔“

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی یوں یوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں، محسوس ہیں، مجبور ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عَرَضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَنْتَقُوا وَتُصْلِمُوا بَيْنَ النَّاسِ طَوَّافُ اللَّهِ سَبِيلٌ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۲۴)

”اور اللہ کو اپنی قسموں کا ہتھنڈا ان بناؤ، کہ سلوک نہ کرو اور تقوی اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔“

ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح: ۱۸۴۵

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شوکے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پر ہیز گاری کا برتابا (تفوی) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

﴿فَالضِّلْحُ قُيْثَتْ حَفْظَتْ لِلْغَيْبِ﴾ (٤ / النساء: ٣٤)

”تونک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھے پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔“

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار ہیں، ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”تفوی کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھتے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔“ *

زن و شوکے باہمی حقوق کی تشریع آنحضرت ﷺ نے جنت الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

”لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کوہ کھلی بے حیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں، تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ملکی مار مارو، تو اگر تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر اڑام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، میں تھہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں، جن کا آناتم کو پسند نہیں، اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔“ *

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آئکر دیافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ فرمایا: ”جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنئے تو اس کو پہنانے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کئے“

سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب افضل النساء: ١٨٥٧۔

سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق المرأة على الزوج: ١٨٥١۔

اور نگھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے۔^۱ دوسری طرف آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ ”اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔^۲ آپ ﷺ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔ ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((خیر کم خیر کم لاهله))

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔“

((خیار کم خیار کم لنساء هم))

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ہے۔“

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سناتوان کو جلوہ کر فرمایا:

((ولزوجك علیك حقاً))

”اوہ تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔“

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمان میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی صوروں پر ماری چیزیں جا سکتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو دنیا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ”هم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی ثمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے۔“^۳

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاق اقارب میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری

^۱ سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق المرأة على الزوج: ۱۸۵۰۔ ^۲ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج على المرأة: ۱۸۵۲۔ ^۳ ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل زواج النبي ﷺ: ۳۸۹۵؛ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حسن معاشرة النساء: ۱۹۷۷؛ دارمن: ۲۲۶۰۔ ^۴ ترمذی، ابواب الرضاع، بباب ما جاء في حق المرأة على زوجها: ۱۱۶۲۔ ^۵ صحيح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ۱۹۷۵۔ ^۶ صحيح بخاری، کتاب النکاح، باب موعدة الرجل ابنته لحال زوجها: ۵۱۹۱؛ وکتاب التفسیر، سورۃ التحریم: ۴۹۱۳۔

دی گئی، ارشاد ہوا:

﴿وَلَهُمْ مُثْلُ الذِّي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَاتٌ﴾ (۲۲۸: البقرة)

”اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے، جیسا مردوں کا عورتوں پر

اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔“

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیے ہے، تاکہ وہ عورتوں کی گمراہی اور تنہیہانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گواپی پنی گھر یا وعدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں پر کی آیت میاں یوں کے خانگی بھٹکوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں مانتے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوکیت کا مرتبہ دیا جائے، تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا

دی ہیں، فرمایا:

﴿أَكْرِجَانَ قَوْمَنَ عَلَى النِّسَاءِ يَهَا فَضَلَّ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَّلَيْمَآ أَنْعَفُوا مِنْ

أَمْوَالِهِمْ﴾ (۴: النساء: ۳۴)

”مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔“

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوکیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃ ملنا چاہیے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان و نفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو پنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشنگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتنی سے کام لے کر ان کی یہ نیز ہنگال دیں، آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر فصیحت فرمائی کہ ”عورتوں کے ساتھ یہی کا برتابہ کرو، کہ ان کی پیدائش ٹیڑھی پلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھی ہاپن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر

اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تم اس کو توڑا لو گے۔“ * آپ نے مردوں کو یوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا: ”اپنی یوں میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسرا اچھی بات بھی نکل آئے گی۔“ * یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے:

﴿وَاعْشُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهُهُمْ هُنَّ فَعَلَى أَنْ تَكْرُهُوْهُ شَيْئًا وَكَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (٤ / النساء: ١٩)

”اور یوں کے ساتھ معمول طریق سے گزارن کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔“

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دھصولوں میں بانٹ دیا ہے، خاتگی اور بیرونی، خاتگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندر بیرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بھی پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقة اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے، * اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو یوں کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچ کو دو دہ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بحالت سے اپنی یوں اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لा�علی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، لئے مک کے دن ابوسفیان کی یوں ہند آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ ﷺ ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لा�علی میں کچھ لے لوں، فرمایا: ”تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔“ *

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چندا یہ مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سامنکتی ہے، فرمایا: ”تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم

* صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاة بالنساء: ١٨٦؛ مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء: ٣٦٤٢۔ * مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء: ٣٦٤٥۔ * اس اختیار کی تقریب میں فہاری مختلف بیس تفصیلات کیلئے فرقہ کی کتابوں میں کتاب الفقہ دیکھنا چاہیے نیز رکھوبنیل الاولار شوکانی، ج ٦، ص: ٢٦٣ مصر۔

* صحیح بخاری، کتاب النکحات، باب اذالم يتفق الرجل: ٥٣٦۔

میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی..... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوا لہے، اس سے اس کی پوچھہ ہو گی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھہ ہوگی۔ (بخاری باب: «فُوْا أَنْفَسَكُمْ وَأَهْلِكُمْ») نبوت کے ان دو مجرمان فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کو مارنے کا اختیار دیا گیا ہے

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

«وَاللَّٰهُمَّ تَحَمَّلُونَ نُشُورَ هُنَّ فَعِظُوْقُنَّ وَاهْجُوْهُنَّ فِي الْبَضَاجِعِ وَاصْرِيْوُهُنَّ» فَإِنْ أَطْعَنُمْهُمْ فَلَا يَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَيِّلًا» (٤ / النساء: ٣٤)

”اور جن بیویوں کے ”نشور“ کا تم کوڈ رہوتا ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے عییندگی برتو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔“

لغت میں ”نشور“ کے معنی ”اٹھ جانے“ کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسراً ابن حجر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

وَمَعْنَى ذَالِكَ إِذَا رَأَيْتَ مِنْهُنَّ مَا تَخَافُونَ أَنْ يَنْشِزُنَ عَلَيْكُمْ مِنْ نَظَرِ الْمَالِ
يَبْغِي لَهُنَّ أَنْ يَنْظُرُنَ إِلَيْهِ وَيَدْخُلُنَ وَيَخْرُجُنَ وَاسْتَرْبَتُمْ بِمَا رَهَنُ.

”اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ”نشور“ کا ذرہ ہو، یعنی ادھر دیکھنا جہڑا ان کو دیکھنا نہیں چاہیے اور وہ آئیں اور انکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔“

عن محمد بن کعب القرظی اذارای الرجل تقصیر هافی حقہ فی مدخلها
ومخر جها قال يقول لها بلسانه قدر ایتك منك کذا وکذا فانتبهی.

”محمد بن کعب القرظی سے ہے کہ جب مرد کیسے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تھہ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تواب بازا آ جا۔“

فقد کتابوں میں ہے:

الناشرة هي المخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه.
”نشور والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے

۱۔ تفسیر طبری: ۵، ص: ۲۸۔ اصل متن تفسیر میں واستبریتم نظر چھپا ہے۔ ۲۔ ایضاً

۳۔ عالمگیری، نفقات، ج ۱، ص: ۵۴۵۔

سپردنہ ہونے دے۔“

غرض یہ کہ ناشرہ عورت وہ ہے جس میں بداخلی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشرہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغضہ رکھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوذ کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے:

﴿أَلْوَجَالُ قَوْمُونَ عَلَى الْيَسَارِ يَا فَاصْلَ اللَّهُ بَعْصُهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَّبَعْضًا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحُتُ قِنْتُ حِفْظُ لِلْغَيْبِ يَا حَفِظَ اللَّهُ وَالَّتِي تَحْكُمُ فُؤُنَ شُورَهُنْ فَعِظُوهُنْ وَاهْجِرُوهُنْ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنْ فَإِنْ أَطَعْنَمْ فَلَا تَبْغُوا عَنِيهِنْ سَيِّلًا﴾

(النساء: ۳۴)

”مرد عورتوں کے مگر ان ہیں (ایک) اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر براہی دی ہے، اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک یو یاں فرمابندردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھے پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت ॥ وَآبُوكِ) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوذ کا تم کوڈرہ تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہماں میں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔“

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک یو یاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمابندردار ہیں اور ان کے پیٹھے پیچھے ان کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں ”نشوز“ کا ذرہ ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو غلوت میں اس سے کنارہ کرو، یا اس سے بات کرنا چھوڑو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرہ امارو، اب بھی اگر کہماں لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے جیسا اور بہانہ مت ڈھونڈو۔ اب جب اوپر یہ بتایا جا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی مگرائی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا سکتا کہ نیک یو یاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمابندردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار، مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوذ کا ذرہ ہو تو یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوذ یہ ہے، کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں، یعنی شوہر کی فرمابندرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت و آبرو

• اس آیت کی تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

کی حفاظت، جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشرہ ہے اور اسکی ہی عورت کو تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

”شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت“ کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے، اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔“ اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

جنت الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں، ان میں نشور کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم میں ہے:

((فَاتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنْ كُمْ أَخْذَتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ إِنْ لَا يُوْطِنُنَّ

فرشکم أَحَدًا تَكْرُهُونَهُ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوهُنَّ صَرِيعًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ)) * *

”عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہ وہ تمہارے بس میں ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندا کیں، جس کوم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔“

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

((اَسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنْ هُنَّ عَوَانٌ لَّيْسَ تَمْلِكُونَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذَالِكَ الْاَنْ يَأْتِيُنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاهْجِرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ

وَاضْرِبُوهُنَّ صَرِيعًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَإِنْ اطْعَنُكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا)) * *

”عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں، تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں، تو اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔“

شوہر کے بستر کو روندا نے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہوا اور ”کھلی بے حیائی“ سے جدھرا اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی تو سعی کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدبازی اور مشتبہ چال چلن * سب کو فاحشہ مبینہ کی

* صحيح مسلم، كتاب الحجج، باب حججه النبي ﷺ: ٢٩٥٠۔ * سنن ابن ماجه، أبواب النكاح، باب حق المرأة على الزوج: ١٨٥١۔ * یہ بیش نظر ہے کہ یا خالی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالات میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے، اور نہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سانگ ساری یا تازیانہ ہے، جس کا اجر اقاضی کا فرض ہے۔

تفسیر میں داخل کیا ہے، (تفسیر سورہ نساء رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ ”ضرب غیر مبرح“ یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مساوک وغیرہ سے مارنا ہے۔ جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوتھیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ”اللہ کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارانہ کرو“، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دلیر کر آپ ﷺ نے فرمایا: ”آل محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کائی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔“

ایک صحابی نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے یغام کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ اپنا ڈنڈ اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا“۔ یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی باس پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آنکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میری بیوی بذباں ہے۔ فرمایا: ”طلاق دے دو“، عرض کی، اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا: ”تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہو گی تو قبول کہو گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارانہ کرو“۔ یک دوسرے موقع پر فرمایا: ”کوئی اپنی بیوی کو علام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو“۔

١ تفسیر طبری، ج ۵، ص: ۴۱، مصر۔ ۲ ابو داود، کتاب النکاح، باب ضرب النساء: ۲۱۴۶؛ ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب ضرب النساء: ۱۹۸۵؛ سنن الکبری للنسانی، کتاب عشرة النساء: ۹۱۲۲۔

٣ صحیح مسلم، باب المطلقة البان: ۳۷۱۲۔

٤ ابو داود، کتاب الطهارة، باب فی الاستئثار: ۱۴۲۔

٥ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکره من ضرب النساء: ۵۲۰۴؛ مسلم: ۷۱۹۱۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شوکے بعد درجہ بد رجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ”صلۃ رحم“ ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلة رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ حجی محمد ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم پارہ آیتوں میں اس کی صرتع تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿فَالْيَتِيْذَا الْقُرْبَىْ حَقَّهُمْ﴾ (۳۰/الروم)

”تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔“

﴿وَالْيَتِيْذَا الْقُرْبَىْ حَقَّهُمْ﴾ (۲۷/بنی اسراء یہل)

”اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔“

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ ماں و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ کی مرضی کے لیے تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿وَأَتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُجَّتِهِ ذَوِي الْقُرْبَىِ﴾ (۲/البقرة)

”اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے) اور ماں کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔“

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے ستحن ہیں، فرمایا:

﴿فُلُّ مَا أَنْفَقُتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلَلَوْلَا الدِّينُ وَالْأُقْرَبُونَ﴾ (۲۱۵/البقرة)

”فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے،“

ماں باپ کے بعد درجہ بد رجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام

میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىِ﴾ (۸۳/البقرة)

”(اور ہمیں اسرا میں سے عہد لیا گیا کہ اللہ ہی کو پوچھنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا۔“

سورہ غل میں اہل قرابت کی امداد و عدل اور احسان کے بعد اپنا تمثیر اخصل حکم بتایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَائِي ذِي الْقُرْبَىِ﴾ (۹۰/النحل)

”بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔“

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین ستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا:

﴿فُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الْدِينُ وَالْأَكْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينَ﴾

(۲۱۵/ البقرة)

”کہہ دے اے بیغیر (صلی اللہ علیہ وسلم) ! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں، تینیوں اور غریبوں کے لیے۔“

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبائیں کروہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا:

﴿وَلَا يَأْكُلُ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةُ آنِ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَى وَالْمَسْكِينَ﴾

(۲۲/ النور)

”اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشاش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھائیں۔“

اللہ کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تمیری چیز اہل قرابت کے ساتھیکی ہے، فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَلَا إِلَهَ إِلَّا إِلَهُنَا وَلَا يَدْرِي الْقُرْبَى﴾ (۴/ النساء: ۳۶)

”اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھیکی کرنا۔“

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ دائیٰ اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محتنوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں، کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا:

﴿فُلْ لَا أَسْلَكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمُوَدَّةُ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۲۳)

”کہہ اے بیغیر (صلی اللہ علیہ وسلم) ! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔“

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو دصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاشنا) کہتے ہیں، کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و نامنث کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہمدری، کہیں ہمسایگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم طبقی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں

ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندھ کر توثیق جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطئن، رحم مادر ہے، یہ رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کردیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وہی محمدی نے "فاسق" کا خطاب دیا ہے اور ان کو صلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے:

﴿وَمَا يُبْلِلُ يَهٗ إِلَّا الْفَسِيقُونَ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيَاهِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمْرَاهُ اللّٰهُ يٰهٗ آن يُؤْكَلَ﴾ (٢٦-٢٧ البقرة)

"اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے، جو حکم نہیں مانتے جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور اللہ نے جسکے جوڑنے کو کہا، اس کو مانتے ہیں۔"

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشرع استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحم (اللہ) سے مشتق ہے، اس لیے محبت والے اللہ نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجوہ کو ملایا، اس کو میں نے ملایا، جس نے تجوہ کو کاتا اس کو میں نے کاتا۔" ۱۲۳ اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت ﷺ نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الہی کو پہنچ کر کہتا ہے: جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے۔" ۱۲۴ ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسنِ تعییر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ "جب اللہ نے تلاوتات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے اللہ کا دامن (اصل میں حقوق ہے) تھام لیا، اللہ نے فرمایا: بُشِّرْ جا یہ اس کا سکن ہو گا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجوہ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاوں، جو تجوہ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں۔" ۱۲۵ یعنی رحم مادر اور اس رحم کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

رحم اور رحم کے اس جزو کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے، سورہ نساء میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسْأَلُونَ يٰهٗ وَالْأَرْحَامُ﴾ (١١ النساء)

۱۲۳ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله اللہ: ۵۹۸۹، ۵۹۸۸۔

۱۲۴ صحیح بخاری، ایضاً مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۵۱۹۔

۱۲۵ صحیح بخاری، کتاب الادب: ۵۹۸۷ و مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۵۱۸۔

”اور جس اللہ کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتؤں کا خیال رکھو۔“

اس آیت پاک کی تشریع ذیل کی حدیث سے سمجھئے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ امتحان کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا: ”اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو اور قربابت کا حق (صلدرحم) ادا کرو۔“ *

جبیر بن مطعم ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ”جو صلة رحم یعنی قربابت کا حق ادا کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“ ** (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکار ہے گا، جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لے گا، یادہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

حضرت ابو ہریرہ ؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلة رحمی کرے۔“ *** اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلدرحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مندرجہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشاورگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریع مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے، بہت کچھ اس کے لیے اضحکال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاب صلدرحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، ان کی زندگی میں خانگی مسمرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے: ”صلة رحم سے قربابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔“ ****

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلة رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلدرحم کا جواب صلدرحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے، اس کے ساتھ صلة رحم کیا جائے، یعنی جو قربابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، ان کا حق ادا کیا جائے۔

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل صلة الرحم: ۵۹۸۲۔ ** صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ائم القاطع: ۵۹۸۴۔ *** صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من بسط له في الرزق لصلة الرحم: ۵۹۸۵، ۵۹۸۶۔

**** ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاه فی تعلیم النسب: ۱۹۷۹۔

**** صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالملکافی: ۵۹۹۱۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوی وہ دو آدمی ہیں، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور لجتے ہیں، انسانیت اور اس کے تحدیں کی بنیاد بہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلانے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تدرست ہواں کی تیناری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بننے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی جماعتی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گردہ میں بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجوہ دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اور دن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور رکھنے کا اندر یہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچ مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برا یکوں کا سد باب ہو کر یہ پڑوں دوزخ کے بجائے بہشت کا نہ ہونہ، ہوا ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسایگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوں اور ہمسایگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وہ محمدی علیلیتوں نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دور میں، ایک مدرسے کے دو طالب علم، ایک کارخانے کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسایگی ہے اور اس کا دوسرانام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہمسایوں میں قدم اس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم ندی ہی کا، یا کوئی اور دوسرے تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَالْحَكَمُ فِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَنْبُ وَالصَّاحِبِ بِالْعَنْبُ﴾ (٤ / السَّاء٢: ٣٦)

”(اور اللہ نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔“

اس "قریب، اور بیگانہ" کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ "قریب کے" معنی رشتہ دار عزیز اور "بیگانہ" کے معنی غیر ادراجمی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ "نزویک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور "دوز" سے مطلب دوسرے مذاہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ، ۱ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمد ﷺ کا منشاء یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی، جن کے ساتھ اس پڑوں اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم نہ بھی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہر حال حق کے ساتھ دوسرے تعلقات کو اکبرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا برآہ راست اشرا فریج فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے، کہ ایک خاص لذتیں انداز سے فرمایا: "اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا"۔ جان شاروں نے پوچھا: کون؟ یا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ جس کا پڑوی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں"۔ ۲ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "جو اللہ اور روز جزا ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوی کی عزت کرے"۔ ۳ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اللہ اور روز جزا اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوی کو یاد نہ دے"۔ ۴

ایک اور موقع پر اس کو تقربہ الہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا: "اللہ کے نزویک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوی کے لیے بہتر ہے"۔ ۵ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ "جریل علیہ السلام نے مجھے پڑوی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو راشت کا حق نہ دلادیں"۔ ۶ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تکھوں کا تبادلہ ہے، آنحضرت ﷺ خود اپنی یہویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! میرے دو پڑوی ہیں، تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا: "جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو"۔ ۷

۱ ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔ ۲ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب ائم من لا يأمن جاره بوانفه: ۶۰۱۶۔ ۳ صحيح بخاری، کتاب الادب: ۶۰۱۹۔ ۴ ایضاً: ۶۰۱۸۔

۵ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في حق الجوار: ۱۹۴۴۔ ۶ صحيح بخاری، کتاب الادب: ۶۰۱۴۔

۷ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب حق الجوار في قرب الآبواب: ۶۰۲۰۔

اس ہدایہ اور تخفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شور باہی ہوا وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ ”اے ابوذر! جب شور با پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔“ *

ان تخفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ”اے مسلمانوں کی بیویوں تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو تھیرنے سمجھے، اگرچہ بکری کی کھڑی ہی کیوں نہ ہو۔“ ** یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تھنکہ کو تھیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور سری بیوی اس معمولی تھنکہ کو دیکھ کر اس کی خفارت کرے۔ ایک مسلمان کی مردوں اور شرافت کا یہ اقتضان ہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوی کے رنج و تکلیف کی پرواہ کرے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”مُؤْمِنٌ وَّهُنَّ بِهِ جُنُودٍ سِير ہوا اور اس کا پڑوی اس کے پہلو میں بھوکار ہے۔“ ***

ہر ای امری ہے جہاں بھی ہوا اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درج عام گناہوں اور برائیوں سے بدر جہاں زیادہ ہے، بد قسم انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا تنابر اے، بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے، مگر پڑوسن کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوسن کے شریف دروں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لیے تواریخ میں یہ حکم تھا: ”تو اپنے پڑوی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوی کے گھر کا لالج مت کر، تو اپنے پڑوی کی جور و اور اس کے غلام اور اس کی لوٹی اور اس کے بیتل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوی کی ہے لالج نہ کر۔“ (خروج: ۲۰-۲۷)

”تو اپنے پڑوی سے، دعا بازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔“ (احمار: ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر ﷺ کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی، جن میں تواریخ کی طرح صرف ممانعت پر مبنی نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گناہ زیادہ برداشت کر کے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

”زنا حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوصیلة بالجار: ۶۶۸۸۔

** صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لاتحرقون جارة لجارتها: ۶۰۱۷۔

*** ادب المفرد امام بخاری، باب لا يسبع دون جاره: ۱۱۲؛ مسند بزار: ۱۱۹۔

میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوی کے گھر سے کچھ چاہے۔ *

دو صحابی تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑویوں کو ستائی تھیں، لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا: ”ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔“ پھر صحابہ علیہ السلام نے دوسری بی بی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور عمومی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستائی نہ تھیں، فرمایا: یہ بی بی خستی ہوگی۔ *

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا: ”تو اپنے پڑوی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔“ (مرقس ۳۰-۳۲)

آنحضرت علیہ السلام نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قاعبت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطہ طاہر فرمایا، ارشاد ہے: ”تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے۔“ *

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا: ”جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوی کا حق ادا کرے۔“ * اسی لیے فرمایا: ”قیامت کے دن بارگاہِ الہی میں سب سے پہلے وہ دوسری اور مدعا عالیہ پہنچ ہوں گے، جو پڑوی ہوں گے۔“ * انسان کی خوش خلقی اور بد خلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ علیہ السلام ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا براؤ؟ فرمایا: ”جب اپنے پڑوی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو، تو سمجھو کو اچھا کر رہے ہو اور جب برائی کہتے سنو تو سمجھو کو برائی رہے ہو۔“ *

کوئی پڑوی اگر برائی کرے تو گھر جھوٹ کر دوسرا بہتر پڑوں تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بعد میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ علیہ السلام! یہ مرد پڑوی مجھے ستاتا ہے، فرمایا: ”جاوہ صبر کرو۔“ اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہ عرض کی، فرمایا: ”جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو۔“ (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انہوں نے حقیقت حال بتائی، سب نے ان کے پڑوی کو برائی بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں واپس لا لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا۔ *

۱۔ ادب المفرد امام بخاری، باب حق الجار، ۱۰۳۔ ۲۔ ادب المفرد امام بخاری، باب لا يؤذى جاره: ۱۱۹۔

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۱۲۱۔ ۴۔ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الشفعة والرحمة على الخلق؛ الفصل الثالث: ۴۹۹؛ شعب الایمان للبیهقی: ۱۵۳۔ ۵۔ مستند احمد بن حنبل، ج ۴، ص: ۱۵۱۔

۶۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الثناء الحسن: ۴۲۲۔ ۷۔ ادب المفرد بخاری، باب شکایۃ الجار: ۱۲۵، وابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ۵۱۵۳۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ گوشت کا بڑا ٹوٹھر لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی، امیر المؤمنین! گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درہم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی گلکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی:

﴿وَيَوْمَ يُعرَضُ الظَّرِينَ كُفَّارٌ وَعَلَى النَّارِ أَذْهَبُتُمْ طَيْبَتُكُمْ فِي حَيَاةِ الدُّنْيَا وَأَسْتَمْتَعُتُمْ بِهَا﴾ (۶۱ / الاحقاف: ۲۰)

”اور جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔“

غور کرو کہ گوشت کا وہ تو تھا بھی جس میں اپنے پڑوی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جسکے مواخذہ کا ان کوڈ رکھتا ہے۔ ہمایوں میں دوست و شمن اور مسلم و غیر مسلم کی تیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوں میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنा ہے کہ ”مجھے جریل ہمسایہ کے ساتھ نکلی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوی کے ترک کا حق دار بنا دیں گے۔“^۱

^۱ مؤطراً امام مالک، کتاب صفة النبی ﷺ، باب ماجاء فی اكل اللحم: ۱۷۴۲ -

^۲ ابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ۵۱۵۲ -

تیمیوں کے حقوق

وہ کسی بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محرم ہے، جماعت کے ہر کن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پیشخانے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لاکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیوہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو کہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔ عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بد منی کے سبب سے تیمیوں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراشت سے محرم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراشت نہیں دیا کرتے تھے، اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں ان کی اس بدلسوکی کا ذکر بار بار ہے:

﴿أَرْءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِاللَّدِينِ ۖ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتَيمَ﴾

(۱۰۷ / الماعون: ۲-۱)

”کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔“

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو تیمیوں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراشت کو جلد جلد کا کھضم کر جانا چاہتے ہیں:

﴿كَلَّا بَلَ لَا تَمُكِّنُونَ الْيَتَيْمَةَ ۚ وَلَا يَحْضُرُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْوَسِيلَتِينَ ۗ وَكَلَّا كُنُونَ الْرَّثَاثَ أَكْلًا لَمَّا ۗ وَكَلَّا يُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَيَّا ۗ﴾ (۸۹ / الفجر: ۲۰-۱۷)

”نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آ مادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کے ریختے ہو۔“

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، تورات میں عشر اور زکوہ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دوایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں ”وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔“ (استخنا ۱۳-۲۹ و ۲۶-۲۷) انہیں نے ان بیچاروں کی کوئی دادری نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب تک کا یتیم دین کا مل کی شریعت لیکر دنیا میں آیا، وہی الہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

❶ تفسیر ابن جریر طبری، سورہ نساء، ج ۴، ص: ۱۷۰۔

﴿الَّمَنِيدُكَ يَتَّهِمَا فَأَلَوِي فَإِمَّا الْيَتَيمُ فَلَا تَقْهِرُهُ﴾ (٩٣ / الصحنی: ٦ ب)

”کیا جھوک کو اللہ نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی تو یتیم کونہ دبا۔“

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمه میں بے بی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتوں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رکیموں کو اس بے کس گروہ پر حرم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ کمی آتیوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دوستندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھانی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھانی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ فلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

﴿أَوْ أَطْعُمُ فِي يَوْمٍ ذُي مَسْكَبَةٍ لِّيَتَّهِمَا ذَا مَقْرَبَةٌ﴾ (٩٠ / البلد: ١٤-١٥)

”یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔“

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُجَّهٖ مُسْكِنَاتٍ وَيَتَّهِمَا﴾ (٧٦ / الدھر: ٨)

”اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔“

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورہ نساء میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وارثت کا حق دلایا گیا اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بد دیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا:

﴿وَأَنُوا الْيَتَمَّى أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَنْبَدِلُوا الْحَيْثُ بِإِلَصْقَبِ سَوْلَاتٌ كَلُّوا أَمْوَالَهُمْ إِلَى آمْوَالِكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ حُوَّيَا كَبِيرًا﴾ (٤ / النساء: ٢)

”اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال

سے بدلانہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔“

دوستند یتیم لڑکیوں کو ان کی جاندار پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور

بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا:

﴿وَإِنْ خَفْتُمُ الْأَنْقُسْطُوا فِي الْيَتَمَّى فَأَذْكُرُوْمَا طَابَ لَكُمْ مِنَ التِّسَاءَ﴾ (٤ / النساء: ٣)

”اگر تم کوڈ رہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کرلو۔“

یتیم بچوں کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے اور نہ جب تک ان کو پورا

شور آئے، وہ ان کے سپرد کیا جائے، بلکہ ان کے سین رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ

امانت ان کو واپس کی جائے، فرمایا:

﴿وَلَا تُؤْنِوا السَّفَهَاءَ أَمْوَالَ الْكُمَّ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيمًا وَأَرْزُقُوهُمْ فِيهَا وَآتُوهُمْ وَقْدَرُوا لَهُمْ قُوَّلًا مَعْرُوفًا وَابْتَلُوا إِلَيْهِ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا إِلَيْكُمْ فَإِنْ أَنْسَمْتُمْ فِيهِمْ رُشْدًا فَادْعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ﴾ (٤ / النساء: ٦٥)

”اور بے قوفوں کو اپنے مال جس کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور تیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔“

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو نامجھ تیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے، کتم اپنا مال ان کو نہ دو، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو تیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت تیموں کی طرف کی گئی کہ ”تم ان کا مال ان کو واپس کر دو“۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تکتاک چن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں، متولیوں کو جو تیموں کے مال کو اس ذر سے جلد جلد خرچ کر کے برادر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں، اس بد دیانتی پر تنہیہ فرمائی گئی:

﴿وَلَا تَأْكُلُوهَا إِنْ رَأَقَا قَبِدَارًا أَنْ يَكْبُرُوا ط﴾ (٤ / النساء: ٦٦)

”اور اڑاکر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے ہو جائیں۔“

صاحب جائداتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں، تو ان کے لیے ان تیموں کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافی اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

﴿وَمَنْ كَانَ غَيْرًا فَلَيَسْتَعْفُفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلَيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ط﴾ (٤ / النساء: ٦٧)

”اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔“

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

﴿وَأَنْ تَقُومُوا إِلَيْهِ بِالْقِسْطِ ط﴾ (٤ / النساء: ١٢٧)

”اور یہ کہ تیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔“

سورہ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پرواںی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَقْرِبُوا مَالَ الْيَتَّمِّ إِلَّا يَأْتِيَ هُنَّ أَحْسَنُ حَتَّى يَلْعَمَ أَشْدَدَهُ﴾ (الانعام: ١٥٢)

”اور بہتری کی غرض کے سواتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچر۔“

سورہ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائیداد کو تیموری کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پہنچنا چاہیے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ (سورہ اسراء)

یہ تو صاحب جائیداد تیموری کی نسبت تعلیم ہے، جو تیم غریب و مفلس ہوں، ان کی مناسب پروش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، ناء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پروش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، والیتمنی والمساکین خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریع میں بے والی و وارث امت کے سرپرست نے اپنی امت کے ان یک دلوں کو جو بے والی و وارث تیموری کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا: ”میں اور کسی تیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں یوں دو الگیوں کی طرح قریب ہوں گے۔“ ۱ یہ بھی فرمایا کہ ”جو کسی تیم بچ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلانے پلانے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو۔“ ۲ نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ”مسلمانوں کا سب سے اچھا گھروہ ہے جس میں کسی تیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہے اور سب سے بدتر گھروہ ہے، جس میں کسی تیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔“ ۳

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتوان تیموریوں کے لیے پھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک تیم خانہ بن گیا، ایک ایک تیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پروش اور کفالت کے لیے اپنے آنکھوں محبت کو پیش کرنے لگا، ۴ بدر کے تیموریوں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول فاطمہ تبول ﷺ اپنے

۱ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل من يعول بتیما: ٦٠٠٥ وصحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الی ٧٤٦٩۔

۲ ترغیب و ترهیب منذری، ج ۲، ص: ١٣٢، ١٣٣ بحوالہ ترمذی: ۱۹۱۷ (حدیث حسن صحیح)۔

۳ ایضاً، بحوالہ ابن ماجہ: ٣٦٧٩ و ادب المفرد، باب خیر بیت من يعول بتیما: ١٣٧۔

۴ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١۔

دعویٰ کو اٹھا لتی ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ہمایا پنے خاندانؓ اور انصارؓ وغیرہؓ کی تیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ہمایا صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی تیم پر کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ تیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور گرانی میں دیانت داری برتنے لگے، بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا شہوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک تیم نے ایک شخص پر ایک نگرانی کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہوا کہ اور آپ نے وہ نگرانی مدعاعلیٰ کو دلا دیا، وہ تیم اس پر روپڑا، آپ کو رحم آیا اور اس مدعاعلیٰ سے فرمایا کہ ”تم نیخستان اس کو دے دو، اللہ تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔“ وہ اس ایشارہ پر راضی نہ ہوا، ابوالددحداح صحابی حاضر تھے، انہوں نے اس شخص سے کہا، کیا تم اپنا یہ نگرانی میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمدگی ظاہر کی، انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نگرانی اپنی طرف سے اس تیم کو ہبہ کر دیا۔ آج دنیا کے شہر شہر میں تیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نہیں ملے گا، اسلام پہلے نہ ہبہ ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادری کی، عرب پہلی سرزی میں ہے، جہاں کسی تیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو حسوس کیا اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں، اور دنیا میں ایک نئے ادارے کی طرح ڈالی اور قانونی اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست تیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائیدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیانہ کا انتظام کریں، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میریا آرفس کو رٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

ابو داود، کتاب الخراج والفيء، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۷۔

مؤطا امام مالک، کتاب الزکوة باب زکوة اموال البیتني: ۵۸۷ وزکرة الحلی: ۵۸۴۔

مسند احمد، ج ۶، ص: ۲۶۹۔ تذكرة الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی، ج ۱، ص: ۴۲۔

ادب المفرد امام بخاری، باب فضل من يعول بیهیما: ۱۳۷۶۔ استیعاب ابن عبد البر تذكرة ابوالددحداح، ج ۲، ص: ۱۱۳۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ((السلطان ولی من لا ولی له)) ابو داود، کتاب النکاح، باب فی الولی: ۲۰۸۳: نقی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔

قاضیوں کو جو رشادی فریم تقریر کے وقت ملتے تھے۔ ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

❸ በዚህ የዕለታዊ ስራውን እና የሚከተሉት ሰነድ በመመርመጥ እንደሚሆን ይገልጻል፡፡

❹ የዕለታዊ ስራውን እና የሚከተሉት ሰነድ በመመርመጥ እንደሚሆን ይገልጻል፡፡

ପ୍ରକାଶକ ମେଳି

କାନ୍ତିମାଳାରେ ପରିଚାରକ ହେଲା ।

“うなづいておられましたか？ おはなさん、おはなさん。”

۱۰۷) چهارمین روش تحریر متن از زبان اصلی به زبان فارسی

جَلَّ عَزَّ مُرْسَىٰ وَكَبِيرًا

(((መ.)) የዕለታዊ ሪፖርት በኋላ እንደሆነ የሚያስተካክልበት ተችልበት ይህንን የሚከተሉት ትርጓሜዎች በመ.))

۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱

《藏文大藏经》(3A/1300:12)

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اور لوں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ پختشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و مواعظت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو صریح کیا یہ حکم دیا:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامِي مِنْكُمُ﴾ (٢٤ / النور) (٣٢)

”اپنے میں سے بے شوہروالی عورتوں کا نکاح کر دو۔“

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام دلوںے برائیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچھیں برس کی عمر میں چالیس برس کی ادھیزر بیوہ سے شادی کی اور پچھیں برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اشنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقار فتوح قبور توں سے نکاح کئے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہ، زینب ام المسائیں، ام سلمہ، جویریہ، ام حبیبہ، میونہ اور صفیہ بنتی علیہن السلام یہودہ تھیں، جن کی کفارالت کا ہمارا آپ نے اپنے دو ش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے بیویوں کے لیے اس کو تحسن اور منسون طریقہ خودا پنے عمل سے بھی بنادیا۔ یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بآسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

((السَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمُسْكِنِ كَالسَّاعِي فِي سَبِيلِ اللَّهِ. وَاحْسِبْهُ قَالَ:

كالقائم لا يفتر، وكالصائم لا يفطر))

”بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑھوپ کرنے والا ایسا ہے، جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں مگان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز
سے نہیں تھکلتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپناروزہ نہیں توڑتا۔“

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((الساعي على الارملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله وكالذى يصوم

النهار ويقوم الليل))

^١ مشكوة، كتاب الادب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، الفصل الاول: ٤٩٥١.

^٢ صحيح بخاري، كتاب الادب، باب الساعي على المسكين: ٦٠٠٧؛ صحيح مسلم، كتاب الزهد، باب فضل الاحسان الى الارملة: ٧٤٦٨.

”یوہ اور غریب کے لیے دوز دھوپ کرنے والا، اللہ کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے، جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔“

ان یہاں کی تکمیل کی خاطر جو اپنی گود میں نئے پچھے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان نئے پچوں کی پروردش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرا نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا: ”میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی یہوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی یہوی جو شوہر کے مرنے کے بعد یوہ ہو جائے لیکن اپنے نئے یتیم پچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کوروکے رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں، یا اسی مقصد کی ایک روایت ابو بعلی کی مند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک یوہ ہوں، جس کے چند نئے یتیم پچھے تھے۔“

١ سنابوداود، کتاب الادب، باب فی فضل من عالیاتی: ۵۱۴۹۔

٢ حاشیہ سنن ابی داود بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نور الدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بنانا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لیے انسانی جماعت کے ہر کن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مفرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پرواٹی نہ بر تے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

«وَقِيَّ أَمْوَالَهُمْ حَقٌّ لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُومٍ» (۱۹/ الذاريات)

”اور جن (مسلمانوں) کے والوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔“

«فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ» (۷۰/ المعارج)

”اور جن (مسلمانوں) کے والوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔“

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف ”بھیک منے“ کے لینا تھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر دوہر ضرورت مندرجہ ہو سکتا ہے، جو تم سے کسی مالی مدد کا خواست گارہ ہو، محروم کی تشریع میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہیں، جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی مصحف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا بھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا تھام ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہل لغت ^۱ اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک ^۲ سے ہوتی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد کوہا ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق ”حق“ کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق ”حق“ کا نہیں بلکہ ”مقررہ حق“ کا بیان ہے ”زکوہ“ مراد ہو، کیونکہ ”مقررہ حق“ کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں، بلکہ زکوہ ہی پر صادق آتا ہے، تبھی یہ لکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونوں طرح سے مد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

«وَأَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَىْ» (۹۳/ الضھی)

^۱ دیکھو لسان العرب لفظ محروم و حارف (اس مجموعہ کی تائید لسان العرب کے حوالہ بالا مقامات پر نہیں ملے گی)۔

^۲ تفسیر ابن جریر میں سورہ ذاریات ح ۲۶، معارج کی آیت مذکورہ ح ۲۹، جس ۲۹، سورہ قلم میں اصحاب الجنة کے قضے میں محرومون اور سورہ داتقین ح ۲۷، جس ۱۰۳ میں بل محرومون کے معنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

”اور تو سوال کرنے والے کو جھپڑ کا نہ کر۔“

یہاں ”سوال کرنے والے“ کے معنی اغذی کے قریب سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے بھی جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم و سعث کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو۔ ۱ یہاں تک کہ کوئی لکھرا تم سے صرف تمہارے لئے ہے کا سہارا چاہتا ہے، تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی بختنی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھراں کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔

مدکی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَنْ يَتَّقِعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ وَنَهَا، وَمَنْ يَتَّقِعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كَفْلٌ وَنَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْبِلًا﴾ (٤٥: النساء)

”جونیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہو گا اور جو بری بات کی

سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہداں ہے۔“

اگرچہ یہ آیت عبارت کے لفظ و نسبت کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے، یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتو رقبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قول کی جائے، تاہم الفاظ قفر آنی کی و سعث ہر نیک کام کی سفارش تک دستیح ہے اور اس میں یہ اصول بتاریا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدو جہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہو گا، ایسا ہی برے کام کی جدو جہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى الْبَيِّنَاتِ وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدُوانِ وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ شَرِيدُ الْعِقَابِ﴾ (٥: المائدۃ)

”اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں

میں ایک دوسرے کے مدگار نہ بنو اور ذر اللہ سے، بے شک اللہ سخت مزادیے والا ہے۔“

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآ ری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے، آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریع اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((من کان فی حاجة اخیه کان اللہ فی حاجة و من فرج عن مسلم کریمة فرج

۱ طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے وَأَمَّا مَنْ سَأَلَكَ مِنْ ذَنْبٍ حَاجَةً فَلَا تَنْهَى عَنْ حَاجَةٍ ج ۳۰، ص: ۲۸، از تشریی نے کشاف ج ۲ ص: ۶۱۶ میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔

الله عنه كربة من كربات يوم القيمة)) *
 ”جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے
 میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ قیامت کی مصیبوں میں
 سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔“

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

((والله في عون عبده ما كان العبد في عون أخيه)) *

”الله اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں
 رہتا ہے۔“

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مندا آتا تو آپ صحابہ سے
 فرماتے: ”تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔“ * ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ”اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس
 حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔“ * یہ بھی فرمایا کہ ”بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی
 صدقہ ہے۔“ * یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ”جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کاشراستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس
 کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔“ *

- * صحيح بخاري، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم ٢٤٤٢؛ صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ٦٥٧٨۔ * ترمذى، أبواب البر والصلة، باب ماجاء فى الستر على المسلمين: ١٩٣٠۔
- * صحيح بخاري، كتاب الأدب، باب تعاون المؤمنين: ٢٧ و باب قول الله: (ن يشفع شفاعة حسنة): ٦٠٢٨۔
- * أيضًا باب كل معروف صدقة: ٦٠٢٢۔ * ترمذى، كتاب البر والصلة، بباب ماجاء فى صنائع المعروف: ١٩٥٦۔ * ترمذى، كتاب البر والصلة، بباب ما جاء فى امامطة الأذى عن الطريق: ١٩٥٨۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مرضیوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبرگیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دلکشی بھال، خدمت، غم خواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں "عیادت" ہے۔ * ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں، یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنادیا ہے:

﴿وَلَا عَلَى الْمَرْيُضِ حَرَجٌ﴾ (۲۴/النور: ۶۱)

"اور نہ بیمار پر کوئی شکنگی ہے۔"

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَلِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرْيُضِ حَرَجٌ﴾ (۴۸/الفتح: ۱۷)

"نہ اندھے پر شکنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لگڑے پر اور نہ بیمار پر۔"

﴿لَيْسَ عَلَى الصُّعَافَاءِ وَلَا عَلَى الْعَرَضَى﴾ (۹/التوبہ: ۹۱)

"نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی بارز پوس ہے)۔"

بیماروں کے لیے ضم معاف ہے، ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى﴾ (یا تم بیمار ہو تو تم کرو) (۵/المائدۃ: ۶)

اسی طرح ان سے تجدیکی بھی نمازیں معاف ہیں ﴿عَلِمَ أَنَّ سَيْكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَى﴾ "اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے۔" (۷۳/المسدیل: ۲۰) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُفْرِضًا﴾ (تو تم میں جو بیمار ہو۔) (۲/البقرۃ: ۱۹۶) روزہ توڑنے کی اس

* عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پر ہی کے ہیں، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دلکشی کو جانا لیکن واقعیاً نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پر ہی کے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری غم خواری اور خدمت گزاری کی حالت میں صرف دلکشی کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو جان کے زمانہ میں تھا کہتا ہے:

ذهب الرقاد فما يحسن رقاد مما شجاك ونامت العواد

"تحقیق جو تم پہنچا اس سے نہیں جلی اگر تو معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سوچنے۔" تقدیم یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جا گئے رہ جیں، یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مابینی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سوچاتے ہیں۔ اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پر کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سوچانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گزاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پر تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دلکشی کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دلکشی کو جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو یہ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنادیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معادضہ بن جاتی ہے اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ *

آنحضرت ﷺ نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کیے ہیں، اس کی دعا میں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا: ”جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو بہلکارے گا اللہ اس کے غم کو بہلکارے گا۔“ * اور یہ بھی فرمایا کہ ”ایک مسلمان کے دوسرا مسلمان پر پانچ حق ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔“ * صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا، جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ * ارشاد ہوا کہ ”جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعائیں لگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الہی میں دعا کرتے ہیں۔“ * یہ بھی آیا ہے کہ ”جب کوئی کسی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ واپسی تک جنت کے میوے چھتا رہتا ہے۔“ * فرمایا کہ ”جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اور اس کو تسلی اور دلاسادے اور اس کو شفاضانے کے لیے اللہ سے دعا کرے۔“ * آنحضرت اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہیں، آپ ﷺ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔ * مذاقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں، * اور اسی سے علانے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔ * حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب زنجی ہوئے تو آپ نے ان

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المؤمن فيما يصبه: ٦٥٦٢؛ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرة للذنب: ٣٠٨٩۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فضل المعونة للمسلم: ٤٩٤٦۔

* صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز: ٣٠٩٨۔ * ٦ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عيادة المريض، بطریق مختلفه: ٦٥٥١۔ * ٧ سنن ابی داود، کتاب الجنائز: ٣١٠٤۔

* صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبي: ١٣٥٦۔ * ٩ ابو داود، کتاب الجنائز، باب العيادة: ٣٠٩٤۔ * ١٠ مجمع البخار علامہ طاہر فتنی لفظ عيادة، ج ٣، ص: ٦٩٥۔

کا خیمه مسجد میں نصب فرمایا، تاکہ بار بار ان کی عیادت کی جاسکے۔ ۱ رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں، ان کا خیمه بھی اسی مسجد میں رہتا تھا، تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پئی کریں۔ ۲ غزوہات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی یہیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو یہاروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پئی کرتی تھیں۔ ۳ آپ ﷺ نے اپنے بیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ”بھو کے کھلاو، قیدی کو چھڑاوا اور یہار کی عیادت کرو۔“ ۴

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و لکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا، کہ ”اے آدم کے بیٹے! میں یہار پڑا تو میری عیادت تو نہ کی، وہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے، میں تیری عیادت کیونکر کرتا؟ فرمائے گا: کیا تھے خبرتہ ہوئی کہ میرا بندہ یہار ہوا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔“ ۵ تعلیم کی یہ طرز ادا، یہار پری، یہاروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دل نشین تلقین ہے اور صابر و شاکر یہار کی کیسی ہمت افرائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سر ہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجنوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان یہاروں کی خدمت کر کے اللہ کا قرب پاتے ہیں۔

۱ سن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی العیادة مراراً: ۳۱۰۱۔

۲ سیرۃ ابن ہشام، غزوۃ بنی قریظۃ، ج ۲، ص: ۷۰، و ادب المفرد بخاری، باب کیف اصبحت: ۱۱۲۹ و اصحاب ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھئے۔

۳ صحيح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوۃ النساء: ۶۸۲۔ ۴ مسند احمد، ج ۴، ص: ۳۹۴۔

۵ صحيح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المريض: ۶۰۵۶۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتوان طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے، یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود پادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتاح افراد سے کان کی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے، ہندوؤں میں اچھوتوں میں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بني اسرائیل کی بھی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برنا تھا، بلکہ عربوں میں قابلی نظام ہونے کے سب سے ہر دن شخص جو کسی قبلہ سے وابستہ نہ تھا، وہ مظلوم ہر قبلہ کے آدمیوں کے ظلم و تم کا تختہ مشق تھا، کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ بھی تھے۔ اسلام زیر دستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معافہ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے، قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلاں جبشی، یاسر یمنی، عمر، صہیب رومی، ابو عکیہ، عامر بن فیہر اور سالم بن عائذ غلاموں میں اور بین، زینہ، نہدیہ، ام عیسیٰ اور سمیہ بنی قیثم لوطفیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زید بن حارثہ بن عائذ کے سو اجوآ نحضرت ﷺ کے سامنے میں پروش پار ہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الافت میں سخت سخت کریاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کالازمی جزو بنا لیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورہ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو ”گھٹائی“ بتایا گیا ہے، ان میں ایک **﴿فَلُكْ رَبِّكَة﴾**۔ گردن سے غلاموں کی رسی کھولنا بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پر خطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہ رض، حضرت ابو بکر رض اور دوسرا اہل ثبوت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ مدینہ آ کراس تحریک نے اور فروع پایا، **﴿تَحْرِيرُ رَبِّكَة﴾**۔ یعنی گردن کو آزاد کرنا۔ بہت سی فرقہ گزارشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترمیمات کا اعلان کیا گیا، صحابے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیم بن حزم بن عائذ رض نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھیں، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے ہیں، حضرت عائشہ رض نے صرف ایک قسم کے کفارہ

* صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الكافر اذا اسلم: ۳۲۶۔

میں چالیس غلام آزاد کیے ॥ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ॥ مُرِّک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں، ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا شُرِكَ لَوْلَا يَهُ شَيْئًا وَلَا الَّذِينَ إِحْسَانًا وَيَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمُسْكِنَى وَالْحَارِذِى الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبُ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَإِنِّي السَّيِّئُ وَمَا مَلَكْتُ أَيْمَانَكُمْ﴾

إِنَّ اللَّهَ لَأَيْمُونٌ مَنْ كَانَ فَعَلَّا لَأَغْوَرَأَلَّا

(٤ / النساء: ٣٦)

”اور اللہ کو پوجوار کسی کو اس کا سماجی نہ بنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور قبیلوں کے ساتھ اور عزیز پڑوی اور بے گانہ پڑوی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”کوئی آقا اپنے غلام کو عبد نہ کہے، بلکہ فتاویٰ میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ ”وہ اپنے آقاوں کو رب نہ کہیں، بلکہ مولیٰ کہیں۔“ ॥ اس طرح ان ذات کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ ”یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، پس جس کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، تو اس کو وہ کھلاو جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہننے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو، جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔“ ॥

حضور ﷺ کے اس حکم پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاوں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی، ॥ ان بے خانمان افراد کو ان کے آقاوں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ محدود (موالی) میں شمار ہو گا، ॥

۱ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الہجرة، ۶۰۷۳ - ۶۰۷۵ میں نقشہ میں نقل کی ہے۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراهی النطاول علی الرقیق: ۲۵۰۲۔

۳ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما ینهى من الساب: ۶۰۵۰۔

۴ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما ینهى من الساب: ۶۰۵۰۔

۵ حدیث میں ہے: ((انما الولاء لمن اعشق))، ”ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔“ مسلم، کتاب العتق، باب بیان ان الولاء: ۳۷۸۹ دوسری حدیث میں: ((او انتمی الى غير مواليه فليه لعنة الله))،即: ”جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر اللہ کی احتیثت۔“ امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ہو نحمدہ کل حمدة النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا علق نسب کے علق کی طرح ہے (صحیح مسلم، کتاب العتق، باب تحریر تولی العتیق: ۳۷۹۴)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ روی اور عجی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں، ان کو ان کے قدیم آقاوں کے خاندانوں میں شمار کرو، جوان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں۔ ۲۰۱ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں، بلکہ اسلام کا سردار اور ملکتوں کا بادشاہ بنادیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آیندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

.....

۲۰۱ کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر، ص: ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظام تمدن میں گومہانی کی رحمت ہو ٹلوں اور ریسٹورانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گز شدہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کامہمان ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت متبادلہ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برداشت کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گز شدہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھادیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورہ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

﴿هُنَّ أَنْتُكَ حَدِيثُ صَيْفٍ إِبْرَاهِيمَ الْمُكَرَّمِينَ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا وَسَلَّمَ قَالَ سَلَّمَ قَوْمٌ مُّشَكِّرُونَ قَرَأُمْ إِلَى أَهْلِهِ فَبَأْءَهُ بِعِجْلٍ سَوِيْنِ فَقَرَأَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَكَانُوكُونَ كَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ وَبَشِّرُوهُ بِغُلَمٍ عَلَيْهِ﴾

(۵۱) (الذاريات: ۲۴-۲۸)

”(اے پیغمبر ﷺ) ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر (ایک) موٹا تازہ پچڑا (یعنی اس کا گوشہ بخوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انہوں نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تھا) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندر یشنہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوبخبری بھی دی۔“

اس حکایت سے آداب مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجہ لکھا لے جاسکتے ہیں:

- ① مہمان اور میزبان میں کلام کی اہتمامی سلام سے ہونا چاہیے۔
- ② مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے، کیوں کہ ”روغان“ کے معنی سرعت کے ہیں۔
- ③ روغان کے ایک معنی چکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ

ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ از راہ تکلف اس کو روکیں گے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل دعیا سے نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

④ کسی بہانے سے قحوہ دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہئے، تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔

⑤ مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ پچھرا ذبح کیا۔

⑥ کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے؟ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائے۔

⑦ مہمانوں کے کھانے سے مسروار نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے، کیوں کہ جو لوگ بخل ہوتے ہیں، وہ کھاتا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے، کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے، تاکہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل دعیا کے کام آئے، اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

⑧ نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے، اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ ہم لوگ کھاپی نہیں سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لاکن فرزند کے تولد کی بشارت دینے آئے ہیں۔

سورہ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لیے کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز بر تاد کرنا چاہیے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز بر تاد کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

﴿قَالَ إِنَّ هُوَ لَأَعْضَيْنِي فَلَا تَقْضَخُونِي ۝ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُنُونِي ۝﴾ (١٥ / الحجر: ٦٨ - ٦٩)

”کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو اور اللہ سے ڈر روا اور مجھے رسوانہ کرو۔“

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ

تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا اور فرمایا کہ ”جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوی کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے۔“ کہا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ”ایک دن اور ایک رات اور مہماں تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہو گا۔“ نیز فرمایا کہ ”جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔“

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ”کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھرنماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟“ انہوں نے کہا: بے شک، فرمایا: ”ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سو و بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک شب کی مہماں تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہماں اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے۔“

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تقدیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے، وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے خد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں تصریح کردی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں سُنھرتا چاہیے، کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہو گی اور اس پر بار پڑے گا۔

اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہماں صدقہ ہو جائے گی، جس کو خود غیور اور خود ادار مہمان پسند نہ کرے گا۔

١ بخاری، کتاب الادب، باب من كان يؤمِّن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره: ٦٠١٩ - ٦٠١٨۔

٢ بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف و خدمته ایاہ بنفسه: ... - ٦١٣٨ - ٦١٣٧۔

٣ بخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٦١٣٤ - ٦١٣٥۔ ٤ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٣٧٧٧ - ٣٧٧٧۔

٥ بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف و خدمته ایاہ بنفسه: ٦١٣٥ - ٦١٣٤۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا بیباسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدله کئی پشتون تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنار ہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے پھرزوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی و قبائلی یا گنگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یا گنگی ان کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عادتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قَاتَلُوكُمُ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَعْلَمُ وَلَا يَمُؤْنِقُ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَجَّٰٓلِ اللَّهِ جَمِيعًا ۝ وَلَا تَنْفَرُ كُوْنًا ۝ وَإِذْ كُرُوا بِنَعْكَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ لَمْ تُقْتُمُ أَعْدَاءُ فَالَّذِينَ قُلُوبُهُمْ فَأَنْصَبُتُمُوهُمْ بِنَعْكَةِ إِخْرَاجِكُمْ ۝» (۱۳-آل عمران: ۱۰۲)

”اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرد لیکن مسلمان اور اللہ کی رسی سبل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور نکلے نکلے نہ ہو اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔“ مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سار اخزان بھی لشاد دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا:

«وَالَّذِي بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْلَا أَنْفَقَتْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَفْلَتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَ اللَّهُ الَّذِي يَنْهَا مِمَّا لَمْ يَرَهُمْ ۝» (۸/الانفال: ۶۳)

”اور اللہ نے مسلمانوں کے دل ملا دیے، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلوں کو ملائے سکتا، لیکن اللہ نے ملا دیا، بے شک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا ہے اور مصلحت جانے والا ہے۔“

تواب مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سبل کر اللہ کے دین کی رسی کو جوان کی یا گنگی کا اصلی رشتہ ہے اور باہم مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے نکلے نکلے نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سبل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

«وَأَطْبِعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازِعُوا فَنَفَرُوا وَتَذَهَّبَ رِيحُكُمْ ۝» (۸/الانفال: ۴۶)

”اور اللہ اور رسول کا کہا نہیں اور آپس میں بھگڑانہ کرو، (کہ ایسا ہو گا تو) ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا کھڑ جائے گی۔“

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملیت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہوتا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ يُقْرَدُوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ﴾ (٤/ النساء: ٥٩)

”تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں بھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔“

اگر یہ بھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کر دیں:

﴿وَإِنْ طَآئِفَتْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ افْتَكَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتَلُوا الَّتِي تَبَغَّى حَتَّىٰ تَفَقَّهُ عَلَىٰ أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَاعَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(٤٩/ الحجرات: ٩-١٠)

”اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں، تو ان میں صلح کراؤ، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو، اللہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے، مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔“

آیت کے اخیر لکھرے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خوزیری کے بعد بھی نہیں کتنا، انہی آئیوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿إِنْصُرُ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا﴾

”تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کو نکر کی جائے؟ فرمایا: ”اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔“

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافروں سخت سخت دشمن ہو، جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا و فتحہ ہمارا نہیں بھائی ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوْنَةَ فَإِخْوَانَ الْمُمْلَكَةِ فِي الْرَّبِّيْنِ﴾ (١١/ التوبۃ: ٩)

صحیح بخاری ، کتاب المظالم ، باب عن اخاك ظالماً او مظلوماً: ٢٤٤٣۔

”تو اگر یہ کافر (کفر سے) تو بکر لیں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے نہیں بھائی ہیں۔“

غلام بھی اگر کل سے پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا أَبَاهُمْ فَإِخْوَانُ الْكُفَّارِ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيَ الْكُفَّارِ﴾ (۱۳۲ / الاحزاب: ۵)

”تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانتو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔“

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذب رحم کی تحریک فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ عَفَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَفِيعٌ﴾ (۲ / البقرة: ۱۷۸)

”تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔“

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

﴿أَيُحِبُّ أَحَدُكُمَا نَيْمَانَ يَأْكُلُ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا﴾ (۴۹ / الحجرات: ۱۲)

”کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔“

تیموروں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیوں کا فرض ہے اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے لئے کجا جزو بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں، تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں، جن کی خیرخواہی ان کا فرض ہے، فرمایا:

﴿وَإِنْ تُخَالِطُهُمْ فَإِخْوَانُ الْكُفَّارِ﴾ (۲ / البقرة: ۲۲۰)

”اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔“

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعاۓ خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلَا خُوَانِا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ (۵۹ / الحشر: ۱۰)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔“

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے، جس کے دور کرنے کے لیے اللہ سے گزر گذا کر دعا مانگتی چاہیے اور کہنا چاہیے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غُلَّا لِلَّذِينَ أَمْتَوْرَبْنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۵۹ / الحشر: ۱۰)

”اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار! تو ہم بار رحم والا ہے۔“

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، اللہ نے مدح فرمائی:

﴿وَرَحْمٌ أَوْ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۴۸) (۲۹)

”وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں۔“

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور زندگی کا برداشت کرے۔

﴿أَذْلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (المائدۃ: ۵۴) (۵)

”مسلمانوں سے جھکنے اور زندگی کرنے والے۔“

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور ہم باری کی مزید تشریع اور تاکید محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے: ”مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بے خوابی میں بنتا ہو جاتے ہیں۔“ * صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: ”سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔“ * مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچ تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرਾ حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔“ * بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرਾ حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ”جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تحریر حسن و حصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعت

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۱ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تراحم المؤمنین و تعاطفهم و تعاضدهم: ۶۰۸۶۔

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، ایضاً: ۶۰۸۹۔

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضما: ۶۰۲۶ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، ایضاً: ۶۰۸۵۔

اسلامیہ ایک تعلعہ ہے، جس کی ایک ایسٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ تعلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اس کی ایک ایسٹ دوسری ایسٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ ایسٹ اپنی جگہ سے ہٹک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مد چھوڑے اور نہ اس کی تحریر کرے..... انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحریر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔“ ④ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابو داؤد میں ہے کہ فرمایا: ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا، تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی پرده پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پرده رکھے گا۔“ ⑤

ابو داؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ”جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پرده رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پرده رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“ ⑥

فرمایا ”مسلمان وہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔“ ⑦ یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ فرمایا: ”جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔“ ⑧ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچتا، وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبد اللہ بخاری رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔“ ⑨ کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسق) ہے اور اس سے لڑنا (قتل) اللہ کا انکار (کفر) ہے۔“ ⑩ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آتشی کا حکم دیا ہے، اب جو

صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم و خذله: ۶۵۴۱۔ سنن ابن داود، کتاب الادب، باب المذاخة: ۴۸۹۳۔ ۱۱ سنن ابن داود، کتاب الادب، باب فی المعنون للمسلم: ۴۹۴۶۔ ۱۰ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۰۔ ۱۱ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ای الاسلام افضل: ۱۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان تفاضل الاسلام: ۱۶۱۔ ۱۲ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: الدین التصیحة: ۵۷۔ ۱۳ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن ان يحيط عمله۔ ۱۴ و کتاب الادب باب ما ينهى عن السباب واللعن: ۶۰۴۴۔

اس کے خلاف کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں اللہ کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناقص اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے، جو کافروں کے لیے مخصوص ہے، فرمایا: ”کسی مسلمان کو سزا اور نہیں کرو وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الیکہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔“

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا بَعْذَةً جَهَنَّمُ خَلِدًا فِيهَا وَغَضَبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَأَعْدَدَ لَهُ عَذَابًا أَعْظَمَ مِمَّا يَرَى﴾ (٤/ النساء: ٩٣)

”اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصدہ قتل کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، وہ اس میں پڑا رہے گا اور اللہ اس پر خطا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے برا اعذاب تیار کیا۔“

جیتنا الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا، پھر فرمایا: ”دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردان مارنے لگو۔“ * ایک اور موقع پر فرمایا کہ ”جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔“ * جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا: ”سب سے بڑا ریا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔“ * اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخصوص میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ذرہ ہو، تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا: ”جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مد چھوڑ دے گا، جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو اللہ بھی اس کو ایسی جگہ بے مد چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔“ *

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت ﷺ نے تمین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ ”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تمین و دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتداء کرے۔“ * ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”آپ میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھے پیچھے برانہ کہو، اے اللہ کے بندو! بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کرو اپنے بھائی سے تمین دن سے زیادہ یوں چالنا چھوڑ دے۔“ * ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے

1. صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات للعلماء: ۱۲۱ و کتاب الدیات: ۶۸۶۹ - ۶۸۶۷.

2. صحیح بخاری، کتاب الدیات ایضاً: ۶۸۷۴ و کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ من حمل علينا... ۷۰۷۰ -

3. سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الغيبة: ۴۸۷۶ - ۴۸۸۴.

4. صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الہجرة: ۶۰۷۷ و سنن ابی داود کتاب الادب، باب فی هجرة

الرجل الخاہ: ۴۹۱۱ - ۶. صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یعنی عن التحاصل والتدارب: ۶۰۶۵ -

اظہار اسلام کے لیے سلام کرنے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں:

﴿وَلَا تَكُونُوا لِعَنَ الْفَقِيرِ إِلَيْكُمُ السَّلَامُ كُلُّ مُؤْمِنٍ﴾ (٤٤ / النساء: ٩٤)

”اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا لکھ دے اے، یہ نہ کہو کہ تو موسیٰ نہیں۔“

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا، اس نے فوراً اگلہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی، آپ نے ان کو بالا کر دریافت کیا، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے صرف ڈر سے لکھ پڑھا تھا، آپ ﷺ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا: ”تم اسکے لालہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے؟“ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ”کیا تم نے اس کا سینٹے چپر کر دیکھ لیا تھا؟“ *

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ”موسیٰ کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔“ یہ بھی فرمایا کہ ”جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔“ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔ جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ ”جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا۔“ ایک شخص نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی؟ فرمایا: ”درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔“ *

فرمایا: ”ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکے پر اللہ تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیکار ہوتے عیادات کرنا اور مر جائے تو اس کے ساتھ چنان۔“ یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں، جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ”جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادات کو جاتا ہے، تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روشن پر ہوتا ہے۔“ * حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے ذفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو (۲) رتی (تیراط) ملی ہے، جن میں سے ہر تی احمد کے پہاڑ برابر ہو گی۔“ یعنی یہ رتی

* جملہ روایت صحیح بخاری، کتاب المغازی، کتاب الدیبات: ٤٢٦٩ اور کتاب الدیبات: ٦٨٧٢ میں ہے، دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیبات شرح حدیث مذکور، ج ۱۲، ص: ۱۷۲۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینهی من السباب واللعن: ۶۰۴۷۔ ۳ ایضاً، باب من اکفر الخاہ... ۶۱۰۳: صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لا خیہ..... ۲۱۵۔ ۴ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقطع حق مسلم: ۳۵۷۳۵۲۔ ۵ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ۵۰۳۰۔ ۶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل عبادة المریض: ۶۵۵۱۔ ۷ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ابیاع الجنائز: ۴۷۔

دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانے سے ہوگی، جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا، اس برادران الفت و محبت کے فروع ہیں، جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہو گا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔“ ❷ الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر کن و در سے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابو داؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔“ ❸ دیکھنے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہیں اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه: ۱۳۔ ❸ سن ابی داود، کتاب الادب، باب فی النصیحة والحیاطة: ۴۹۱۸: تیرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا نہ ہی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے، کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو درہ ریا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿وَقُولُوا لِلّٰٰئِسِ حُسْنًا﴾ (۲ / البقرة: ۸۳)

”اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔“

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے بیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برداشت سے بازنہ رکھے، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿وَلَا يَجِدُ مِنْكُمْ شَيْئًا قَوْمٌ عَلَى الْأَنْعَدِ لَوْمًا إِعْدُلُوا هُوَ أَقْرَبُ إِلَيْشُؤْيٍ﴾ (۵ / المائدۃ: ۸)

”او کسی قوم کی عدالت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔“

ہر قسم کا راسلوک اور بے رحمانہ برداشت جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت مبارکہ انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا تبغضوا و لَا تحسدوا و لَا تداربوا و كونوا عباد اللہ اخوانا))

”آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔“

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

((لَا تناجشووا و لَا تحسدوا و لَا تداربوا و كونوا عباد اللہ اخوانا))

”ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔“

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الہجرة: ۶۰۷۶۔

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یا یہا الذین امتو اجتبوا: ۶۰۶۶۔

فہاد سے بھری ہوئی دنیا فعثہ جنت بن جائے، فرمایا:

(من لا يرحم لا يرحم) ﴿
”جور حم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“

جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ رحم نہیں کرتا، یا یہ کہ جو دوسرا پر رحم نہیں کرتے گا، مسدر ک حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم رحم فرمائے گا۔“ ﴿ یہ حدیث رحمۃ للعلیمین کی تلیم کی شان رحمت کو تقدیم عمویت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔“ ﴿ اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا، جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا، کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے؟ فرمایا: ”ہر تر جگہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔“ یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے، نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔ ﴿ اس ثواب کے دارہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ در ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ”جهاں بھی ہو اللہ کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلانی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آو۔“ ﴿ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے پانچ باتیں گناہیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ((واحبت للناس ما تُحِبُّ لنفسك)) یعنی ”تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔“ ﴿ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلانی کا جذبہ دل میں نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے هر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ”تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔“ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ”تم اپنے پڑوئی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔“ ﴿ اسلام

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٣۔

مسدر ک حاکم، کتاب البر والصلة، ج ٤، ص: ١٥٩۔ ﴿ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٢۔ ایضاً: ٦٠٠٩۔﴾

جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في

معاصرة الناس: ١٩٨٧۔ ﴿ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من انتقى المحارم فهو أعبد الناس: ٢٣٠٥۔﴾

عہد نامہ جدید مرقس، ۱۲، ص: ۳۰۔

میں پڑویں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گز رچکا ہے، ۱۱ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی پڑے یہ کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑویں کا حق بھی مسلمان پڑویں ہی کی طرح مانا ہے۔ صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقر اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے، تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک بڑھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا، جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی عمر کے سب سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو پکھو دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، اللہ کی قسم! ۱۲ ۱۳ ۱۴ ان صاف نہیں کریں گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مد پھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقر اور مساکین کے لیے ہے، فقر اتوہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں، ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ ۱۵

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دینے جاسکتے ہیں، آنحضرت نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، امام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۹۹ ۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳ ۱۰۴ ۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ ۱۰۸ ۱۰۹ ۱۱۰ ۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱۱۹ ۱۱۹ ۱۲۰ ۱۲۱ ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵ ۱۲۶ ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۲۹ ۱۳۰ ۱۳۱ ۱۳۲ ۱۳۳ ۱۳۴ ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹ ۱۳۹ ۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۷ ۱۴۸ ۱۴۸ ۱۴۹ ۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۶ ۱۵۷ ۱۵۷ ۱۵۸ ۱۵۸ ۱۵۹ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۵ ۱۶۶ ۱۶۶ ۱۶۷ ۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۴ ۱۷۵ ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۸ ۱۹۹ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۸ ۲۹۹ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۸ ۳۹۹ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۴۹ ۴۴۱۰ ۴۴۱۰ ۴۴۱۱ ۴۴۱۱ ۴۴۱۲ ۴۴۱۲ ۴۴۱۳ ۴۴۱۳ ۴۴۱۴ ۴۴۱۴ ۴۴۱۵ ۴۴۱۵ ۴۴۱۶ ۴۴۱۶ ۴۴۱۷ ۴۴۱۷ ۴۴۱۸ ۴۴۱۸ ۴۴۱۹ ۴۴۱۹ ۴۴۲۰ ۴۴۲۰ ۴۴۲۱ ۴۴۲۱ ۴۴۲۲ ۴۴۲۲ ۴۴۲۳ ۴۴۲۳ ۴۴۲۴ ۴۴۲۴ ۴۴۲۵ ۴۴۲۵ ۴۴۲۶ ۴۴۲۶ ۴۴۲۷ ۴۴۲۷ ۴۴۲۸ ۴۴۲۸ ۴۴۲۹ ۴۴۲۹ ۴۴۳۰ ۴۴۳۰ ۴۴۳۱ ۴۴۳۱ ۴۴۳۲ ۴۴۳۲ ۴۴۳۳ ۴۴۳۳ ۴۴۳۴ ۴۴۳۴ ۴۴۳۵ ۴۴۳۵ ۴۴۳۶ ۴۴۳۶ ۴۴۳۷ ۴۴۳۷ ۴۴۳۸ ۴۴۳۸ ۴۴۳۹ ۴۴۳۹ ۴۴۳۱۰ ۴۴۳۱۰ ۴۴۳۱۱ ۴۴۳۱۱ ۴۴۳۱۲ ۴۴۳۱۲ ۴۴۳۱۳ ۴۴۳۱۳ ۴۴۳۱۴ ۴۴۳۱۴ ۴۴۳۱۵ ۴۴۳۱۵ ۴۴۳۱۶ ۴۴۳۱۶ ۴۴۳۱۷ ۴۴۳۱۷ ۴۴۳۱۸ ۴۴۳۱۸ ۴۴۳۱۹ ۴۴۳۱۹ ۴۴۳۲۰ ۴۴۳۲۰ ۴۴۳۲۱ ۴۴۳۲۱ ۴۴۳۲۲ ۴۴۳۲۲ ۴۴۳۲۳ ۴۴۳۲۳ ۴۴۳۲۴ ۴۴۳۲۴ ۴۴۳۲۵ ۴۴۳۲۵ ۴۴۳۲۶ ۴۴۳۲۶ ۴۴۳۲۷ ۴۴۳۲۷ ۴۴۳۲۸ ۴۴۳۲۸ ۴۴۳۲۹ ۴۴۳۲۹ ۴۴۳۳۰ ۴۴۳۳۰ ۴۴۳۳۱ ۴۴۳۳۱ ۴۴۳۳۲ ۴۴۳۳۲ ۴۴۳۳۳ ۴۴۳۳۳ ۴۴۳۳۴ ۴۴۳۳۴ ۴۴۳۳۵ ۴۴۳۳۵ ۴۴۳۳۶ ۴۴۳۳۶ ۴۴۳۳۷ ۴۴۳۳۷ ۴۴۳۳۸ ۴۴۳۳۸ ۴۴۳۳۹ ۴۴۳۳۹ ۴۴۳۳۱۰ ۴۴۳۳۱۰ ۴۴۳۳۱۱ ۴۴۳۳۱۱ ۴۴۳۳۱۲ ۴۴۳۳۱۲ ۴۴۳۳۱۳ ۴۴۳۳۱۳ ۴۴۳۳۱۴ ۴۴۳۳۱۴ ۴۴۳۳۱۵ ۴۴۳۳۱۵ ۴۴۳۳۱۶ ۴۴۳۳۱۶ ۴۴۳۳۱۷ ۴۴۳۳۱۷ ۴۴۳۳۱۸ ۴۴۳۳۱۸ ۴۴۳۳۱۹ ۴۴۳۳۱۹ ۴۴۳۳۲۰ ۴۴۳۳۲۰ ۴۴۳۳۲۱ ۴۴۳۳۲۱ ۴۴۳۳۲۲ ۴۴۳۳۲۲ ۴۴۳۳۲۳ ۴۴۳۳۲۳ ۴۴۳۳۲۴ ۴۴۳۳۲۴ ۴۴۳۳۲۵ ۴۴۳۳۲۵ ۴۴۳۳۲۶ ۴۴۳۳۲۶ ۴۴۳۳۲۷ ۴۴۳۳۲۷ ۴۴۳۳۲۸ ۴۴۳۳۲۸ ۴۴۳۳۲۹ ۴۴۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳ ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۴ ۴۴۳۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۵ ۴۴۳۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۶ ۴۴۳۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۷ ۴۴۳۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳۳۳۳۸ ۴۴۳۳۳

”ان کو راہ پر لے آتا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، راہ پر لے آتا ہے اور جو بھلائی سے خرچ کرو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔“
یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملے گا۔ مند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

((لا يؤمن أحدكم حتى يحب للناس ما يحب لنفسه و حتى يحب المرأة لا يحبه الا لله عزوجل)) ﴿

”تم میں سے کوئی اس وقت پورا مون نہیں ہو گا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف اللہ کے لیے پیار نہ کرے۔“
اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی بدائیت کی، اہل عرب و حشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو انہا دھندا رکھ رکھا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھا جاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ بار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو داتہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا ایسے جانور کو بلایتے کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو منادیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشاندہ لگاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنا لیا جائے، * ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنارہاتا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنارہے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے، * اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہاں اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: "اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے۔" * یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کائنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ * بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت برا گناہ قرار دیا۔ * ایک حدیث میں ہے کہ "کسی نے اگر کنجھک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو اللہ اس کے متعلق اس سے باز

* ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورة: ۱۴۷۳۔

* بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب ما يكره من المثلة والمصبورة والمجنحة: ۵۵۱۵، ۵۵۱۴۔

* ترمذی، ابواب الصید باب ماجاء ماقطع من الحی فهومیت: ۱۴۸۰۔

* بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب ما يكره من المثلة والمصبورة والمجنحة: ۵۵۱۵۔

* مستدرک حاکم، کتاب النکاح، ج ۲، ص: ۱۸۲۔

پر کرے گا۔ ”صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس کا ذبح کیا ہے؟ فرمایا: ”یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سرکاث کے پھینک دے۔“ * اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں، سمن نسائی میں ہے کہ ”جو شخص کجھنک کو بلا ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔“ * جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے خاص طور پر چیزوں، شہد کی کمی، ہدہ اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ *

جو جانور ضرورت مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبح کو آرام پہنچائے۔“ * ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر حرم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر حرم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا: ”اگر تم بکری پر حرم کرتے ہو تو اللہ تم پر حرم کرے گا۔“ * یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاث کریا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی۔ * کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا زندگی نشکست کھا سکتا ہے، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ * مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ دو رہ پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی پکھنہ دیا اور آخروہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی۔“ * بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہبیت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اس لیے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گناہ ہاگار ہیں،

۱ نسائی، کتاب الصھایا، باب من قتل عصفوراً: ۴۵۰؛ دار المی: ۱۹۷۸؛ احمد، ۲/۱۶۶۔

۲ نسائی، کتاب الصھایا، من قتل عصفوراً: ۴۴۵۱۔

۳ ابو داود، کتاب الادب، باب فی قتل الذر: ۵۲۶۷؛ ابن ماجہ: ۳۲۲۴۔

۴ مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبيح والقتل: ۵۰۵۵۔

۵ مسند احمد، ج ۳، ص: ۴۳۶۔ ۶ نسائی، کتاب الصھایا، باب النهي عن الذبيح في الظفر: ۴۴۰۸۔

و بباب فی الذبيح بالسن: ۴۴۰۹؛ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب الحذف والبندقة: ۵۴۷۹۔

۷ بخاری، ایضاً: ۴۸۴۱، ۵۴۷۹۔ ۸ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب: ۳۲۱۸۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر اللہ ان کو معاف کر دے تو بھوکہ کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیے۔“ * ایک رفعہ آپ صاحبہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب والبیں آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے، جہاں زمین میں یا درخت پر چیزوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ”یہ کس نے کیا ہے؟“ ان صاحب نے کہا، یا رسول اللہ ایسے میں نے کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بجھاؤ بجھاؤ۔“ * (غرض یہ تھی کہ ان چیزوں کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائیں)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیزوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے منبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلا دیا، * یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی، جس نے کاٹا تھا، تمام چیزوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چیزیا کے دونپچ کپڑا لئے، چیزیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ ﷺ قضاۓ حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے، والبیں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ”اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو برقرار کیا ہے، اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔“ صحابہ کرام نے چیزوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا: ”آگ کی سزادیا صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔“ *

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم رہتا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، یعنی اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا: ”ہر پیاسے یا ہر ذہنی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔“ *

ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی،اتفاق سے اس کو ایک کنوں مل گیا اور اس نے کنوں میں اتر کر پانی پی لیا، کنوں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کچھ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلا دیا، اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ نے اس کو بخشن دیا۔“ صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سناتوبو لئے کہ یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا: ”ہر

* مسند احمد، ۴۴۱/۲ - ۴۴۲، مسند ابن حنبل، ۱، ص: ۳۹۶ عن عبد اللہ بن مسعود۔

* بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب۔ ۳۳۱۹۔ * ابو داود، کتاب الجناد، باب فى

کراہیہ حرق العدو بالنار: ۲۶۷۵۔ * ابن ماجہ، ابواب الادب، باب فضل صدقۃ الماء: ۳۶۸۶۔

ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔ ① صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ بنا تاتاں تک کی خدمت اور پروردش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ ”جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا یکتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔“ ② اس اصول کے تابعے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول تابعے یعنی:

① جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لینا چاہیے، چنانچہ فرمایا: ”ایک شخص ایک نیل پرسوار ہو کر جارہا تھا، میں نے مڑکر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھجیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔“ ③ نیز فرمایا کہ ”اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، اللہ نے ان کو تمہارا فرمائیں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔“ ④ اگر چہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر پیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر پیٹھ رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

② جانوروں کے آرام و آسانیں کا خیال رکھنا چاہیے، چنانچہ فرمایا کہ ”جب تم لوگ سفر بزری اور شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرفیزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی کے ساتھ چلاو۔“ ⑤ تاکہ قحط کی وجہ سے ان کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹھ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا: ”ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو حکاہ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر حکاہو۔“ ⑥

ایک بار آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر بلبا لیا اور آب دیدہ ہو گیا، آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کٹپیٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ”یہ کس کا اونٹ ہے؟“ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ میرا یا رسول اللہ افرمایا: ”اس جانور کے بارے میں جس کا اللہ نے تم کو مالک بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوک رکھتے ہو اور اس پر جرکرتے ہو۔“ ⑦

① بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۹۔

② بخاری، کتاب الحrust والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس اذا كل منه: ۲۲۲۰۔

③ بخاری، کتاب الحrust والمزارعة، باب استعمال البقر للحراثة: ۲۲۲۴۔

④ ابو داود، کتاب الجهاد، باب في الوقوف على الدابة: ۲۵۶۷۔

⑤ مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب في السير والنهي عن التعريض في الطريق: ۴۹۶۰، ۴۹۵۹۔

⑥ ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما يؤمر به من القيام على الدواب والبهائم: ۲۵۴۸۔ ⑦ ایضاً: ۲۵۴۹۔

- ③ جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔
- ④ جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا، کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا زم ہے اور کس طرح حرم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب النهى عن الوسم في الوجه والضرب في الوجه: ٢٥٦٤۔
 ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب في التحرير بين البهائم: ٢٥٦٢۔

فضائل اخلاق

اخلاق حسنے کے جزئیات اس کثرت سے ہیں، کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکماء اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق، امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جو ہری ارکان ہیں، جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوت علمی، قوت شہوانیہ، قوت غصیہ، قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت و قوت غصیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور بے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ یہ تقسم محض فلسفیات ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عمل بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلاح کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور بے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہل فلسفہ کارگنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء ﷺ کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادات سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برائے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گوئی دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی رایاں اور خلق اللہ کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو اللہ پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر ”اخلاق اور محبت الہی“ کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو اللہ پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے، لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو وجہ ملنی چاہیے، جو خدا اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور بیغوروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب

اللّٰہ اور یامِ نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہوا رجہ بھائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔ گواں معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور و فکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو داخل ہے، اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گناہ کراں نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشاش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی علیہ السلام میں جا بجا ان کی تفصیل ہے، جیسے:

﴿قَدْ أَفْلَمَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ الْلُّغْٰزِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلرِّكْلَةِ فَعُلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِقُرُوچِهِمْ حَفَظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكُتُ آيَاتِهِمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مُلْوَمِينَ ۝ قَمَنَ ابْتِقَنَ وَرَأَءَ ذَلِكَ قَوْلِيْكَ هُمْ الْعُدُوْنَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْقَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَاوِظُونَ ۝ أُولَئِكَ هُمُ الْوَرُثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفَرْدَوْسَ طَهْرَفِيهَا حَلِيلُوْنَ ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون: ۱۱-۱)

”ایمان والے مراد کو یقین کئے، جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بے کار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمنگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے، کہ ان پر کوئی اڑام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہیں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی ا manus سے اور اپنے عبد کا لاحاظہ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

ان آتوں میں جن اخلاقی فضائل کا میان آیا ہے وہ یہ ہیں، لکھی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایقاۓ عبد، ایک دوسرا جگہ ہے:

﴿وَلَكُنَ الْيٰمَنَ أَمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيٰمَ الْأَخِرُ وَالْمُلْكَةُ وَالرِّكْلَةُ وَالرِّكْبَنَ وَأَنَّ الْمٰلَ عَلَىٰ حِيْثُهُ ذُوِيُّ الْعُرْقِيٰ وَالْيَمِيٰ وَالسَّكِيْنَ وَأَنَّ السَّيْمِيلَ - وَالسَّكَلِلِيْنَ وَفِي الرِّيقَابِ - وَأَقَامَ الصَّلَوةَ وَأَنَّ الرِّكْلَةَ وَالْمُوْفُونَ يَعْهِدُهُمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالظَّبِيرَيْنَ فِي الْبَاسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَجِينَ الْبَاسِ ۝﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۷)

”اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لا یا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشته داروں کو اور تیکیوں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے اقرار کر لیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے مل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔“

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنانے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿الظَّاهِرِينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالقَيْتَيْنَ وَالْمُنْفِقِينَ﴾ (۱۷/آل عمران: ۳)

”ثابت قدم رہنے والے اور بچ بولنے والے اور (اللہ کی) فرمان برداری کرنے والے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔“

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان مستقیموں کا حال ہے جو اللہ کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿الَّذِينَ يُعْلَمُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ التَّأْسِ طَوَّلَ اللَّهُ مُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲۳/آل عمران: ۴)

”جو خوشحالی اور تنگ وستی دونوں حالتوں میں (اللہ کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، غفو و درگزرا اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورہ معارج میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلْسَّابِلِ وَالْحَرُوفِ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ يَعْوِمُ الْدِيْنُ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْتَفِقُونَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ عَيْرٌ مَأْمُونٌ وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوبِهِمْ لَخَفَّلُونَ إِلَّا عَلَى أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكُتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلْمُوْمِينَ قَمَنْ ابْتَغَى وَرَأَءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعُدُوْنَ وَالَّذِينَ هُمْ لَا يَنْتَهُمْ وَعَهْدُهُمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ يَشَهِدُونَ تِهْمَمْ قَابِوْنَ﴾ (۷۰/المعارج: ۲۴-۲۳)

”اور حن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے اور جو روز جزا کو بچ مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ذرتے ہیں، بے شہاب ان کے رب کا عذاب نذر ہونے کی چیز نہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرمندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور

جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔“
ان آئیوں میں سخاوت، ننسی، عفت و عصمت، امانت داری، ایفائے عہد اور پچی گواہی کو ایک مومن کی
ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے، جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔
سورہ الحزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشش اور بڑی
مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

**«وَالصَّادِقِينَ وَالصَّدِيقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْغَيْثَعِينَ وَالْغَيْثَعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ
وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْحَفِظِيْنَ فَرُوجَهُمْ وَالْغَيْظَاتِ»**

(۳۵) / الحزاب

”اور پچ بولنے والے اور پچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی
کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور
روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور
حفاظت کرنے والیاں۔“

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت و عفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورہ فرقان میں اللہ کے اتحدھے بندوں کی پیچان یہ تائی گئی ہے:

(۱) **«وَعَبَادَ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُنَّا وَإِذَا خَاطَهُمُ الْجِهَلُونَ قَالُوا سَلَّمًا»**

(۶۲) / الفرقان

”اور رحم و اے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین میں ہو لے چلتے ہیں اور جاں جب ان سے
(جهالت کی) با تین کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔“ *

(۲) **«وَالَّذِينَ إِذَا أَتَقْفَوُا الْحُمْرَ يُسْرِفُوْا وَكُمْ يَقْتَرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا»** (۲۵) / الفرقان: ۶۷

”اور جب وہ خرچ کریں تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے نیچ کی راہ
ہو۔“

«وَلَا يَكُنُونَ النَّفَسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَرْدُنُونَ» (۲۵) / الفرقان: ۶۸

”اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔“

«وَالَّذِينَ لَا يَشْهُدُونَ الرُّؤْوَرِ وَإِذَا مَرُوا بِاللَّغْوِ مُنْهَوْا كَرِمًا»

(۷۲) / الفرقان

”اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بے ہودہ مشغله کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزرا جائیں۔“

پہلی آیت میں عاجزی اور فروقی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میان روی اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور ممتازت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورہ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبی میں کام آئیں گی:

﴿الَّذِينَ يُؤْفَقُونَ إِعْهَدُ اللَّهِ وَلَا يَنْفَضُّونَ إِلَيْنَا قَوْمٌ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمْرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ وَيَنْكِثُونَ رَبِّهِمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ هُنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا إِنْقَاعَةً وَجْهًا رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ بِرِزْقًا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرُغُونَ بِالْحَسَنَاتِ السَّيِّئَاتِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَقْبَى الدَّارِ﴾ (۲۲: الرعد)

”جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہبے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جوان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (ایچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلانی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے چھلا گھر ہے۔“

اس ایفاۓ عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اللہ کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہل قرابت اور حق داروں کے حقوق ہیں، ان دو کے سوا ان آجیوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدالہ لوگوں سے بھلانی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلانی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ تَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۲۸: القصص)

”اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور آخر انجام پر ہیز گاروں کے لیے ہے۔

یعنی غرور و خوت نہیں کرتے:

﴿وَالَّذِينَ يَجْتَبِيُونَ كَبِيرِ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشِ وَإِذَا مَا عَصَبُوا هُمْ يَعْفُونَ﴾

(۴۲: الشوری: ۳۷)

”اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو

معاف کر دیتے ہیں۔“

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴾ (۴۲: المائدة)

”بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔“

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا جائیے کہ وہ اللہ کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۱۹۵: البقرة)

”بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

اس پیار اور محبت کے اتحاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھے صفحوں میں گزر چکی ہے اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پاؤ نہیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں بچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی تیج کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلیں آ جاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا بچائی ہے، جو سچائیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر تینی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسرا یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسرا یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمائیے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد یہ ہوا کہ ”جھوٹ نہ بولا کرو۔“ چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صحیح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کی تو عباد کے خلاف ہو گا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا، جب رات زیادہ گزری اور اندر ہر اخوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گجھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کشیں گے اور نہیں کرتا تو بد عبادی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صحیح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ اجھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھٹ گئیں، یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسروہ ہوئے۔

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر تیج کے لحاظ سے بالکل درست ہے، بچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہو گا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا وہ راست باز ہو گا، راست گو ہو گا، ایماندار ہو گا، وعدہ کو پورا کرے گا، عباد کو فا کرے گا، دلیر ہو گا، دل کا صاف ہو گا، ریا کا کارہ ہو گا، اس کے دل میں نفاق نہ ہو گا پیچھے پکھا اور سامنے پکھا اس کی شان نہ ہو گی، خوشنامی نہ ہو گا۔ سب کے بھروسے کے قابل ہو گا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہو گا، جو کہے گا، کرے گا غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔ صدق صفاتِ ربیٰ میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اللہ آپ فرماتا ہے:

● اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ ان میں تکہ سیر کے حوالہ نے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا مأخذ نہیں معلوم ہوا۔ (تفسیر فتح العزیز، پارہ: ۲۹، ص: ۳۳) ●

﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا﴾ (٤ / النساء: ٨٧)

”اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔“

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَعْدَ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا﴾ (٤ / النساء: ١٢٢)

” وعدہ کیا اللہ نے تھج اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔“

اللہ سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت پر کسی ہے فرمایا:

﴿وَإِنَّا لَصَدِيقُونَ﴾ (٦ / الانعام: ١٤٦)

”اور ہم ہیں تھج۔“

﴿فُلُّ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّعُوا مِلَةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (٣ /آل عمران: ٩٥)

”کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے تھج فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی بیرونی کرو۔“

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدْقِ وَصَدَقَ يَهُوَ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (٣٩ / الزمر: ٣٩)

”اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو تھج مانا وہ تو پر ہیز گار ہیں۔“

اس آخری آیت میں ”سچائی“ سے مراد اللہ کی شریعت یا کتاب ہے۔ مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پر ہیز گاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر کسی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پاک رائختے ہیں:

﴿وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (٣٣ / الاحزاب: ٢٢)

”اور اللہ اور اس کے رسول نے تھج کہا۔“

چونکہ رسول، اللہ سے علم پاتے ہیں، اس لیے وہ بھی تھج ہوتے ہیں:

﴿وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ﴾ (٥٢ / یس: ٣٦)

”اوپیغمبروں نے تھج کہا۔“

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے، کیوں کہ ان کی ساری باتیں دعوے، ولیس اور حکم اگر نعروز بالله سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان لی پیغمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گرجائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے دائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صَدِيقًا لَّهُ﴾ (٤١ / مریم: ١٩)

”اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔“

ایک اور پتختہ حضرت ادریس علیہ السلام کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے:

﴿وَادْعُونِي إِلَيْكُمْ إِذْنِيْسْ إِنَّهُ كَانَ صَدِيقًا لِّيْتَهُ﴾ (۱۹/ مریم: ۵۶)

”اور کتاب میں ادریس علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔“

حضرت مریم علیہ السلام جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچے مانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس وصف سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

﴿وَأَمَّةٌ صَدِيقَةٌ﴾ (۵/ المائدۃ: ۷۵)

”اور ان (عسکی علیہ السلام) کی ماں بڑی سچی تھیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدقیق کہلاتے ہیں:

﴿يُوْسُفُ أَلْيَهَا الصَّدِيقُ﴾ (۱۲/ یوسف: ۴۶)

”یوسف! اے بڑے سچے!“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو اللہ سے صادق ال وعد

(وعدہ کا سچا) خطاب پایا:

﴿وَادْعُونِي إِلَيْكُمْ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا﴾

(۱۹/ مریم: ۵۴)

”اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔“

اللہ کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے، جو دنیا میں وہ سری صفتون کے

ساتھ سچائی اور استبازی سے ممتاز تھے:

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّدِيقِينَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۷)

”صبر کرنے والے اور سچے۔“

اللہ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کیے ہیں، ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ پکوں اور استبازوں کا ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَتَنِينَ وَالْقَتَنِيَّاتِ وَالصَّدِيقِينَ وَالصَّدِيقَاتِ﴾

(۳۵/ الحزاب: ۳۲)

”بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور

فرمانبردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔“

﴿أَعْذَّ اللَّهُ أَهْمَّ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (٣٥ / الاحزاب)

”اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔“

اس سچائی کے کاروبار کا صلد و سری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے:

﴿هُذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّدِيقِينَ صِدْقُهُمْ﴾ (٥ / المائدۃ: ١١٩)

”یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا حق کام آئے گا۔“

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:

﴿لِيَعْزِزَ اللَّهُ الصَّدِيقِينَ بِصِدْقِهِمْ﴾ (٢٤ / الاحزاب)

”تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔“

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ پھوٹ کا ساتھ دو، پھوٹ ہی کی جماعت سے علاقہ و رابطہ رکھو اور انہیں کی محبت میں رہو کر ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَمْ يَكُونُوا مَعَ الصَّدِيقِينَ﴾ (٩ / التوبۃ: ١١٩)

”اے ایمان لانے والا! اللہ سے ڈر اور پھوٹ کے ساتھ رہو۔“

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان پھوٹ سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں، جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہر حال آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو پھوٹ کی معیت اور محبت کی دعوت دیتی ہے۔ سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچے بولنے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جن کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی، لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آ جاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی

پچی زبان سے جو بولا جائے، وہ حق بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ لٹکے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عبد اور قول و قرار کو بنانا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورہ الحزاب میں ایک آیت ہے:

﴿لَيَعْرِيَ اللَّهُ الصَّدِيقِينَ يَصْدُقُهُمْ وَيُعَذِّبَ الْمُفْقِدِينَ إِنْ شَاءَ﴾ (٢٣) (الحزاب: ٢٤)

”تَاكَ اللَّهُ بَحْولَ كُوَانَ كَيْ سَچَائِيْ كَا عَوْضَ دَے اور مَنَافِقُوْنَ كُوسَرَادَے اگْرَچَابَے۔“

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف بیرونیوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیمان تابعی سے مرسل ا روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ”ہو سکتا ہے۔“ پھر پوچھا، کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے؟ جواب دیا: ”ہو سکتا ہے۔“ پھر دریافت کیا، کیا جھونا بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ”نہیں۔“ * کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مومن ہر حوصلت پر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر“ (نہیں) * مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر برائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جو ہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے ارشاد ہوا: ”کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہو گا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگر چہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو۔“ * ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحابہ کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر و شیعہ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو، تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے پردازی کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔“ * یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ ”منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب کہے تو جھوٹ

* مؤطراً امام مالک، کتاب الكلام، بـ ماحاجـ في صدقـ والكذـب: ١٨٦٢۔ * عن أبي امامـة عندـ مسندـ أحـمـدـ، حـ ٥ـ، صـ ٢٥٢ـ وـ عنـ سـعـدـ بـنـ أـبـيـ وـ قـاصـ عـنـ الدـبـازـ: ١٠٢ـ وـ أـبـيـ يـعلـىـ ٧١١ـ وـ الطـبـرـانـيـ فـيـ الـكـبـيرـ وـ الـبـيـهـقـيـ فـيـ السـنـنـ، ١٩٧ـ /ـ ١٠ـ وـ فـيـ الشـعـبـ: ٤٨٠ـ وـ عنـ أـبـنـ عـمـرـ عـنـ الـبـيـهـقـيـ فـيـ الشـعـبـ: ٤٨١ـ وـ قـدـ روـيـ مـرـفـوعـاـ وـ مـوـقـوفـاـ۔ * مـسـنـدـ أـحـمـدـ عـنـ أـبـيـ هـرـيـرـةـ، جـ ٢ـ، صـ ٣٥٢ـ وـ طـبـرـانـيـ، نـيـزـ مـسـنـدـ أـبـيـ يـعلـىـ عـنـ عـمـرـ بـنـ الـخـطـابـ، يـعـدـ شـيـشـ حـافظـ مـنـذـرـيـ كـيـ تـرـغـيبـ وـ تـرـهـيبـ جـلـ دـوـمـ بـابـ التـرـغـيبـ فـيـ الصـدـقـ، صـ ١٩٣ـ سـےـ لـيـگـيـ مـيـںـ۔ * صحيحـ بـخارـيـ، کـتابـ الـإـيمـانـ، بـابـ عـلـامـاتـ الـمـنـافـقـ: ٣٤ـ وـ صـحـيـحـ مـسـلـمـ، کـتابـ الـإـيمـانـ، بـابـ خـصـالـ الـمـنـافـقـ: ٢١٠ـ وـ أـبـوـ دـاـوـدـ، کـتابـ السـنـةـ، بـابـ الدـلـلـ عـلـىـ الـرـيـاـدـةـ الـإـيمـانـ: ٦٨٨ـ وـ تـرـمـذـيـ، أـبـابـ الـإـيمـانـ، بـابـ مـاـ جـاءـ فـيـ عـلـامـةـ الـمـنـافـقـ: ٢٦٣٢ـ وـ نـسـائـيـ، کـتابـ الـإـيمـانـ، بـابـ عـلـامـةـ الـمـنـافـقـ: ٥٠٢٣ـ۔

بُولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب ایمن بنایا جائے تو بے ایمانی کرے۔ ﴿ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے: "اگرچہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہوا اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔" ﴾ ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پروش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جی بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی بچ بولتا جاتا ہے اور بچ بولتے ہو لئے وہ صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے ہو لئے وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔" ﴾

دل کی سچائی

صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے بچ کا ظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تھے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل بچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَسْتَهِدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَذِبُونَ ﴾ (٦٣) / المُنَافِقُونَ : ١)

"اور اللہ جتنا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔"

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی براہی سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہوا اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ "قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مدد پیش ہوں گے اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جان بازی کے کارنا نے بیان کرے گا، لیکن ان کارنا میں کوئی کرال اللہ کہے گا کہ تم جھوٹ بلکے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔" ﴾ یہ

صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات الایمان: ۳۲ و کتاب الادب، باب قول اللہ: یا بیہا الذین امنوا اتقو اللہ و کونوا مع الصادقین: ۶۰۹۵ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المُنَافِق: ۲۱۱۔

صحیح مسلم، ایضاً: ۲۱۳، ۲۱۴۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ایضاً: ۶۰۹۴۔

ترمذی، ابواب الزهد بباب الربیاء والسمعة: ۲۳۸۲۔

کارنا مے اگر چہ غلط بیان نہیں کیے گئے تھے، تاہم چونکہ ان میں اخلاق نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا، کہ ان کے ان کارناموں کی حقیقی غرض اللہ کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی، جس کا اللہ کے بیہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً: ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصد صرف نماش ہے، تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریا کا اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نماش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے، اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجیحی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر مخلص ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے زندگی پر ٹھہرے، اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرَتُكُمْ وَاجْهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

فِي سَيِّئِ اللَّهِ أَوْلَئِكُ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴾۱۵﴾ (الحجرات: ۱۵)

”مسلمان تو ہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ)

نہیں کیا اور اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔“

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ ان کا عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجیح ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا، عمل سے اس کی تصدیق کروی۔ اس صدق عمل کے کمی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے، اس میں کسی قسم کا ضعف و تردید بیکار ہو، مثلاً: ایک شخص احکام الہی کی تعلیم کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکنیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَوْلُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ تُخْلِمُهُمْ وَذَكَرَ فِيهَا الْقُتْبَانُ﴾

رَأَيْتُ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَتَظَرُّفُونَ إِلَيْكَ نَظَرًا مُغْنِيًّا عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَى

لَهُمْ طَاعَةٌ وَّكَوْلٌ مَعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْصَدَ قُوَّالَهُ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ﴾

(۴۷ / محمد: ۲۰-۲۱)

”اور سچ مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورہ اترتی ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہوتا (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو، تو ان پر تلف ہو، (رسول کی) فرمان برداری چاہیے اور صاف و سچ جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ اللہ سے سچ رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔“

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو، اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عمل اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، اللہ نے ان کو سچا کہا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن نصر رضی اللہ عنہ کو غزوہ بدربار میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان بازی کے جو ہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوہ احد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایسا یعنی عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهُ عَلَيْهِ فَيُنَهِّمُ مَنْ قَضَى نَجْهَةً وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا يَدْكُلُوا تَبْرِيًلا لِلْعَبْرِيِّ اللَّهُ الصَّدِيقُونَ بِصَدْقَهُمْ وَبِعِدَّبِ الْمُتَفَقِّنُونَ إِنْ شَاءَمْ أُوْتَوْبَ عَلَيْهِمْ طَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (۲۳/الاحزاب: ۲۴-۲۵)

”مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے (جان شاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے، (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو رو بدل نہیں کیا، تا کہ اللہ پھر ان کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزادے اگر چاہے یا ان کو معاف کر دے، ﴿ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر

بخاری، کتاب الجهاد، باب قول الله عزوجل: من المؤمنين رجال ...: ۴۷۸۳۔

یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرمادے۔

ارادہ اور عمل کی ہر جنیش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صداقت کہا ہے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا براہما اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں اللہ پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ آپ نے کہا کہ ”سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟“ بولے میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جا گا کرتا ہوں، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسار ہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واڈیا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ”تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو۔“ *

صحابہ کرام علیہم السلام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبوتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت خظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے، انہوں نے پوچھا، خظلہ کیا بات ہے؟ بولے: میں منافق ہو گیا، ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں، لیکن جب پڑھ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ ”اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔“ *

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا:

﴿كَلَّا لَوْتَعْمَوْنَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾ (١٠٢ / التکاثر: ٥)

”ہرگز نہیں اگر تم کو یقین علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے مقابلہ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا ذکر کرہے قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

«لَيْسَ الْبَيِّنَ أَنْ تُوَلُّوا وَجُوهَكُمْ فِيَّلِ الْمُشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبَيِّنَ مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلِكَةِ وَالْكِتَبِ وَالْيَقِينِ وَأَنَّ الْمَالَ عَلَىٰ حُكْمِهِ ذُوِّي الْقُرْبَىٰ وَالْيَاهِيَ وَالْمَسْكِينَ وَإِنَّ السَّمِيلَ لَا سَالِبِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَأَنَّ الرِّكْوَةَ وَالْمُؤْفُونَ يَعْهِدُهُمْ»

۱ اسد العابدة تذكرة حارث بن مالک، ج ۱، ص: ۳۴۶۔

۲ ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حدیث حضله ... ۲۵۱۴۔

إِذَا أَعْهَدُوا وَالظَّاهِرُ مِنْهُمْ أَنَّمَا يَأْتِي إِلَيْكُمْ مَا أَوْلَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا
وَأَوْلَئِكَ هُمُ الْمُنَكِّرُونَ ﴿٢﴾ (١٧٧/ البقرة)

”نیکی بھی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو، بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آختر اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور تیکیوں اور بختا جوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کر لیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور بیل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے، یہی لوگ ہیں جوچے نکلے اور یہی ہیں پر ہیز گار۔“

ان آئیوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے، ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں، اول ان کے ایمان کا کمال، دوسرا ان کے یک عمل اور تیسرا جانچ میں ان کا ہر طرح پورا ارتنا اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درج کمال کو پہنچ جاتے ہیں، ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدقیت کہتے ہیں ॥ جنوبت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے، چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدقیت کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم را ہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَمَّا الَّذِينَ آتَعْمَلُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ التَّقْبِيلِ
وَالصَّدِيقِينَ وَالشَّهِدَاءِ وَالظَّاهِرِينَ وَحَسْنَ أُولَئِكَ رَفِيقَاتٌ﴾ (٤/ النساء: ٦٩)

”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے، یعنی نبی اور صدقیت اور شہید اور (دوسرا) یک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اپنچھے سا تھی ہیں۔“

سورہ حدیث میں ایمان کا مل اور جانی و مالی جزا کی برابر دعوت کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ أَمْتُوا يَأْلِمُونَ وَرَسُلُهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّدِيقِينَ﴾ (٥٧/ الحدیث: ١٩)

”اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدقیت ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ صدقیقت اس کامل ایمان کے ذریعے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل بھی جدا نہیں ہو سکتا، یہ حدیث اور گزر چکی ہے کہ ”انسان بچ بولتے بولتے صدقیت ہو جاتا ہے“۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ بچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم ॥ الصَّدِيقُ الَّذِي يَصْدِقُ بِهِ بِالْعَمَلِ (مجمع البخار فتنی، ج ۳، ص: ۳۰۴) ”صدقیت دہ بے جس کے قول کی صدقیت عمل سے ہو“

رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست بازاور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشنی کے ساتھ دوسرا کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرا کے حوالہ کر دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرا کے حوالہ کر دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرا کے حوالہ کر دینا، دوسرا کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ اللہ نام رکھئے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گا کہ سخاوت اور فیاض کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا نشانہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورہ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقدی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک

یہ ہے:

﴿وَمِنَّا رَّزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ (۲/ البقرة: ۳)

”اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔“

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں، (تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور) بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی، کہ کیا وی گئی، پھر کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعریف نہیں کی گئی، اللہ نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو نہیں ملا، یا ضرورت سے کم کم ملا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے، اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقدیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔ *

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہو گا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ

* تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۸۰، تفسیر آیت مذکور۔

نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورہ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تائید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنادیا گیا ہے، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمًا لَا يَرَى فِيهِ وَلَا خَلَةٌ وَلَا

شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۲۵۴/ البقرۃ)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے کچھ خرچ کرو جو تم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کو وہ دن آئے جس میں نہ خریدتا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔“

اس آیت پاک کا آخری بکٹرا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس بکٹرے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے اللہ کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے، جو اللہ کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پر تاشیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں اللہ کی رحمت اور عذاب سے چھکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں، بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے اللہ کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن جبکی کام آنے والا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو خاوات کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا الہانداز بینا ہو، خود رسول کو فرمایا: ﴿وَلَا أَتَمْنُنْ شَتَّلِيُّونَ﴾ (۷۴/ المدثر: ۶) ”اور احسان نہ کر (احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلتے چاہے۔“ اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری اللہ دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ يُبَيِّقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَيِّئِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتَبِّعُونَ مَا آنَفُوا مَنَّا وَلَا أَذْغِي لِلَّهِمْ

آجُرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ﴾ (۶/ البقرۃ)

”جو اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الہاندازیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو دُور ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے مجاہئے نفس کی دنایت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْتَوْا أَنْفُقُوا مِنْ طَبِيعَتِ مَا كَسَبُوكُمْ وَمِمَّا أَخْرَجَنَ اللَّهُمَّ قِنَ الْأَرْضِ مِنْهَا تَعْمَلُوا الْخَيْرَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَكُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا كُمْ تُغْصَبُوا فِيهِ﴾ (٢٦٧: البقرة)

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بھی چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالانکہ تم اس کو لینے والے نہیں، مگر یہ کام کھاں کے لینے میں بھی لو۔“

مطلوب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا، جو ہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا، صاف فرمایا:

﴿لَكُنْ شَاءَ اللَّهُ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تَحْبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي إِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلَيْمٌ﴾

(٩٢: آل عمران: ٣)

”ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ جانتا ہے۔“

یعنی اللہ کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کامال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اور وہ سے چھپیں رہے تو چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جانے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام جو کچھ تم دیتے ہو اس کا لفظ بھی اوت کر تم، ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کے جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو، اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے، جس کے تم خوب بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا، فرمایا:

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُنْسِكُمْ ۖ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا إِنْتَعَآدُ وَجْهُ اللَّهِ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوفَى إِلَيْكُمْ وَإِنَّمَا لَا يُنْظَمُونَ﴾ (٢٧٢: البقرة)

”اور جو بھی تم نیکی سے خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔“

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا، وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُفَرِّضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُمُضِعَّفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً﴾

(٢٤٥: البقرة)

”کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گناہ کرے۔“

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَانًا فَيَضْعُفَ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَيْفُمْ﴾

(۱۱: ۵۷) الحدید

”کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اس کے واسطے دونا کرے اور ہے اس کے لیے عزت کی مزدوری۔“

آگے جل کر پھر فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُصَدِّقِينَ وَالْمُصَدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَانًا يَضْعُفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَيْفُمْ﴾

(۱۸: ۵۷) الحدید

”بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔“

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

﴿وَأَثْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَانًا﴾ (۲۰: المزمول)

”اور اللہ کو اچھا قرض دو۔“

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان و ہراجائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے اللہ نے جن باتوں کا عبد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی وہ رایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخري بات یہ ہے:

﴿وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَانًا﴾ (۵: المائدۃ)

”اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔“

تو ان باتوں کا تنبیہ یہ ہو گا کہ

﴿لَا يَغْرِيَ عَنْكُمْ سِيَّالٌ كُمْ وَلَا دُخْلَتُمْ جَنَّتٍ تَحْرِيْمٌ مِنْ تَحْرِيْمِ الْأَنْهَرِ﴾

(۵: المائدۃ)

”تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا، جس کے نیچے نہیں بہتی ہیں۔“

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدھی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کارخیر میں خرچ کرتے تھے، اللہ نے ان کی تعریف فرمائی:

﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَنَزَّلُ مَا يُفْقَدُ قُرُبَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَوَاتٍ الرَّسُولُ ط﴾ (۹۹/ التوبہ)

”اور بعضے بدھی ایسے ہیں، جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرج کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔“
اللہ نے ایسے تھی داناؤں کو خوشخبری دی:

﴿الَّذِاهَا فُرِيَةٌ لَهُمْ ط سَيْدُ خَلْقِهِمُ ط إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ط﴾

(۹۹/ التوبہ)

”ہاں! وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بے شک اللہ تختے والا ہمیان ہے۔“

تمقی خیوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے:

﴿وَسَاعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَّيْكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ لَهُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي الشَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ (۱۳۴-۱۳۳/ آل عمران)

”اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑ جس کا پھیلاو ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پر ہیز گاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرج کرتے ہیں۔“

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرج کی جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے، جس سے یہ اچنہجا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہو گا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَيِّئِ اللَّهِ كُمَثَلٌ حَسَنَاتُ أَبْيَاثَ سَيِّئَاتِ فِي كُلِّ سُنْنِ لَهُ مِائَةُ حَسَنَاتٍ حَسَنَاتٌ حَيْثُ ط وَاللَّهُ يُضِعِّفُ لِمَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ وَالسَّمَاءُ عَلَيْهِمْ ط﴾ (۲۶۱/ البقرہ)

”ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرج کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے، جس سے سات بالیں اگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھادیتا ہے اور اللہ کشاش والا ہے سب جانتا ہے۔“

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے جانتا ہے، ایسے ہی یہیں کا ایک بیچ ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، اللہ گنجائش اور کشاش وہا ہے، اس کے ہاں ایک کاسو بن جانا پچھلے مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی روکع کے آخر میں اللہ تعالیٰ ہے ان کی جو اللہ کی خوشنودی کے

لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے:

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ إِتْغَاءً مَرْضَاٰتِ اللَّهِ وَكَتْبِيَّاٰ قِنْ أَنْفُسِهِمْ كُمَّلَ حَسَنَاتُهُوَ بِرَبِّوَةٍ أَصَابَهَا وَالِّيْلُ فَأَكْثَرُ أَكْلُهَا ضَعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصْبِهَا وَالِّيْلُ فَطَلَّ وَاللَّهُ يَعْلَمُ عَمَلَكُوْنَ يَصِيرُوْنَ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پاک کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے جو کسی نیلہ پر ہو، اس پر یہنہ پڑا تو اس نے اپنا بچل دو گناہ یا اور اگر یہ نہیں پڑا تو اس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے“

اس مثال میں نیلہ کی اوچی صاحب زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور بچل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نبی سے بھی لہلہ اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو دیا جائے، وہ ایک کے بدله میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و داش اور جو دوستخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورہ والیل میں بیان کیا گما ہے، فرمایا:

﴿فَمَمَّا مَنْ أَعْطَى وَأَنْتَ لَهُ وَصَدَقَ بِالْأَحْسَانِي فَسَبِّيْرَةُ لِلْيُسْرَىٰ﴾ (۹۲/ الیل: ۵-۷)

”تو ہس نے (راہِ الہی میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔“

﴿وَسَيْجِنَهَا الْأَنْقَىٰ الَّذِي يُؤْتَ مَالَهُ يَنْتَزِلٌ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا

إِتْغَاءً وَجُلُورَةَ الْأَعْلَىٰ وَسُوْفَ يَرَطِيٰ﴾ (۹۲/ اللیل: ۱۷-۲۱)

”اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیز کا رہ چاہیا جائے گا، جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدله دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو بائے گا۔“

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ الہی میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت، یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یا اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسرا آیت کہتی ہے کہ ایسے متقد پر جو داد و داش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جو دوستخا کا سبب دنیاوی یا کسی کے احسان کا بدله اتنا نیا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو۔ بلکہ مقصود صرف اللہ ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا دامن دل پاک ہو جائے، تو اللہ بھی اس کے عمل کا دہ

بلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے، جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جود و حکما اور راد و داش کی برما لاطریف اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت ندامت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت بیشتر کے لیے جاتی رہے:

﴿وَيَنْهَا لِكُلِّ هُمَزَةٍ إِلَذِي جَمْعَ مَالًا وَعَدَدَةٍ لِيَسْبِبَ أَنَّ مَالَةَ أَخْلَدَةٍ﴾

(۱۰۳/ الہمزة: ۳)

”پہنچا کر ہو ہر غیبتوں کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر کر کھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدار کرے گی۔“

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:

﴿وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَهَنَّمَ﴾ (۲۰/ الفجر: ۸۹)

”اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو،“

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھوٹ جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسہ شیطانی کو اللہ نے انفاق (اللہ کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَا مَرْكُمُ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِمٌ عَلَيْهِمُ اللَّهُ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۸)

(۲۶۸/ البقرة: ۲)

”شیطان تم کو تھا جی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشاش والا ہے، جانے والا ہے۔“

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا خیز انسان اس وقت تک کسی کوئی بیس ملتاجب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اور پرواہی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

﴿يُؤْتَ الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُولَئِي خَيْرًا كَثِيرًا﴾

(۲۶۹/ البقرة: ۲)

”وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔“

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا، کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سر اسرد ہو کا ہے اور اللہ کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا، درست ہے، بہت بڑی دنائی کی بات ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا ترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالج سے بچاوے ہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگاتا ہے، جس کے پاؤں اس بازی میں خبر گئے وہی با مراد ہوا اور جس کے اکھر گئے وہ نامرا درہا:

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُ الْمُرْدَلِ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا أَسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفَقُوا خَيْرًا لَا كُفُورٌ۝ وَمَنْ يُوقَ شُحًّا نَفِيْهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلُحُونَ۝ إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُثْفِيْفُهُ لَكُمْ وَيَغْنِيْلُكُمْ۝ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ۝﴾

(١٥-١٧/التغابن)

”تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور ما نوا اور (راہ الہی) خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالج سے بچایا گیا ہی کامیاب ہیں، اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہنچاتا ہے اور (براہی کا بدلہ لینے میں) بربار ہے۔“

ان آئیوں میں اتفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی سمجھی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف، حرف مطابق ہے، قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی ور افراد میں بانٹتی رہیں، یعنی جماعت کے کاموں اور کمالی کے ناقابل یا کمالی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں، اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمہول کی برائیوں سے لوگ سچے رہیں گے اور بجل اور لالج کے سب سے اچھے کاموں کے کرنے سے بچا چایا کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں:

① میری چیز ہے، میں دوسروں کو کیوں دوں۔

② دوسروں کو دوں گا، تو میرے کی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہو گی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمه کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے

پیروں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میراث اکسی کا نہیں، وہ صرف اللہ کا ہے، وہی اس کا مالک اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے:

﴿وَمَا لِكُمْ أَن تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلِنٰئٰ مِيراثُ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ﴾

(۱۰/ الحدید: ۵۷)

”اور تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔“

بخل کی برائی میں کہا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَ الَّذِينَ يَنْجُلوْنَ بِهَا أَنَّهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرُ الْهُمَطِ بَلْ هُوَ شَرُّ الْهُمَطِ
سَيِّطُوطُقُونَ مَا يَنْجُلوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَلِنٰئٰ مِيراثُ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۸۰)

”اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں برائی، قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔“

ذر اذرا سے فرق سے قرآن پاک میں میمیوں جگہ یہ آیت ہے:

﴿وَلِنٰئٰ مَا فِي السَّمَوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۰۹)

”اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔“

اسی طرح میمیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ﴾ (۵۷/ الحدید: ۲)

”آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔“

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ ہونے پر کچھ جائیں، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہو گا، تردید کی، فرمایا:

﴿هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلٰى مَنْ يَعْدُ رَسُولُ اللّٰهِ حَتّٰلِ يَنْفَضِعُوا وَلِنٰئٰ خَرَائِينَ
السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِكُنَ الْمُنْفِقُونَ لَا يَقْتَهُونَ ۝﴾ (۶۳/ المنافقون: ۷)

”وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں ॥ اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن

﴿(یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔



منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔“

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی ملئی تھیم کی کل چل رہی ہے، ان کے بل بوتے سے ہے، اللہ نے فرمایا، یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسراے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:

﴿لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِيرُ ۖ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (۱۲/ الشوریٰ)

”اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کیلئے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔“

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے میں انسان کی قافتہ پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا:

﴿فَإِنَّمَا الْإِنْسَانَ إِذَا مَا أَبْتَلَهُ رِبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَعَنِّهِ فَيَقُولُ رَبِّيَ الْأَكْرَمُ مِنِّي ۚ وَأَنَّمَا إِذَا مَا

أَبْتَلَهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَيَقُولُ رَبِّيَ آهَاهَيْنِ ۚ﴾ (۱۶-۱۵: الفجر)

”سوآدی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچ پڑھا سکتا ہے اور عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچ پڑھتا ہے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔“

غرض روزی کی کشاکش اور تنگی دونوں اللہ کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں، دولت مندان انسان یہ سمجھتا ہے کہ بھیجی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا بھیجی کو کوئی ایسا ہریا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف کمٹی آ رہی ہے، نہ ہبھی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ اور درد کھینچتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

﴿فَإِذَا مَسَ الْإِنْسَانُ ضُرًّا دَعَانَا ۗ ثُمَّ إِذَا أَخْوَلَهُ نَعْمَةً فَمَا لَقَ إِلَّا مَا أَوْتَنَا ۗ كُلُّ عَلِيُّوْبَنْ هَيَ فِتْنَةٌ ۗ وَلَكِنَّ الْأَكْرَهُمْ لَا يَعْمَلُونَ ۚ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهُمَا أَغْلَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۚ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا كَسْبُوا ۖ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هُؤُلَاءِ عَسِيَّهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا كَسْبُوا ۖ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ۚ أَوْ لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِيرُ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۚ﴾ (۳۹/ الزمر: ۴۹-۵۲)

”سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آگئے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف اس کو کوئی نعمت دیں تو کہہ کر یہ تو مجھے علم پر ملا ہے، ﴿اللہ فرماتا ہے﴾ بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہیں بات ان کے پہلوں نے کہی تھی، ﴿تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی اور جو کما یا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گناہگار ہیں، ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھا کہ انہیں سکتے، کیا ان کو خیر نہیں کہ اللہ ہر روزی جس کے لیے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے، (اور جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔“

ہرجاندار کی روزی اللہ کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يُرْزُقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقْرِرَهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلُّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (۱۱ / هود: ۶)

”اوہ کوئی چلنے والا نہیں زمین میں، مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اس کو کھہرنا ہے، (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔“

دوسری یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کوں جاتا ہے، وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا، اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیروں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جو ہر پیدا کرنے کے لیے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے:

﴿وَمَنْ يَرْزُقُ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ طَعَالَهُ مَعَ اللَّهِ﴾ (۲۷ / النمل: ۶۴)

”اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی اور اللہ بھی ہے۔“

روزی دینا اسی کا کام ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَاقُ دُوَّالْقُوَّةُ الْمُبِينُ﴾ (۵۸ / الذاریت: ۵۱)

”بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زر آور، مضمبوط۔“

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے،

۱۔ اس کا ایک مطلب قارون تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے بزر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورہ قصص میں قارون کے قصد والی آیت سے ہوتی ہے (دکھنوو معانی، ج ۲۴، ص: ۱۱)۔

۲۔ چنانچہ قارون کو جرہ راہ الہی میں خرچ کرنے کی صحیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا، ﴿قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُ عَلَيْ إِلْعَمٍ عِنِّي﴾ (القصص: ۲۸) ”قارون نے کہا: یہ دولت تو مجھے ایک ہر سے ملی ہے، جو ہمیرے پاس ہے۔“

فرمایا: ”تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا۔“ * یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو منہ دو گے، تو اللہ بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا۔“ ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا: ”تم میں سے کس کو اپنے ماں سے اپنے دارثوں کا ماں زیادہ پیارا ہے؟“ لوگوں نے کہا، ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے ماں سے اپنے دارثوں کا ماں زیادہ پیارا ہے، فرمایا: ”تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔“ * ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک میں یہ آیت پڑھی ﴿أَلْهٰكُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۱۰۲ / التکاثر: ۱) ”تم کو مال دو لوت کا اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا۔“ پھر فرمایا: ”آدم کے بیٹیے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا ماں امیر اماں! اور تیرا ماں تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلا یا کھالیا تو اس کو فنا کرچکا اور پہنچا تو اس کو پرانا کرچکا۔“ *

فرمایا: ”اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احمد پہاڑ برابر سونا ہو اور تیرے دن تک اس میں سے ایک اشرفتی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو اللہ کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے باہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔“ پھر فرمایا: ”ہاں جن کے پاس بیہاں زیادہ ہے، ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہو گا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے باہنے بائیں، آگے پیچھے بانٹ دو۔“ *

فرمایا: ”رٹک دو، ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق تمارہا ہے اور سکھارہا ہے۔“ *

اس حدیث کے پہلے لکھرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دنیا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اس رافع اور فضول خرچی ہے، جس کی برابی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی مشاوت نہیں کہ کوئی عمر بھرا پنی دولت کو اپنے لکھج سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو تھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے لبی کا نظارہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

-
- ❶ صحيح مسلم ، كتاب الزكاة ، باب الحث على الانفاق: ۲۲۷۶۔ * صحيح بخارى ، كتاب الرفاق ، باب ما قدم من ماله فهو له: ۶۴۴۲۔ * جامع ترمذی ، أبواب التفسیر ، باب ومن سورة الهاكم التكاثر: ۳۳۵۴۔ حديث حسن صحيح۔ * صحيح بخارى ، كتاب الرفاق ، باب قول النبي ﷺ: ما يسرنى ان عندي: ۶۴۴۴۔
 - ❷ صحيح بخارى ، كتاب العلم ، باب الاغتاباط فى العلم والحكمة: ۷۳۔

﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدًا مِنَ الْمَوْتَ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخْرَجْتَنِي إِلَىٰ
آجَلِ قَرِيبٍ لَا يَقْدِرُ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (٦٣/ المنافقون: ٦٣)

”اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو
موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک! تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں
خیرات کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔“

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَلَكُنْ يُبَوِّخَ حَرَثَ اللَّهِ نَفْسًا إِذَا جَاءَكُمْ أَجَلُهَاۤ وَاللَّهُ خَيْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (٦٤/ المنافقون: ٦٤)

(٦٣/ المنافقون: ٦٣)

”اور اللہ بہرگز کسی کو مہلات اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے
ہو۔“

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ
سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: ”یہ کہ تم صدقہ کرو اور تم تدرست ہو، مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم
اس پر ذہیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تواب
(تمہارے بعد) فلاں کا ہوئی چکا۔“ ﴿

فرمایا: ”اے آدم کے بیٹے! تیر ادینا تیرے لیے بہتر اور تیر کو چھوڑنا تیرے لیے بُرا ہے۔“ ﴿

● صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان افضل الصدقة: ٢٣٨٢ -
● ايضاً، باب بیان ان الید العليا: ٢٣٨٨ -

عِفْتٌ وَپَاکِبازیٰ

عِفتٌ وَپَاکِبازیٰ ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی حاضر میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورہ مومنوں میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجٍ حَمِيمٍ إِلَّا عَلٰى آذُونَجِهِمْ وَمَا مَلَكُتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مُكْلُومِينَ﴾ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَأَءَى ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ﴾ۚ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۷-۵)

”اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیوبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیشوں) سے، تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گارہوں، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔“

سورہ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان میں ایک عِفت اور پَاکِبازی بھی ہے، فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجٍ حَمِيمٍ﴾ (۷۰ / المعارض: ۲۹)

”اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔“

جن مسلمانوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور برداشت کا وعدہ کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں، جو عیف اور پَاکِ دامن ہیں:

﴿وَالْحَفِظِينَ فِرْوَجَهُمْ وَالْحِفَظِيْتِ﴾ (۳۳ / الاحزاب: ۳۵)

”اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔“

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہو گا کہ عِفت اور پَاکِ دامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ”حفظ فروج“ ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں، جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے معنی میں بالکل ہی بے پرده ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے نیچے میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پھرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہو گا کہ عِفت و پَاکِبازی کا جو تخلیق ان لفظوں کے اندر پہنچت ہے، وہ کتنا گہرہ اور کتنا بلند ہے۔

عِفت و پَاکِبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ احسان ہے، جو حسن سے بنتا ہے، جس کے معنی قلعہ یا

محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حصان، احصان، مُحْصَن اور مُحْصَن (الحافظ بناءً گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، بلکہ عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاک و امن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے، یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم (علیہ السلام) کی عصمت و پاک و امنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیدہ میں:

﴿وَمَرِيمَةَ ابْنَتِ عَمِّنَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرِجَاهَا﴾ (۱۲/ التحریم)

”او عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو حفاظت کر کھا۔“

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرِجَاهَا فَنَفَخْتَاهَا فِيهَا مِنْ رُوْحِنَا﴾ (۹۱/ الانبیاء)

”اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو حفاظت کر کھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھوکی۔“

تیسرا جگہ مااضی محبول کا صیدہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہرنے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بد کاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا:

﴿فَإِذَا أَحْصَنَ﴾ (۴/ النساء: ۲۵)

”توجب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔“

اسی سے اس کا فاعل مُحْصَن (حافظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنہ (حافظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

﴿فُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ﴾ (۴/ النساء: ۲۴)

”حافظت میں لانے والے نہ مسٹی نکالنے والے۔“

﴿مُحْصَنِتِ غَيْرَ مُسْلِحَتِ﴾ (۴/ النساء: ۲۵)

”حافظت میں آنے والیاں نہ مسٹی نکالنے والیاں۔“

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لا یا جائے، صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنہ (حافظت میں رکھی ہوئی بیباں) دو معنوں میں آیا ہے، ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

﴿وَالْمُحْصَنَتُ مِنَ الْيَسَاءِ﴾ (۴/ النساء: ۲۴)

”اور بیاہی عورتیں، (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔“

دوسرے شریف آزادی بیویوں کے معنی میں جیسے:

﴿وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْهُمْ طَوَّلَ أَنْ يَتَكَبَّرَ الْمُحْصَنَاتُ الْمُؤْمِنَاتُ﴾ (۴/ النساء: ۲۵)

”اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو، (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔“

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور حماورہ بھی استعمال کیا ہے:

﴿حَفِظْتُ لِلْغَيْبِ﴾ (۴ / النساء: ۳۴)

”پیغمبر پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔“

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جزو ہے، نبی، نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے بہیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم علیہ السلام کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دانی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی:

﴿وَمَرِيمَةً ابْنَتَ عَمْنَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرِجَاهَا﴾ (۶۶: التحریم: ۱۲)

”اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔“

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرِجَاهَا فَنَكَفَنَّا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا﴾ (۹۱: الانبیاء: ۲۱)

”اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونگی۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی:

﴿وَلَقَدْ رَأَوْدَتْهُ عَنْ نَفْسِهِ فَأَسْتَعْصَمَ﴾ (۳۲: یوسف: ۱۲)

”اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔“

اللہ نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا:

﴿إِنَّصِرِيفَ عَنْهُ السُّوءِ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْحَلَّاصِينَ ﴾ (۲۴: یوسف: ۱۲)

”تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شہہ ہمارے پنے بندوں میں تھا۔“

معلوم ہوا کہ خدا کے پنے ہوئے اور برگزیدہ بندے افسی بے حیائی کی بانوں سے پاک رکھے جاتے

ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا گیا:

﴿وَسَيِّئَاتُ أَوْحَصُورُوا وَنَيِّئَاتُ أَمْنَ الصَّلَحِيْمِ ﴾ (۳: آل عمران: ۳۹)

”اور سردار ہو گا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہو گا اور نبی ہو گا صالحوں میں سے۔“

اسلام میں اہل بیت نبوی ﷺ کی زندگی، جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی، غیب کے

دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

﴿أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَا هُمْ مَعْفَرَةٌ وَرَدُّقٌ كَرِيمٌ﴾ (۲۴ / النور: ۲۶)

”یہ لوگ تہت سے پاک ہیں، ان کے لیے بخشناس ہے اور عزت والی روزی۔“

عفت و پاک دامنی کے خلاف کاظم قرآن کی زبان میں فَسَاحَشَةً آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے

﴿إِلَآ أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَالْحَشَةِ مُبَيِّنَةً﴾ (۴ / النساء: ۱۹)

”مگر یہ کوہ عورتوں کھلی برائی کریں۔“

﴿وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاجِهَةَ مِنْ تَسَلِّكُمْ﴾ (۴ / النساء: ۱۵)

”اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔“

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

﴿وَلَا تَقْرِبُوا إِلَيْنَا إِنَّهُمْ كَانُوا فَاجِهَةً وَسَاءَتْ سَيْلًا﴾ (بینی اسرائیل: ۳۲)

”اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی برائی اور رُأْچلن ہے۔“

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے، وہ بلا غلت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ”تم زنا کرنا“ بلکہ یہ کہا کہ ”تم زنا کے قریب نہ جانا“۔ اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد، ہی سے بخشنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بد کاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر حرم کی طرف لپھائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تہائی میں ملنا جانا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آدمورفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریانہ حركات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراہ منانی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بد کاری کی تقریب اور تمہید ہیں، حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں بند رکھیں:

﴿قُلْ لِلّٰمُؤْمِنِينَ يَعْصُمُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْلَى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَيْرٌ لِمَن يَصْنَعُونَ﴾ (۲۴ / النور: ۲۰)

”اے پیغمبر علیہ السلام! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں بند رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بڑی سحری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔“

• اس کا یہ نشانہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے تو اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں، مثلاً: یہ کہہ بھی نکایں پنجی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناو سنگارنے کھائیں، اپنے زیوروں کی جھکار کسی کو نہ سنا کیں، اسی لیے زمین پر ہولے چلیں، یا جھکار کے زیور نہ پہنسیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چارڈاں کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوبصورہ ملیں، پنج راستے سے کتر اکر کنارہ کنارہ پر چلیں، مرد اور عورت راستے میں باشیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر زیستیں، کسی سے کوئی تہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باشیں درحقیقت (لَا تَقْرُبُوا الزَّنِي) زنا کے قریب بھی نہ ہو کی شرح ہیں، فرمایا:

﴿وَقُلْ لِلّٰمُؤْمِنِتِ يَعْضُضُنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظُنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبَدِّلْنَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا

ظَّهَرَ مِنْهَا وَلِيُضْرِبُنَ بِخُمُرِهِنَ عَلَى جُبُونِهِنَّ وَلَا يُبَدِّلْنَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِيُعَوِّلْهُنَّ أَوْ

أَبَاءِهِنَّ أَوْ أَبَاءَءِ بُعُودَهُنَّ أَوْ أَبَاءَنَّ أَوْ أَبَاءَءِ بُعُودَهُنَّ أَوْ إِخْوَانَهُنَّ أَوْ بَنِيَ إِخْوَانَهُنَّ أَوْ

بَنِيَ إِخْوَانَهُنَّ أَوْ نِسَاءَهُنَّ أَوْ مَا مَلَكْتُ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّيْعِينَ غَيْرُ أُولِي الْأَرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ

أَوِ الظَّفَلُ الَّذِينَ لَمْ يَظْهِرُوا عَلَى عَوْرَتِ النِّسَاءِ وَلَا يُضْرِبُنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ

مِنْ زِينَتِهِنَّ طَوْبِيْوَا إِلَى اللَّهِ حِجَّيَا أَيُّهُ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تَفَهُّمُونَ ﴾۵﴾ (۲۴ / النور: ۳۱)

”اور اے پیغمبر علی سلام! ایمان والی بیویوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا پنجی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناو سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے ॥ اور اپنی اوڑھنی اپنے گریانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگارنے کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھانجبوں، یا اپنے عورتوں، یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں، یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں، اس کا پتہ لگ جائے اور تم سبل کرائے مسلمانو! اللہ کے آگے قوہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔“ اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لیے اس میں پیروی کا نمونہ ہے:

﴿يَنِسَاءَ التَّيْيَى لَسْتَنَ كَأَحِيدَ مِنَ النِّسَاءِ إِنَّ اتَّقِيَّنَ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَمَ الَّذِي فِي

قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا وَقُرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْ جَنَ تَبَرَّجْ الْأَهْلِيَّةِ الْأُولَى﴾

(۳۲-۳۲ / الحزاب: ۳۲)

• جیسے آنکھوں کا سرس، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ، تحلیلیاں اور قدم ستر میں دھل نہیں۔

• یعنی سہیلیاں اور خادماں میں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی، جزء ثامن عشر، ص: ۱۲۹)۔

”اے پیغمبر ﷺ کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت، الگ تم (اللہ کا) ذر رکھو، سوت دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے، وہ خواہش کرے، اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔“

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بَيْوَقَاتِ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ﴾ (۵۳/الاحزاب)

”اے ایمان والوں نبی کے گھروں میں اس کے بدلوں کتم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) واپس نہ ہو۔“

گویا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا مشانی ﷺ کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورہ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بَيْوَقَاتِ غَيْرِ بَيْوَقَاتِمْ حَتَّىٰ سَتَأْنُسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَاٗ طَلِيكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَا عَلَيْكُمْ تَرْكُونَ ۝﴾ (۲۴/النور)

”اے ایمان والوں تم اپنے گھروں کے سوا وسرے گھروں میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کرو اور ان گھروں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں، شاید تم یاد رکھو۔“

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنا نامکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پرده کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑ اکر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانہ بنوی ﷺ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلُوكُمْ هُنَّ مَتَّاعًا فَسُنُّوْهُنَّ مِنْ وَرَاءِ بَحَارٍ طَهَرٌ لِّقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ طَهَرٌ﴾ (۵۳/الاحزاب)

”اور جب تم مانگنے جاؤں یہ بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پرده کی اوٹ سے، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی سحرائی ہے۔“

یہ حکم گوشان نزول کے لحاظ سے از واج مطہرات ﷺ کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں، تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتیوں کی آنکھوں سے اوچھل رہے اور یہ بچاں ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں، ان کو چھیڑتا تو کجا ان کی طرف نظر پھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا:

● یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواباں ہو۔

● التبریخ: اظہار والزینہ للنکاس الاجانب (السان العرب، ج ۱، ص: ۱۸۵)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِي قَلْنَ لِإِرْزَاقِكَ وَبَنَتِكَ وَنِسَاءُ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَانِهِنَّ﴾
 ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفَ فَلَا يُوْدِيْنَ طَوْكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا لَّئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُفْقُونَ
 وَالَّذِيْنَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالرُّجُفُونَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَغَرِيْبَكَ بِهِمْ تُمَّ لَّا يُجَارُ وَنَكَ فِيْهَا
 إِلَّا قَيْلَلًا﴾ (٦٠-٦١) (الاحزاب: ٣٣)

”اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کے اپنے اوپر تھوڑی سے اپنی چادریں پہنچائیں، اس سے یہ ہو گا کہ وہ پیچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا ہم بان ہے، اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں، تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پا جائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔“

ان آئیوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے، جو مسلمان بیویوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیرتے تھے اور جب انہیں اس پر ڈالنا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لوڈی سمجھتے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیے، شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آ جائیں تو انہی کافی سزا دی جائے، بلکہ ان کو شہر بدر کیا جاسکتا ہے اور مسلمان بیویوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشش و وضع الگ رکھیں، اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھروں سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیباں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لوڈیوں سے عصمت فروش کا کام لیا جاتا تھا، اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنی لوڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا سمجھنے کا لامانا نہیں کرتے تھیں، بد کار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح

❶ تفسیر طبری، تفسیر سورہ نور، ج ۱۸، ص: ۹۳ مصر و سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی تعظیم الزنا: ۲۳۱۱۔ ❷ سید معلقت میں طرف کے قہیدے کا شعر پڑھئے

رجیب قطاب الحیب منها رقیة بحسن الند امنی بضعة المتجرد

(شرح المعلقات السبع، مطبوعہ دار الكتب العربية مصر، ص: ۵۸)

کی، بدکاری کے انسداد اور عرفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بذریعین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فِتْيَكُمْ عَلَى الْإِعْلَامِ إِنَّ أَرْدَنْ تَعْصِمَنَا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا طَوْفَةً وَمَنْ يُكِرِهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (۲۴ / النور: ۳۳)

”اور تمہاری لوٹدیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کروایا کرو اور جوان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچے الشنجشے والارحم فرمانے والا ہے۔“

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کہانیوں میں سے قرار دیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھائیں سمجھا ہے کہ اسی پیشہ و عورتوں کو توہہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہواز ہر آسودہ وجہتی، سنن ابی داؤد [ؓ] میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ و عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی، وحی الہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

﴿الرَّأْنِ لَا يَكِحُ الْأَذَانِيَةُ أَوْ مُشْرِكَةُ وَالرَّأْنِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَازَانِ أَوْ مُشْرِكَ وَحُرْمَةُ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۲۴ / النور: ۳)

”بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکدار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گی، ایمان والوں پر یہ حرام تھی برا یا گیا ہے۔“

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے، کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے، اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

﴿الْخَيْثَاتُ لِلْخَيْثِينَ وَالْخَيْثَيْنَ لِلْخَيْثِينَ وَالظَّبَابُ لِلظَّبَابِينَ وَالظَّبَابِيْنَ لِلظَّبَابِيْتِ﴾ (۲۶ / النور: ۲)

”گندی عورتیں، گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔“

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عنینہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں، [ؓ] اور ان کی دلیل سورہ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو ابو داؤد اور الحسن بن ثابت سے روایت کیا ہے، ابو ہریرہ ^{رض} کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کیا ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بیدہ ہے کوہاں سوں سے نکاح کریں یا (بقیہ حاشیاں گلے غیر پر [ؓ])

[ؓ] صحيح سالم، کتاب المساقاة، باب تحریم ثمن الكلب، وحلوان الکاهن ومهر البغی ۴۰۹ تا ۱۴۰۹۔

[ؓ] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی قوله: الرَّأْنِ لَا يَنْكِحُ ۲۰۵۱۔ [ؓ] جہور کے نزدیک رازی نے، یازانیہ کا نیمر رازی سے تا نونا نکاح درست ہے لیکن اخلاق اپنے بہرے کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جور مت بظاہر بھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بیدہ ہے کوہاں سوں سے نکاح کریں یا (بقیہ حاشیاں گلے غیر پر [ؓ])

نے فرمایا: ”جس پر زنا ثابت ہوا اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہواں کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔“ * غرض اہل ایمان جن کی شان سترائی اور پاک بازی ہے، ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورہ فرقان میں اللہ نے جن کو اپنا خاص بنہد کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں، جو اللہ کر اتھم کر، اور کوش کر نہیں کر تر، حکم کر اخراج نہیں کرنا۔ تر اور حکم کارہ کا نہیں کر تر فرماتا:

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ أَهْلًا أَخْرَجَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفَسَاتِ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا لِحَقٍّ وَلَا

٦٨ / الف قان: ٢٥

”اور جو اللہ برحق کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کا جس کو اللہ نے منع کیا سے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔“

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں، ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بد کاری کے اسباب اور ذریعوں کے انداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اور آیا ہے اور جو حقیقت میں «لاتقربوا الزنى» بد کاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا: ”کسی غیر حرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسرا دفعہ پھر اس پر نظرِ البار و انہیں۔“ ﴿ حضرت عائشہؓؑ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓؑ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا: ”اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں۔“ ﴿ حکم دیا کہ مختلط زنان خانوں میں نہ جانے پائیں، ﴿ فرمایا: ”کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پرده اٹھا کر اس کے اندر رہ جھاگلو کہ اس کے

(۱۰) گرستہ سے پوتے) «أَلْبَعُوا الْيَافِيَ مَنْكُمْ» (۲۴/النور:۳۲) اور «فَإِذَا كُوِّمَ مَا طَابَ لَكُمْ فِي النَّيَّارِ» (۴/النَّاسَ:۳) سے منون ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عقیف عورت سے اور عقیف مرد کا بادکا عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوهر میں سے کوئی اس برائی کا مرتكب ہو تو قاضی نکاح کو فتح کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓؒ نے یعنی اپنے زمانہ میں یہ فیصلہ کیا، (روح المعانی، ج ۱، ص ۱۸) ابو داؤد (كتاب النکاح: ۲۰۵۱) کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوئی ہے لہجہ فتح نکاح نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوهر میں کتفو ہونا شرط ہے اور چونکہ عقیف بد کار کا کفوبنیں ہو سکتا، اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عقیف ہے اس کے اعتراض کے بعد عاقم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے تو بے شک ہو، تو کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن، ج ۳، ص ۲۵۵، ۲۶۶، ۲۶۷ و حاصہ ار رازی و تفسیر احمد یہ میٹا جیون و تفسیر بیہر رازی و ج ۲، ص ۲۸۷ و بعد یہا مخفف تفسیر ابن حجر العسکر، تفسیر ایت مذکورہ، ج ۱، ص ۲۷۶)۔ ٭ ابو داؤد، کتاب النکاح، باب فوعلہ: الزانی لا ينكح الا زانية: ۲۰۵۲؛ احمد: ۲، ۳۲۴۔ ٭ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ماجاء بباب فی قوله: الزانی لا ينكح الا زانية: ۲۷۷۶۔ ٭ ابو داؤد، کتاب اللباس، باب فی ماتبدي المرأة من زيتها: ۴۱۰؛

اہل خانہ کی بے ستری ہو۔» * فرمایا کہ ”عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکل۔“ * سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ ”عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے۔“ * تا کہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکہ فرمائی کہ ”کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلانہ جائے۔“ * کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا رہے ہو اور کوئی اندر گھس گیا، تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ *

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔ لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کہ بلکہ ان کے لیے جو سماں کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی برقرار نے پر مجبور کرے:

﴿الْإِنْذِيْنَةُ وَالَّاِنْذِيْنَ فَاجْلِدُو اُكْلَ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مَا تَهَدَّى جَلَدَةً﴾

(٢٤) / النور

”بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سوکوڑے لے گاؤ۔“

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں (یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے، ان میں ایک بھی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا:

﴿وَلَا يَنْزَهُنَّ وَلَا يُقْتَلُنَّ أَوْلَادُهُنَّ وَلَا يَأْتُنَّ بِيَهْتَانٍ يَقْتَلُنَّ بَنِيَّنَ أَيْدُنَّ بَنِيَّنَ وَأَرْجُلُهُنَّ﴾

(٦٠) / الممتحنة

”اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مارڈا کریں گی اور نہ اپنے باتوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔“

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مارڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجائب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی

١- ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في الاستئذان قبلة البيت: ٢٧٠٧۔

٢- ابو داود، کتاب الترجل، باب في طيب المرأة للخروج: ٤١٧٣ تا ٤١٧٥۔

٣- ابو داود، کتاب الادب باب في مشي النساء مع الرجال في الطريق: ٥٢٧٢۔

٤- مسلم، کتاب السلام، باب تحريم الخلوة بالاجنبية والدخول عليها: ٥٦٧٧ تا ٥٦٧٣۔

٥- ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في الاستئذان قبلة البيت: ٢٧٠٧۔

طرف اشارہ ہو، یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو اور ہاتھ پاؤں کے نجی میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کی کمی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرا کے بچوں کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں غفت اور پاک دائمی کے خلاف تھیں، اس لیے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی یوں یوں سے، اور مدینہ میں انصاری عورتوں سے بھی اس پر عہد لیا، بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔ دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الازم لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر نہ پیش کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے چھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہو گی اور اگر یہ الازم خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الازم غلط ہے اور اگر دونوں اپنے عووں پر قائم رہیں، تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے عومنی کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑا لالا ہے۔

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تفصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں تفصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناقص جان لینا ہے اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاک باز کے پرده کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ ”تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا۔“ بولے، اس کے بعد؟ فرمایا: ”یہ کہ اپنے پڑوی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کیلئے آیت نازل فرمائی: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَذِّلُّونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا أَخْرَى وَلَا يَقْتَلُونَ النَّفْسَ إِلَّيْ حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَكْرِهُونَ﴾ (الفرقان: ۶۸)

۱) غیرین میں صاحب روح العالیٰ کا بھی اور ذیال گزرابے۔ (ج: ۲۸، ص: ۷۰) ۲) صحیح بخاری، کتاب المعازی، فتح مکہ اس باب میں یہ روایت نہیں ملی، البته یہ غرہ الحدیثیہ: ۲۸۲ کی روایت سے یہ بات ثابت ہے۔

۳) تفسیر طبری، سورہ الممتحنة، ج: ۲۸، ص: ۴۹۔

۴) صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸۔

۵) اس کی تفصیل سورہ نور میں ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا نوث جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل درآمد اسی پر رہا ہے، بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعن: ۵۳۰۸، ۵۳۰۹۔ ۶) بخاری، کتاب الادب، باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل: ۶۰۰۱۔

”اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرا معمود کونہ پکاریں اور نا حق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو اللہ نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتكب ہوں۔“

حدیث میں اپنے لڑکے کے مارڈائلے اور پڑوی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حدود جم شرم کے قبل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی، ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتناد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پینتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا۔“ ۱ کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور اللہ پر اور اللہ کے احکام پر یقین رکھ کر اس کے حکم سے سرتاسری نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ محروم کے ایمان کا چراغِ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جانے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو (۱۰۰) کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگار کرنا ہے، لیکن ان کوآ خرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحاںی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعلِ تعقیج کے مشابہ یہی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا، جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور یونچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے یونچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہمنہ مردا اور برہمنہ عورتیں تھیں، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے، ۲ یہ عالم بزرخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ ”قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا، جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہہ کر انکا کر کر دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔“ ۳

یقودہ شرف ہے جو پاک بازوں کوآ خرت میں حاصل ہوگا، لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا تھہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعتہ پانی بر سنے لگا تینوں نے پانی سے پانی کے پیچے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوئے اتفاق

۱ بخاری، کتاب الحدود، باب الزنا و شرب الخمر: ۶۷۷۲۔ ۲ بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶۔

۳ بخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش: ۶۸۰۶۔

سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوانح تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالح کے واسطہ سے اللہ سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاک باز آدمی کی دعا یہ تھی: ”خداوند امیری ایک پچاڑ اُتھی جس سے میں بہت محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سود بینارندہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سود بینار کما کر جمع کیے اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، میں فوراً کر گیا، اللہ تعالیٰ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹائے، چنانچہ وہ سرک گیا۔“ * یہ روایت عقفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے، جن سے اللہ کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

* بخاری، کتاب الادب، باب اجابة دعاء من بروالديه: ۵۹۷۴۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو خلاقی جوہر، مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کار و بار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا حق ہوا س کو پوری دیانت سے رتی دے دے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأُمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجَبَالِ فَأَكَبَّنَ أُنَّ يَحْمِلُهَا وَأَشْفَقُنَ مِنْهَا وَحَمِلَهَا الْإِنْسَانُ طَائِهٌ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (۷۲) (الاحزاب: ۳۳)

”ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم اور نادال ہے۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک الہی امانت ہے، جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

اللہ کا فرشتہ جو اللہ کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندوں کے لیے جو حکم اللہ کی جانب سے آئے وہ کسی ویشی کے بغیر اللہ کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ”الامین“ رکھا گیا ہے:

﴿نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (۲۶) (الشعراء: ۱۹۳)

”اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔“

﴿مُطَاعَ ثَمَّ أَمِينُ﴾ (۲۱) (التکویر: ۸۱)

”اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں امانت والا ہے۔“

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امانت سے یہ کہا:

﴿إِنَّ الْكَمْرَ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾ (۲۶) (الشعراء: ۱۷۸)

”میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔“

یعنی اللہ سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم دکاست تم کو پہنچا تا ہوں، اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ سکھنہ میں ہے۔

ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے کہ والوں کی طرف سے ”امین“ کا خطاب ملا تھا، کیونکہ

آپ ﷺ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لَا يُفْلِتُونَ وَعَاهِدُهُمْ رَبُّهُمْ رَعُونَ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۸)

”اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔“

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبد الدار شیعی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اس کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤْتُوا الْأَمْمَةَ إِلَيْهِمَا﴾ (۴ / النساء: ۵۸)

”بے شرط تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔“

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی، انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ ❶ بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہو گا، اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الہی بھی داخل ہے، جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے، ❷ اور وہ امانت بھی داخل ہے، جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو، داکرنے پر مجبور کرتا ہے، ❸ اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے پر درکرنا ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ امانت کا دائرة صرف روپے پیسے، جائد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے، تو اس کے مالگئے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے، تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محمد و رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بنانا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنی کسی کنجی کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے

❶ تفسیر کشاف زمخشری، ج ۱، ص: ۲۹۷۔ ❷ ایضاً

❸ تفسیر ابن جویر طبری، ج ۵، ص: ۸۶، تفسیر آیت بالا۔

اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرایتا ہے، یا بے سب سستی کرتا ہے، یاد یہ سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاخ پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

«وَالَّذِينَ هُمْ لَا أَفْتَنُونَ وَعَاهَدُهُمُ رَبُّهُمْ رَغْوُنَ۝» (٢٣ / المؤمنون: ٨)

”اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔“

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے۔ ان میں بھی وہ داخل ہیں:

«وَالَّذِينَ هُمْ لَا أَفْتَنُونَ وَعَاهَدُهُمُ رَبُّهُمْ رَغْوُنَ۝» (٧٠ / المعارج: ٣٢)

”اور جو (اپنی) امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔“

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گروئی رکھی:

«فَلَيَوْكُدَ الَّذِي أُتْبِعَنَ أَمَانَتَهُ وَلَيُتَقَبَّلَ اللَّهُ رَبُّكَطَ» (٢ / البقرة: ٢٨٣)

”تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ذرے۔“

یعنی لے کر کرناہ جائے، یاد یہی میں جیلے جو اے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہا نہیں چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملائی ہے:

«وَتَخَوَّلُو أَمْنِيَّتُكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۝» (٨ / الانفال: ٢٧)

”اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دو لڑکوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی اور ان لڑکوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے تو اسی موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے:

«يَا أَيُّوبَ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنْ اسْتَأْجِرَتِ الْقَوْيُ الْأَمِينُ۝» (٢٦ / القصص: ٢٨)

”اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔“

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنائے جس کو جس

کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی الیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سمتی سے چھپے چوری بے کار بیخار ہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دورس نگاہوں میں وہ امین نہیں تھا سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے گرے حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔ حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گناہیا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھئے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھے چکا، دوسرا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے، (یعنی ان کی نظرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن سے جانا، کچھ سنت سے سیکھا۔“ (یعنی فطری امانت کے جو ہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہے) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا فرمایا: ”پھر یہ حال ہو گا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلاکسانشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلد کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لیں دین کریں گے، لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا، اس وقت امانت داری کی مثال ایسی کمیاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہو گئی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔“ *

حدیث کے پہلے مکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جو ہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جو ہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے، آخزمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلد کا داغ رہ جائے۔

طریقی کبیر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں، جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے باٹھ میں محمد ﷺ کی جان ہے اُسی بندہ کا اس وقت تک دین

* صحیح بخاری، کتاب الرقاق باب رفع الامانة: ۶۴۹۷ و کتاب الفتنه، باب اذا بقى في حالة من الناس: ۷۰۸۶ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة: ۳۶۷ و مستاد احمد، ح ۵، ص: ۳۸۳ و ترمذی، ابواب الفتنه، باب ما جاء في رفع الامانة: ۲۱۷۹ و ابن ماجه، ابواب الفتنه، باب ذهاب الامانة: ۴۰۵۳۔

درست نہ ہوگا، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا..... اور جو کوئی کسی ناجائز را سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا تو شہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔*

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں۔“* اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت پر دکی جاتی ہے۔“* اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں۔“ یعنی ایک جگہ کی بات دوسرا جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بنتا چاہیے، الایہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((المجالس بالامانة)) یعنی ”نشیطین امانت کے ساتھ ہوں۔“ مگر تین موقعوں پر کہیں کسی * کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبروریزی کی، یا کسی کامل ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو تو متعلق لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پرده کی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایسے راز ہیں، جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف امانت کے خلاف بھی ہے،* راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سواد و سرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً اوہ را درہ اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا ہے تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے۔“* امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔* مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

* کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ حیدر آباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعود۔

* کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ از طبرانی اوسط طبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل، ویہقی فی شعب الایمان۔

* ادب المفرد بخاری، باب المستشار مؤمن: ۲۵۶۔ * ابواود، کتاب الادب، باب فی نقل الحديث: ۴۸۶۹۔ * ایضاً: ۴۸۷۰۔ * ایضاً: ۴۸۶۸۔

* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المتفاق: ۳۲، ۳۴۔

امانت میں خیانت کرتا ہے، حضور ﷺ نے جیہے الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ”عورتوں کے باب میں اللہ سے ڈرو۔“ فرمایا: ”کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔“ * قیامت کی ثانیوں میں سے آیا ہے کہ ”سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جو ہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہو گی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ اللہ کے ہاں نہیں۔“ * فرمایا: ”میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کمال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔“ * یعنی جو امانت پر دو کی جائے گی اس کو آمدی اور کار خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

1 صصحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔

2 کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس۔

3 کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شہر و حیا

انسان کا یہ وہ نظری وصف ہے، جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داشت سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مردوت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے، جو اس کی ذات اقدس کے لاکن ہیں، مثلاً: یہ کہ وہ اپنے بد کار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑنا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراہ نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”عزت اور جلال والے اللہ کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلانی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراہ لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے۔“ * ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی ﷺ میں آئے، آپ کے ارد گرد صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے، دوسرا صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرا صاحب پلے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا، وہ اللہ کی پناہ میں آیا تو اللہ نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا اللہ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اس نے اللہ سے منہ پھیرا، * تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیرا۔“ سورہ بقرہ میں یہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْأَمِحُ أَنْ يَضْرِبَ مُشَكِّلًا مَا﴾ (٢٦/البقرة)

”اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے شرما تا نہیں۔“

یعنی کسی حق پات کے ظاہر کرنے میں وہ شرما تا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے:

﴿وَاللَّهُ لَا يَسْتَحِي مِنَ الْحَقِّ﴾ (٥٣: الاحزاب) (٢٣)

”اللہ تعالیٰ بات کہنے سے نہیں شرماتا۔“

حدیث میں بھی ہے:

((إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ))

”اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرما تا نہیں۔“

قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے، اس کی نسبت اللہ کی

^١ يهقى، كتاب الأسماء والصفات، باب ماجاء في الاستحياء، ص: ٣٤٠.

٢ بخاري ، كتاب العلم ، باب من قعد حيث ينتهي به المجلس: ٦٦ وصحبي مسلم ، كتاب السلام ، باب من اتي مجلسا فوجد فرحة: ٥٦٨١ . **٣** بخاري ، كتاب الادب ، باب مala يستحبها من الحق: ٦١٢١ .

طرف اللہ کی غیرت و حیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے: ”اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکار یوں کو حرام کیا ہے۔“ *

موسیٰ علیہ السلام کو مدینہ سفر میں جن دو لاڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بد ویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں، تاہم یہ صرف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں، تاکہ مردوں کی نکمش سے الگ رہیں اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلاں کے لیے بھجا۔

﴿فَيَأْتُهُنَّ إِذْ هُمَا لَتَّشَنِ عَلَى اسْتِحْيَاءٍ﴾ (القصص: ۲۸)

”تو ان دو لاڑکیوں میں سے ایک شرمندی ان کے پاس آئی۔“

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح و ستائش بھی مقصود ہے۔

یہ صرف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے اور اگر بربری صحبت لگ جائے اور اپنے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اس لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، میر عورت کا خیال، نگاہیں پنچر کرنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، بہنگی کو منع کرنا، یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا، اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جبینپی رہیں، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بروحتی جائے گی، تو فرقہ رفتہ انسان پکا بے حیاں جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہوا تھا، آپ اپنیں اٹھا اٹھا کر لارہے تھے، آپ کے پچھا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا، تم تہبند کھوں کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوٹی طاری ہو گئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا، * نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدُ حَيَاءً مِّنَ الْعَذَرَاءِ فِي خَدْرَهَا.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرم میلے تھے۔“

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، بگرشم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورہ احزاب میں مذکور ہے:

﴿إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي الَّذِي فَيَسْأَلُنِي مِنْكُمْ﴾ (الاحزاب: ۵۳)

* صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب غیرة الله تعالیٰ: ۶۹۹۱، عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر اللہ کے تعلق سے اس کے معنی کچھ جیسا کہ قریب قریب سے وجاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقبت سے ملتے ہیں، جو محبت میں شرکت کرنیں چاہتی۔ ** بخاری، کتاب الحج، باب فضل مکہ و بنیانہا: ۱۵۸۲۔

*** بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء: ۶۱۱۹۔

”تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا چھپتی تھی تو تم سے وہ شر ماتا تھا۔“
 حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا غصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم و حیاداں گیرنا ہے، لیکن دوسروں کی مردوت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرم میلا اور حیادا رہا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ”اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔“

یہی حیا بوجیمان کا ایک جزو ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے احتساب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرة حیا کا نادہ ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں، بلکہ اصلاح کے قابل ہے اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نهى عن الممنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی صحف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً: اللہ نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، اللہ نے فرمایا: کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے اللہ نہیں شر ماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا، فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْكُنُ إِلَيْهِ أَنْ يَكْرِهَ مَثَلًا مَا بَعْوَذَهُ فَمَا فَوَّهَا مُطَّهِّرًا﴾ (۲/ البقرة: ۲۶)

”اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذریمی) نہیں شر ماتا (چاہے وہ مثال) پھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔“

حضرت زینبؓ کی دعوت و یہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے با تین کرتے رہے، جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنی اسرائیل کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح حجم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب بیوت کے خلاف تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي الَّذِينَ فَيَسْكُنُونَ مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْكُنُ مِنَ الْعَيْنِ﴾

(۳۳/الاحزان: ۵۳)

• بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء: ۶۱۱۸ •

”اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں۔“

اپنی ذاتی تکالیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ ﷺ کی خوشی خلقی اور مرمت کے خلاف تھا، اس لیے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو لوٹو کا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔ یہی حیا تھی جس نے ان موقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھپک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ ﷺ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے نہیں شرعاً تا، کیا عورت پر جانت بات کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان کی مثال ایک ایسے سربراہ درخت کی ہے جس پر کبھی خزان نہیں آتی۔“ اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ یہ کبھوڑ کا درخت ہے، تاہم چونکہ کسی تھے، اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع رہتا اور علمی مجلس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لیے جب حضرت عمر بن الخطاب سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا، کہ اگر تم اس درخت کا نام بتادیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ ﴿النصاریٰ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہاں کا خاص اخلاقی و صفت سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ سے فرمائی ہیں:

نعم النساء نساء الانصار لم يكن يمنعهن الحياة ان يتفقهن في الدين。 ﴿

”النصاریٰ عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکی تھی۔“

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہیٰ عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جو ہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الحياة لا يأني الاخير)) ﴿

”حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔“

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے جو انسان کو برا یوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ شہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لیے فرمایا کہ

﴿ بخاری، کتاب الادب، باب مالا يستحق من الحق للتفقه في الدين: ٦١٢٢ - ﴿ مسلم، کتاب الحجض،

باب استحباب استعمال المفترضة من الحيض فرصة من مسلك في موضع الدّم: ٧٥٠ -

﴿ بخاری، کتاب الادب، باب الحياة: ٦١١٧ -

((ان مما ادرك الناس من کلام النبوة الاولی اذا لم تستح فاصنع ما شئت)) *
 ”لوگوں نے پرانے بیغروں کی جوابات میں پائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا
 نہیں تو جو چاہو کرو۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ * نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں
 کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔ قرآن و حدیث میں جہاں فحش، منکر اور سوء
 وغیرہ کے لفظ آئے ہیں، ان سے بے حیائی کے بھی سب کام مراد ہیں اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت
 کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث
 شریف میں آیا ہے کہ ”ہر دین کا ایک خاص غلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص غلق ہیا ہے۔“ * یہ بھی فرمایا:
 ”ایمان کی کچھ اور سماں تھ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔“ * فطری موقع کے علاوہ
 ایک مسلمان کو بھی بھی یہاں تک کہ تہائی کی حالت میں بھی شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے،
 یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”برہنگی سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو
 صرف بول و برآز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم اور ان کا خیال رکھو۔“ *
 مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

-
- ❶ بخاری، کتاب الادب، باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت: ٦١٢٠۔ ❷ فتح الباری، ج ١٠، ص: ٤٣٤۔
 ❸ موطا امام مالک، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی الحیاء: ١٦٧٨۔
 ❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان: ٩۔
 ❺ ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی الاستیار عند الجماع: ٢٨٠٠۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کریم کر دیکھتے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہو گا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمؐ لعنى "بر احمد والا" ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام "رجیم" آتا ہے، "یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے اللہ کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمؐ و رحیم اللہ کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت کے حلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اللہ کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

﴿رَبِّنَا وَيَسْعَتْ كُلَّ شَيْءٍ بِرَحْمَةٍ وَّ عِلْمًا﴾ (۴۰ / المؤمن: ۷)

"اے ہمارے پروردگار! تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سماں لیا ہے۔"

اس رحمتِ الہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

﴿هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ (۵۹ / الحشر: ۲۲)

"وَهِيَ رَحْمَةُ الْأَمْرِ بَانَ ہے۔"

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں:

﴿وَاللَّتَّ خَيْرُ النَّاجِيِنَ﴾ (۱۰۹ / المؤمنون: ۲۳)

"اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔"

دنیا میں رحم و کرم کے جدا آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ "اللہ نے رحمت کے سو (۱۰۰) نکڑے کیے، جن میں سے نانوے نکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک نکڑے کو اتارا اور اسی ایک نکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔"

بنی نوع انسان میں محسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ يَا أَيُّوبُ مُؤْمِنُينَ﴾

● بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللہ الرحمة فی ما نافعه جزء: ۶۰۰ -

رَءُوفٌ رَّجِيمٌ ﴿٩﴾ (التوبۃ: ۱۲۸)

”(لوگو) اتمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری تکالیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہو کا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔“ پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمْ رَأْفَةً وَرَحْمَةً﴾ (الحدید: ۲۷)

”اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔“

اور اس وصف میں امت محمد یہ بھی ان کی شریک و سہیم ہے:

﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رَحْمَاءُ بِنَاهِمْ﴾ (الفتح: ۴۸)

”اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر زور آور ہیں، آپ میں رحمدل ہیں۔“

آپ کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برداشت کیا جاتا ہے، اس کو صلة رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم جو اللہ کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ لکھتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحم) اللہ کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلة رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الرحم شجنۃ من الرحمن)).

”رحم، رحم کی جڑ سے لگی ہوئی ایک شاخ ہے۔“ *

یعنی قرابت کی رحمتی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحم کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانوپر جھک کو اور دوسرے زانوپر امام حسن ؓ کو تھالیتے تھے، پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ ”اللہ ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔“ *

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ”تم اس پر رحم کرتے ہو؟“ اس نے کہا: ہاں۔ ارشاد ہوا کہ ”اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“ *

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن ؓ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خوب دو تھے،

* بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله اللہ: ۵۹۸۸۔ * بخاری، کتاب الادب، باب وضع الصبی علی الفتح: ۶۰۰۳۔ * ادب المفرد، باب رحمة العیال: ۳۷۷۔

پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دل پچھے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوس نہیں لیا، آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ”جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“ ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چوتھے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چوتھے، ارشاد ہوا کہ ”اللہ نے جب تھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا اکیا زور ہے۔“ *

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا مت محمد یہ کا ایک عضر ہے، اس لیے فرمایا کہ ”جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ * اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھلایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی دسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔ خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے: ﴿رَحْمَاءُ بَيْهِمُ﴾ یعنی ”وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں۔“

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم ولی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد، دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے، * جس کے معنی یہ ہیں کہ جذب رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر تحد کر دیا ہے کہ جمیوں طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارج ہیں، اس لیے جس طرح ایک عضو کے درد، دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد، دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔ اسلام نے جس رحمہ می کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بینی نوع انسان شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ ”جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔“ یہ بھی فرمایا کہ ”رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا اللہ رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔“ *

رحمہ می کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر کوئی شخص ذبیح جانور پر بھی رحم کرے گا، تو اللہ قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔“ * ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، آپ ﷺ نے دوبار فرمایا کہ ”اگر تم بکری پر رحم کرتے

۱ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد و تقبيله و معانقته: ۵۹۹۸، ۵۹۹۷۔

۲ ترمذی، ابواب البر والصائم، باب ماجاء فی رحمة الصيام: ۱۹۱۹۔

۳ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۱۔ * ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما

جاء فی رحمة الناس: ۱۹۲۴۔ * ادب المفرد، باب ارحم من في الأرض: ۳۷۳۔

ہو تو اللہ بھی تم پر حم کرے گا۔ ﴿ جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لیے اسلام نے اس تفسیحی مشغله کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی صفائح فرمائی۔

اس عام رحمی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے محضرا اور جامع لفظوں میں دی ہے، جو بلاغت کی جان ہیں، فرمایا:

((مَنْ لَا يَرْحُمُ لَا يُرْحَمُ))

”جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحمی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ نہیں دو لفظوں سے ابھارا جاسکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں فرمائے گا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے، حدیث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ”اس میں تمام خلوق پر حم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے اس میں مسلمان، کافر، بملوک اور غیر مملوک جانور سبھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی مگرائی کرنا، ان پر ہمکا بوجھ لا دنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں۔“ ﴿ غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم قیمتوں کی عینخواری، بے کسوں کی تسلیکیں، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیر دستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرة ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں، کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

۱۔ ادب المفرد: ۳۷۳۔ ۲۔ صحيح بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۳۔

۳۔ فتح الباري، ج ۱۰، ص: ۳۶۸۔

عدل والنصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دونوں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں ”عدل“ کہتے ہیں، ﴿ اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کی طرف چکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا ترے، اس شرط سے معلوم ہو گا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و النصف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علمانے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ”اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے حق ہے۔“ ﴿ قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دھرائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِيُ بِالْحَقِّ ۝﴾ (۲۰ / المؤمن: ۴۰)

”اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔“

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقَّ ۝﴾ (۳۳ / الاحزاب: ۴)

”اور اللہ حق بات کہتا ہے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یک جا ہیں:

﴿ وَسَمِّكْتَ تَكْلِيْمَ رَبِّكَ صَدِّقًا وَعَدْلًا ۝﴾ (۱۱۶ / الانعام: ۶)

”اور تیرے رب کی بات سچائی اور النصف کے ساتھ پوری ہو گئی۔“

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و النصف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے النصف کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ شَهَدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهٌ إِلَّا هُوَ وَالْمَلِكُ كُلُّهُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَاتِلًا بِالْقِسْطِ ۝﴾

(۱۸ / آل عمران: ۳)

”اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی اللہ

﴿ مفردات راغب اصفہانی: ۳۲۷۔

﴿ کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ۶۱ الہ آباد۔

النصاف کو لے کر کھڑا ہے۔“

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظام عالم تھنچ عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۹۰/ التحل: ۹۰)

”بے شبه اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔“

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگز کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تائید کی ہے، جس سے اشخاص کی رو حالتی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی جملہ تعلیم پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے، جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿فَإِنْ خُفْتُمُ الْآتَيْنِ لَوْلَا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكْتُ أَيْمَانَكُمْ﴾ (۴/ النساء: ۳)

”پھر اگر تم کو اس بات کا اندر یشہ ہو کہ (کئی یہیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (لبی بی کرنا) یا جو (لوغہ) تمہارے قبضے میں ہو۔“

عورتوں کی طرح تینیوں کے حقوق کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لیے فرمایا:

﴿وَأَنْ تَقُومُوا لِلِّيْلِيْمِيْ بِالْقِسْطِ﴾ (۴/ النساء: ۱۲۷)

”اور (خاص کر) یہ کہ تینیوں کے حق میں انصاف کو لمحوظ رکھو۔“

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے، اس لیے فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا الْكِنْيَلَ وَالْإِيْرَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۲)

”اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) قول۔“

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور قول میں بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ نہایت عام و وسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی

کرنے سے انسان کی سخت دنایت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔ عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا خاطر کھاہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

﴿وَلَيَكُتُبْ بَيْنَمَا كَاتَبَ بِالْعَدْلِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۸۲)

”اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔“

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحُقْقَ سَفِيهًآ أَوْ ضَعِيفًآ أَوْ لَا يَسْتَطِعُهُمْ هُوَ فَلِيمَلِلْ وَلِيْهِ بِالْعَدْلِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۸۲)

”پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا مغدور یا خود اداے مطلب نہ کر سکتا ہو تو

(جو) اس کا اختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔“

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈالنے کا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عدالت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی:

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَكُوْنَ كَانَ دَأْقُرْلِ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۲)

”اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہ تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو،“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تُؤْتُونَ أَوْلَادَكُمْ يَلْهُ شَهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجِدُ مِنْكُمْ شَانَ قُوَّمٍ عَلَى الْأَلَّا تَعْدِلُوا إِذْ عِدْلُكُمْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ (۵/ المائدۃ: ۸)

”مسلمانو خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ ہو اور لوگوں کی عدالت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوه) انصاف پر ہیز گاری سے قریب تر ہے۔“

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ ہائے اور دوسرا آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقوی کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاری اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسول اسلام ﷺ کی زبان مبارک سے وحی الہی یہ کہلواتی ہے:

﴿وَقُلْ أَمْنُتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتْبٍ وَأَمْرُتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَمَا وَرَبِّي وَلَنَا﴾

أَعْمَلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حِجَّةَ يَبْيَنُنَا وَلَيْسَكُمْ أَللهُ يَجْعَلُ بَيْنَنَا وَإِنَّهُ الْمُصِيرُ ۝

(٤٢/ الشوری: ١٥)

”اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتنا تیاری اور مجھے (اللہ سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے نقش میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملتا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ بھگڑا نہیں، اللہ ہی سب کو معج کرے گا، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔“

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے، اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچتی ہے، اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ ہے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ تنقی کا قانون برنا جائے، میرے اللہ نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہیں، اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے، ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس میں بھگڑے کی کوئی بات نہیں، سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو دیا انعام ملے گا اور اگر را کام کیا ہو تو وہی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک شخص منزد ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل و انصاف کا سرسرشہ با تھے سے نہ جھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں ایمان کو اس شخص منزد کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ الہی ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُنُوْنُ قَوْمِيْنَ يَأْلِمُنَّ بِالْقُسْطِ شُهَدَاءِ يَلِيْلَوْ وَكُوْنُ عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَوْ الْوَالِدَيْنَ وَالْأَقْرَبَيْنَ إِنْ يَكُنْ عَيْنَيْنَا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلَا تَنْهِيْعُوا الْهَوَى أَنْ تَعْلِمُوا وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُغْرِيْضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُوْنَ حَيْرَانَ﴾ (٤/ النساء: ١٣٥)

”اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے لیے گواہ بنو، اگر چہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا مال باپ کا، یا رشتہ داروں کا اگر وہ دولت مند ہے یا تھانج ہے تو اللہ م سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملوگے یا کچھ سچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔“

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشر کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات

میں عدل و انصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہوا اور اللہ واسطے کہو، عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیج میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرف داری کا، نہ مقام پر حرم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹا نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجو کر چالیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو دیا کہو، پھر حق کہنے میں کوئی توڑ مر وڑ نہ کرو کہ سننے والا شہر میں پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپا لو، تو یہ سب بتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردو بدلت کر دینا بظاہر تکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمان کرنا بھی ویسا ہی ہے، جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے معروب ہو کر بے ایمان کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا لیا بر اخذہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہچانے کی غرض سے طرفدار نہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں بنتا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا، اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرف داری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ کے پر کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔ لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم میں نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس میں ان کی بھائی ہے، غور یکجھ کر ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچ گا، حالانکہ عالم الغیب کے سو ایک کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ہے گی، پھر ایک اور نیشت سے دیکھ کر بالغرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بندی اور کھلکھلی، جس سے عالم کے امن و امان کے دراثم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گوانسان کی مدد و نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔ اسی لیے رہوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں:

﴿وَنَذِلُوا إِلَيْهَا إِلَى الْحُكَمِ لَتَكُونُوا فَرِيقاً قَوْنُ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْأَثْوَرِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾

(١٨٨) / البقرة

”اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔“

اس رشت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ *

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حصہ دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سرو سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغِ جذبات کی آندھیوں میں بچھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا:

﴿وَإِنْ طَآپَقْتُنَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ افْتَشَوْا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَعْدَ احْدِيْهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَقْنَعَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَأَعْتَدْتُ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴾ (٤٩) الحجرات

”اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑپڑیں تو ان میں صلح رادو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لاویں ساتھ کردہ حکم اللہ کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرادا اور انصاف کو لکھا رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محظوظ رکھتا ہے۔“

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری فرار دیا ہے کہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادری ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ مِمَّا يَشَاءُ وَمَا نَهَا إِنْ تَوْجُدُوا الْأَمْنِيَّةُ إِلَى آهُلِهَا لَ وَإِذَا حَلَّمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أُنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ﴾ (٤) النساء

”بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانت امانت والوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

اہل فقیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ”امانت“ سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے

* تفسیر روح المعانی، ج ۲، ص: ۶۰۔

جو ایک کا دوسرا پر چاہیے، اللہ نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حق دار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافروں مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

﴿وَإِنْ حَكْمَتْ فَأَحْكُمْ بِمَا يَنْهَا بِالْقُسْطِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۵/ المائدۃ: ۴۲)

”اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لاحاظہ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی اور محبت سے نواز نے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے، تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمٌ لَا يُقْرَرُ عَلٰى شَيْءٍ وَهُوَ كُلٌّ عَلٰى مَوْلَاهُ لَا يُبَاهِي بُوْجَهَهُ لَا يَأْتِي بِغَيْرٍ هُلْ يَسْتَوِي هُوَ لَمَّا مَرَ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (۱۶/ النحل: ۷۶)

اور اللہ (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (بیس) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پر ایسا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو سمجھے اس سے کچھ بھی تھیک نہیں بن آتا ہے، کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برادر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سید ہے راستے پر ہے۔“

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے، اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوٰے مرتبہ کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوٰے مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور عالم ہونا چاہیے، تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کوششیں ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیے، پہلا شخص سے کوئی کام تھیک نہیں آتا، اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر کام کو سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہا خلائق تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے، تاہم امام و حاکم وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لیے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا، سات شخصوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص امام عادل ہو گا۔“

بخاری، کتاب المحاربين، باب فضل من ترك الفواحش: ٦٨٠٦

عہد کی پاندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْبِيُّعَادَ﴾ (آل عمران: ۹، الرعد: ۳۱)

”بے شرط اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“

﴿لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْبِيُّعَادَ﴾ (الزمر: ۳۹)

”اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“

﴿إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْبِيُّعَادَ﴾ (آل عمران: ۱۹۴)

”اے ہمارے پروردگار تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“

﴿وَعْدَ اللَّهُ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (الروم: ۶)

”اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“

﴿وَلَكُنْ يَخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (الحج: ۴۷)

”اور اللہ ہرگز نہ لے گا اپنا وعدہ۔“

﴿فَلَمَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾ (البقرة: ۸۰)

”تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔“

﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾ (التوبہ: ۹۱)

”اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کوئی ہے۔“

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول و قرار کریں اس کے پابند ہیں، سمندر اپنارخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑی اپنی جگہ سے مل جائے تو مل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ نہ سے جو کہہ دے اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول و قرار کرے اس کا پابند نہ ہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت دیگر ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جن کی پابندی انسان پر عقل، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سلفاظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی نفعاً کا مجھ حصہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَالْمُوقِنُ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۷)

”اور اپنے قول و قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔“

بعض آیوں میں اس کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْيَالٍ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (۲۲/ المؤمنون: ۸)

”اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔“

ایک دوسری سورہ میں جتنی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْيَالٍ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (۷۰/ المعارج: ۳۲)

”اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔“

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دیا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وضع معنی میں داخل ہے، اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تا کیدا پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے عکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُلًا وَأَوْفُوا الْكِبَرَ إِذَا كَلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ

الْمُسْتَقْبِطُ ذَلِكَ خَيْرٌ وَآخْرُكُنْ تَأْوِيلًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۳۵-۳۶)

”اور عہد کو پورا کیا کرو، (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کرو، تو پیانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (توں کر دینا ہوتا) ذندگی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔“

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معابدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بالع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لیے تا کیدا پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرف عام کے سارے مسلمان سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔ تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تودہ فطری معابدہ ہے جو روزِ الہست کو بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃ قائم ہے اور جن کے ادا

کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ يُؤْفَنُونَ يَعْهِدُ اللَّهُ وَلَا يَنْقُضُونَ الْيَتَامَىٰ ۚ وَالَّذِينَ يَصُلُّونَ مَا أَمْرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ ۝﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۱-۲۰)

”جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور اللہ نے جن تعلقات کے جوڑ نے کا حکم دیا ہے، ان کو جوڑ رے رکھتے ہیں۔“

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے اینفا کا ذکر ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول و قرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے، جو خاص کراہی قربات کے درمیان قائم ہے۔ سورہ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معابدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو اللہ کو حاضر و ناظر تباکریا اللہ کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْنَا اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۝﴾

(۹۱/ النحل: ۹۱)

”اور اللہ کا نام لے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو کپی کر کے توڑانہ کرو اور اللہ کو تم نے اپنے پر خامن تھبیرایا ہے۔“

اس معابدہ کے عموم میں صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ عہد بھی داخل ہیں، جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے اور وہ نیک معابدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معابدے بھی اس میں آ جاتے ہیں، جو اللہ کا واسطہ دے کر اور اللہ کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورہ انعام میں ایک اور عہدِ الہی کے اینفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا:

﴿وَبَعْهِدِ اللَّهِ أَوْغُوطَ ذَلِكُمْ وَضَكْمُهُ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۲)

”اور اللہ کا قرار پورا کرو، یا اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے، تاکہ تم دھیان رکھو۔“

اس عہدِ الہی میں اللہ کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں، جن کے بجالانے کا اقرار تم نے اللہ سے کیا ہے، یا اللہ نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اس نذر اور منٹ کو مشتمل ہے، جس کو اللہ کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو اللہ کی قسمیں کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معابدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کار سازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت میں اس معابدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت

اور شہنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معابدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معابدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معابدہ کی خلاف درزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معابدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گودے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار ہمینوں کی مہلت دو:

﴿بِرَبِّ آءَكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْنَمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَسِيْجُوهُ فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ﴾ (۹ / التوبہ: ۲)

”اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے، جن سے تم نے معابدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو!) املک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکانیں سکتے۔“

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معابدہ کی ذمہ داری نہیں رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایسا یہ عہد کی تاکید کی گئی، جنہوں نے حدیبیہ کے معابدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا:

﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْنَمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَفْصُلُوهُ شَيْئًا وَّلَمْ يُطَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَإِنَّهُمْ لَكُلُومُهُمْ إِلَى مُدَّتِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (۹ / التوبہ: ۴)

”مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقرراتہ مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔“

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایسا یہ عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقد فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی براءت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس معابدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ، ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے اس معابدہ کو قائم رکھا ہے:

﴿كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْنَمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا أَسْتَقْأَمُ الْكُمْ فَأَسْتَقْيِمُ وَالْهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (۷ / التوبہ: ۹)

”مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معابدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔“

”سید ہے رہنے“ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں، ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا مندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاهدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الہی سے کسی کوں سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُهُودَ﴾ (۵ / المائدۃ: ۱)

”مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔“

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود یہیں دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

”اوْفُوا بِالْعَهْدِ“ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے (یا ایہا الذین آمنوا اوْفُوا بِالْعُهُودَ) اور اس قول میں تمام عقد مثلاً: عقد بیع، عقد شرکت، عقد بیٹیں، عقد نذر، عقد صلح اور عقد زناج داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضایہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔*

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعاقدات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مردی ہے کہ ”مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذنع کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔“** یعنی حضرت خدیجہؓ سے کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جوان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرفی یہ ہے ”حسن العہد من الایمان“ اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حاکم اور بیانی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ ”تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال

* تفسیر کبیر، ج ۵، ص: ۵۸۵۔ ** بخاری، کتاب الادب، باب حسن العہد من الایمان: ۶۰۰۴۔

بے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟“ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا: ”عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آپ کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے۔“ یعنی اپنے ملنے والوں سے حسب موقع کیساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے:

((لا دین لمن لا عهد له))

”جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں۔“

یعنی اس قول وقرار کو جو بندہ اللہ سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حنف العبا و کوادا کرنا ہے، جس کے مجموعے کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا، وہ دین کی روں سے محروم ہے۔

“يَوْمَ الْحِجَّةِ لِلْعُشَرِ”

କାହାର ପାଇଁ କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା
କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା

『**ଶ୍ରୀମଦ୍ଭଗବତ**』 (୧/୨୩୦୦)

ପ୍ରାଚୀନ କଥାକଣ୍ଠ ମଧ୍ୟ ଦେଶରେ ଯାହାରେ ଆଜିର ମହାନ୍ତିରୁ ଏହାରେ ଆଜିର ମହାନ୍ତିରୁ

﴿وَلَمْ يَرِدْهُ إِلَّا مَرَّةً وَلَمْ يَرِدْهُ إِلَّا مَرَّةً﴾ (٨٨) / ﴿وَلَمْ يَرِدْهُ إِلَّا مَرَّةً وَلَمْ يَرِدْهُ إِلَّا مَرَّةً﴾ (٨٩)

وَقَدْ أَنْتَ مُهَمَّةً لِلْمُؤْمِنِينَ

《ବିଜ୍ଞାନ ପରିଦର୍ଶକ ପାଠ୍ୟଗୁଣ୍ଡଳ ମାଲିକୀ》 (୧୧/୧୯୭୫-୦୬)

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾ (٩٠ / التحـلـ)
 ”الله انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قربات والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔“

النصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رخ و راحت کی پروانیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجب حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قربات داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قربات دار، مقیم، محتاج، قربات دار پڑوی، ابھی پڑوی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لوگوں غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء (٣٢:٣) کی ایک آیت میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔
(بقرہ: ٨٣، انعام: ١٥، بنی اسرائیل: ٢٣، حلقہ: ١٥)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا وارثہ ہتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دارہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالہ کیا:

﴿وَأَخْيَنْ كَمَا أَخْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ (٢٨ / القصص: ٧٧)

”اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اور وہ احسان کے ساتھ) احسان کر۔“

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف عليه السلام کو قید خانے سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:
﴿وَقَدْ أَخْسَنَ لِي إِذَا أَخْرَجَنِي مِنَ التَّنَجُّنِ﴾ (١٢ / یوسف: ١٠٠)

”اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) انسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔“

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں، جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً: عورتوں کو قانونی حلیے نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:

﴿الطلاق مَرْتَلْنَ مِنْ قَامَسَكٍ مَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيْحٍ يَا حَسَانٌ ﴾ (٢٢٩: البقرة)

”طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دہی طلاق ہیں ہیں جو) و دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرو دینا۔“

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو اور اس کی ادائی میں لیت و حل اور جنت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا:

﴿فَمَنْ عَفَى لَهُ مِنْ أَخْيَهُ شَانٌ عَفَّاً تَبَاعِرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءُ الْيَمِينِ يَا حَسَانٌ ﴾ (١٧٨: البقرة)

(١٧٨: البقرة)

”پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جزو (قصاص) معاف کر دیا جائے، تو (جان کے بد لے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبه دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کرو دینا۔“

تصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی اللہ کے محبوں بندوں میں ہوں گے:

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (٢: آل عمران: ١٣٤)

”اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔“

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے، اگر کوئی ممنکوح سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے اور شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں، تو یہ مرد کا حسن خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ يَبْهَأَ الْعَمَلَوْنَ بَصِيرَةً ﴾ (٢: البقرة: ٢٣٧)

”اور آپس میں فضل مت بھولو، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔“

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں۔ فرمایا:

• یعنی جس حالت میں کہ مقرر ہو جکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

• سیدھے سے روایت ہے ”آپس میں فضل کو مت بھولو۔“ یعنی ”احسان کو مت بھولو“ این جریر طبری، ج ۲ ص: ۳۲۵۔

• کشاف رشیری تفسیر آیت مذکور ج ۱ ص: ۱۲۱، بعضوں نے یہاں ”فضل“ سے فضیلت دیتی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

﴿وَلَا يَأْتِي أُولُوا الْفَضْلِ مِنْهُمْ وَالسَّعَةُ أَنْ يُؤْتَوْا أُولَى الْقُرْبَى وَالْمَسْكِينَ وَالْمَهْجُورِينَ فِي سَيِّئِ اللَّهِ وَلَيَعْفُوا وَلَيَصْفُحُوا﴾ (۲۴ / النور: ۲۲)

”اور تم میں جو احسان اور کشاکش والے ہیں وہ قرابت داروں، غربیوں اور اللہ کی راہ میں بھرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔“ احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک جامع لفظ ”معروف“ کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلًا و شرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے، قرآن کریم کا حکم ہے:

﴿وَأَمْرُوا بِالْعُرْفِ﴾ (۷ / الاعراف: ۱۹۹)

”اور نیکی کرنے کو کہہ۔“

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

﴿كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ﴾ ❶

”ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔“

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب و امیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے۔“ صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا ”کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے۔“ صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یادہ نہ کمائے؟ ”فرمایا: ”غریب حاجت مند کی اعانت کرے۔“ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے؟ فرمایا ”نیکی کے کرنے کا حکم دے۔“ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے؟ ارشاد ہوا کہ ”برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔“ اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ ”آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔“ ❷ اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ”بر“ کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافروں مسلم سب کو شامل کر لیا ہے:

﴿لَا يَنْهَمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَهُنَّ لَفْقَاتُ تُؤْمِنُهُ فِي الدِّينِ وَكُمْ يُمْرِرُ حُوكْمُهُ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ

تَبْرُدُهُمْ وَقُقْسُطُوا إِلَيْهِمْ طَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسُطِينَ ❸﴾ (۶۰ / المحتمن: ۸)

”جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تھارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برداشت کرنے سے تو اللہ تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ اللہ منصفانہ برداشت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

صحابہ نوائیتہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نما مسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقہ: ۶۰۲۱۔

❷ ایضاً: ۶۰۲۳؛ نسخ الباری، ج ۱۰، ص: ۳۷۴۔

کہ ہدایت بخشن تمہارا نہیں، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھی کرنی اور اپنی نیت نمیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا، ﴿ارشاد ہوا﴾

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدًى لَهُمْ وَلِكُنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفِيكُمْهُ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا يُنْعَاهُ وَجْهُ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوْفَ إِلَيْهِمْ وَأَنَّمَا لَا تُنْظَمُونَ﴾ (۶)

(۲/ البقرة: ۲۷۲)

”تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا، لیکن التدریاہ پر لے آتا ہے، جس کو چاہے اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کرو اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارانے جائے گا۔“

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیک کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وادا اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے، جو نیک کام کریں گے ان کو اللہ کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا:

﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا إِحْسَانٌ﴾ (۵۵/ الرحمن: ۶۰)

”اور بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔“

گویہ آیت مبارکہ اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلاکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا نہ ہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلاکا کیا ہے، قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقرضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل بجور ہوں، ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔ عرب میں سودخواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور تنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادنیں کر سکتے تھے، وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی، اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقرضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو ٹوٹے والا کرتی ہے:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُؤْسْرَةً فَنَظَرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَإِنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ﴾

(۲/ البقرة: ۲۸۰)

”اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقرض) ہو تو فرانی نیک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔“

* ابن حجریر، ج ۲، ص: ۵۸، ۵۹ و ابن کثیر، ج ۱، ص: ۳۲۲ بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فرقیت ہوں گا، جن میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔“ اس کو اور بھی مؤکد کر دیا اور قرض کے معاملے میں تنگستون پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں گے، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے، تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ”ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا، لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقرض نگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگز رکرو، شاید اللہ ہم سے بھی درگز رکرے، چنانچہ اللہ نے اس کے صلہ میں اس سے درگز رکیا۔“ وہ سری حدیث میں ہے کہ ”تم سے پہلے ایک شخص تھا، جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا، کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا، ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقرض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا اور اگر نگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یہ کہ فراخ دست مقرض کو مہلت دیتا تھا اور نگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔“

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے، وہ نگ دست کو مہلت دے، یا اس کا قرض معاف کر دے۔“ یہی روایت مندابن حضبل میں ان الفاظ کے ساتھ آتی ہے کہ ”جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سامنے میں ہو گا۔“

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو نگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ مارو، کسی جانور کو زخم کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیر کر لیا کرو اور اپنے ذیجہ کو راحت دو۔“

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر پوچھا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں کسی

❶ بخاری، کتاب البيوع، باب ائم من باع حرزا: ۲۲۲۷۔ ❷ بخاری، کتاب البيوع، باب من انظر

موسرا: ۲۰۷۷ و مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل انتظار المعاشر: ۳۹۹۳۔

❸ مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل انتظار المعاشر: ۴۰۰۰۔ ❹ مسند احمد، ج ۵، ص: ۳۰۸۔

❺ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح: ۵۰۵۵۔

شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کچھ خلائق کا بدلتہ ہیں دوں۔ فرمایا: ”نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔“ *

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: ”ایسے نہ بنو کہ خود تھاری گرد کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھادیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کرلو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔“ *

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رض صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدلوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا: ”تمہاری تقریباً گومنقصہ ہے، لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔“ اس نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا: ”نہیں اسکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن ج چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشید دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلا دا اور پیاسے کو پلاو اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلانی کے سوا اور باتوں سے روکو۔“ *

ایک دفعہ حضرت ابوذر رض نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا: ”جبور و زی الله نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔“ عرض کی، اے اللہ کے رسول! اگر وہ خود مغلس ہو؟ فرمایا: ”اپنی زبان سے نیک کام کرے۔“ عرض کی، اگر اس کی زبان معدود ہو۔ فرمایا: ”مغلوب کی مدد کرے۔“ عرض کی، اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو۔ فرمایا: ”جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔“ عرض کی، اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو۔ فرمایا: ”اپنی ایذ ارسانی سے لوگوں کو بچائے رکھ۔“ *

١. جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الاحسان والغفو: ۲۰۰۔ ٢. جامع ترمذی، ایضاً: ۷۔ ۳. مستدرک حاکم، کتاب المکاتب، ج ۲، ص: ۲۱۷۔ ۴. مستدرک حاکم، کتاب الایمان، ج ۱، ص: ۶۳۔

عفو و درگز

عفو و درگز رکنی کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ ہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عفو (درگز رکنے والا) غافر، غفور اور غفار (معاف کرنے والا) اس کی شان ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَقْبِلُ التَّوْبَةَ عَنِ عِبَادَةٍ وَيَعْفُوُ عَنِ السَّيِّئَاتِ﴾ (٤٢/ الشورى: ٢٥)

”اور وہی سے جوائے بندوں کی تو یہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔“

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے، یا ان کو معاف کر دے، فرمایا:

﴿أَوْيُوْقِهْنَ بِهَا كَسْبُوا وَيَعْفُ عَنْ كُثِيرٍ﴾ (٤٢) / الشورى: (٣٤)

”(اگر اللہ چاہے تو) گناہگاروں کو ان کے کرقوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔“

وہ ایسے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پرداز کیڈ کر کے چوں دلاتا ہے:

﴿وَإِنَّ الْفَقَارَ لِمَنْ تَأْبَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا أُتْهَىٰ هُنَّ اهْتَدَىٰ﴾ (٢٠ / طه: ٨٢)

"اور اس میں شپنگ کے میں البتہ اس کی بڑی بخشاش کرتا ہوں جو تو پہ کرے اور یقین لائے

اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے۔“

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پائچ دفعہ غفار (بڑی بخشناسی کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عفو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آئیوں میں غفور (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہو گا کہ اس کے عفو و درگزر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، اللہ نے اپنی ساری صفتیں میں سے اپنی اسی صفت کی تجھی کاپرتوانیے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پرده دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے:

﴿أَوْ لَعْفُوا عَنْ سُوءِ قَاتِلِ اللَّهِ كَانَ عَفْوًا قَدِيرًا﴾ (٤ / النساء: ١٤٩)

”یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے والا قادر تر والا۔“

انسان اگر اپنے کسی قصور وار کو معاف کرتا ہے، تو اس کی قدرت بہر حال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصور واروں کو معاف کریں۔ *

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصور و اروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ

^٤ تفسیر ابن حجر، پاره ٦، ج ٦، ص ٤؛ و بحر محیط ابن حیان تفسیر سوره نساء، ج ٣، ص ٣٨٥.

ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا:

﴿وَلَيَعْفُوا وَلَيَصْفُحُوا أَلَا لَهُمُونَ أَنْ يَعْفُرَ اللَّهُ لَكُمْ طَوَّالُهُ عَفْوٌ رَّحْمٌ﴾ (۵)

(۲۴/النور)

”اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کر دیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم و الاء ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگزر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ پھیلیں پڑنی چاہیں، چنانچہ جن موننوں کے لیے اللہ نے جزاً خیر کا وعدہ فرمایا ہے، ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (۴۲/الشوری: ۳۷)

”اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔“

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جو ہر ہوتا ہے، وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غصب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں نہیں اختلاف درمیان میں ہے، کہ ان احمدقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے، ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لا یعنی گنتگلو سے اور بر ابھلا کہہ کر دیتے ہیں، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُونَ وَتَرَاهُمْ يَنْظَرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ حُذِّرُ

الْعَفْوَ وَأَمْرُ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضُ عَنِ الْجَهَلِينَ﴾ (۷/الاعراف: ۱۹۸-۱۹۹)

”اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاو تو (تمہاری ایک) نہ سئیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھتے نہیں، (اے پیغمبر) درگزر (کاشیوں) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔“

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے، یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے، اللہ نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا

اور فرمایا کہ ان ناگوار یوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو:

﴿إِذْ قَرُبَ إِلَيْنَاهُ هُنَّ أَحْسَنُ النَّاسَةَ طَهَّنْ أَعْلَمُ بِمَا يَصْفُونَ﴾ (۲۳) (المؤمنون: ۹۶)

”اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو بدی کا دفعیہ ایسے برداشت کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔“

ذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن اللہ نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگز رکا حکم دیا ہے:

﴿وَكَيْرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ قِنْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا قِنْ عِنْدِ آنْفِيهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحُقْقَ فَاعْفُوا وَاصْفُحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾

(۱۰۹/ البقرہ: ۲)

”(مسلمانوں)! اکثر اہل کتاب باوجود یہ کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حدکی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بناویں، تو معاف کرو اور درگز کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔“

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں، تو تم تو قیامت کی جزا اوسرا کے قائل ہو، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا، فرمایا:

﴿فُلَلِلَّدِينُ امْنُوا يَغْفِرُوا لِلَّدِينَ لَا يَرِجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَعْزِيزِي قَوْمًا يَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَلِنَفْسِهِ لَمَّا إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ﴾

(۴۵/ الجاثیة: ۱۴-۱۵)

”ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزا اوسرا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں، تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے، جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔“

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافرنے کسی مسلمان سے کوئی بد تحریکی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت انتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگز رکی نصیحت

فرمائی، ﴿تَفْسِيرُ كَبِيرِ اِمامِ رازِي زیر آیت بالاج ۵، ص: ۵۸۹﴾

غم و غصہ کے اخبار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگز رے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت مسٹح رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے رشید دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مالی امداد بند کر دی، ﴿اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا يَأْتِي أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعْدَةُ أَنْ يَوْمُوا أُولَى الْقُرْبَى وَالسَّكِينَ وَالْمُهَاجِرُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِيَعْفُوا وَلِيُصْفَحُوا أَكَانُوا تَبَيْعُونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

۱۔ اس تصریح کی آجیوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگز کی تفصیلت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگز کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے، لیکن مفسروں میں سمجھا یا لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگز کی تفصیلت کے درمیان کوئی متفاق نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تصریح میں کہ موقوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں "اس آیت (وَأَعْرِضُ عَنِ الْمُهْلِكِينَ) (۷/الاعراف: ۱۹۹)" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بد اخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیویوں وہ باقیوں اور مکہہ حرکتوں کا حجاب اسی تصریح کی باقیوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قال سے باز رہنے کی کوئی بہایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور شرکوں سے قابل میں کوئی تھاں نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں، تو شخص مانع کی ضرورت نہیں بھگنا طاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناخ وَمُنْوَثَ آجِیوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔ "جلد ۲ صفحہ ۳۹۶"۔ ایک اور آیت (إِذْ قَهْرَ الْأَقْرَبَى هِيَ أَخْسَنُ) (۲۲/المومنون: ۹۶) کی تصریح میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نری برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔ (ج ۲ صفحہ ۳۰۰)

آیت (وَإِذَا حَالَكُمُ الْجَهَلُونَ قَاتِلُوا سَلَمَاءً) (۲۵/الفرقان: ۶۳) کی تصریح میں فرماتے ہیں: "کلکنی اور ابوالعلائیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قال کے حکم نے منسوخ کر دیا، لیکن اس تاخت کے مانع کی ضرورت نہیں، کیونکہ امقوں سے حشم پوچی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عاقل اور شرعاً دلوں میں مستحسن ہے اور عزت و آبرو پر ہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔" (ج ۲ صفحہ ۳۹۷) طبع دار الطیاب عبد العالیہ مصر۔

آیت (أَمَّنْوَا بِغَفْرَوْنَ الظَّاهِرِينَ) (۴۵/جاثیہ: ۱۴) کی تصریح میں لکھتے ہیں: "اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان سے قابل نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قابل کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا شرع ہو گیا، لیکن قریب چوتھے ہے کہ اس آیت کے معنی ہیں کہ جھوٹی چھوٹی باقیوں پر کافروں سے بھگنا کیا جائے اور ان کی تکلیف وہ باقیوں اور وحشیہ حرکتوں سے درگز کیا جائے۔" (جلد ۲ صفحہ ۳۸۳) طبع مرکز پر ہے نزدیک آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور شرکوں اور دوسرے قصور اور دلوں کے ان قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق العباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے پہلی سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک اور عصيان الہی کے قصوروں کی معافی لازماً آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں اور قال و جواب حقوق الہی کے مقابلہ میں مشروط ہوا ہے اس لیے جہاد کی آئیں اس مغفرت اور عفو و درگز کے اخلاصی احکام میں خلل انداز نہیں، وہ منثور میں اسی عسا کر سے حضرت ابو مسلم خوارزمی صاحبی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی آیت کا فردہ اونڈہ کا قصور بھی آیت پر چکر معاون کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۲ صفحہ ۳۴۵) مصر

۲۔ تفسیر کبیر امام رازی، ج ۴، تفسیر سورہ نور، ص: ۶۵۲۔

(۲۴) / سورہ ۲۲

”اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشاکش والے ہیں، قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں بھرت کرنے والوں کو (مدخراج) نہ دینے کی قسم نہ کہا بینصیں، بلکہ (چاہیے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگزر کریں، (مسلمانوں) ! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تھہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس آیت کے آخری بٹکڑے سے ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہاد رجہ کی کشاوہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشاوہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صدقہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہاد رجہ کی وسعت رکھتا ہے:

﴿وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّيْكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوَاتُ وَالْأَرْضُ لَا أَعْلَمُ بِالْمَتَّقِينَ لَهُمْ الَّذِينَ يُنْقَلِّبُونَ فِي الشَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۳/آل عمران: ۱۲۳-۱۲۴)

”اور اپنے پروردگار کی بخشکش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاو (اتفا برائے) ہے جیسے زمین و آسمان، (کا پھیلاو، تجی بجائی) ان پر ہیزگاروں کے لیے تیار ہے، جو خوشحالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔“

اوپر کی آیت میں متقویوں کے دو صفت ایک ہر حال میں راہِ الہی میں دینا اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا اور ان کے لیے دو جزا میں، ایک اللہ کی مغفرت اور دوسرا دسیج جنت بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے، جس کی حدود پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہو گی کہ اللہ کی مغفرت ہمارے شامل حال ہو گی اور وہ احکم الٰہ کیمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عنود رگز رکی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزو شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنایت پسندی کے مترادف ہو جائے، اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجلیں کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانجپ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کردو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عنود رگز رکی

ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابُهُمُ الْبُغْيَ هُمْ يَنْتَهُونَ وَجَزَّاً وَسِيقَةً وَسِيقَةً فَمَنْ عَفَا
وَأَصْلَحَهُ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ طَائِهٌ لَا يَحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (الشوری: ٤٠-٣٩)

”اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے، تو وہ (وابی) بدل لے لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف کردے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے اور غفو و درگز رافرو اکا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں غفو و درگز رے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری حکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں، یادو ہوں جو انقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد غفو و درگز رخوداری کے منافی نہیں ہوتا، بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اشتغال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر غفو و درگز رکرتا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿وَلَكُنْ صَبِرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَيْكُنْ عَزْمُ الْأُمُوْرِ﴾ (٤٢/ الشوری: ٤٢)

”اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطلا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔“

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کروشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ إِذْ قَمَ بِالْتَّقْرِيبَ إِلَيْهِ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي يَنْكَرُ وَيَبْيَكُهُ عَدَاوَةً
كَانَتْ وَلَيْتَ حَمِيمٌ وَمَا يَلْقَهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَهَا إِلَّا دُوْحَقًا عَظِيمًا
يُنْزَعُنَّكَ مِنَ الشَّيْطَنِ نَزْعٌ فَأَسْتَعِدُ بِاللَّهِ طَائِهٌ لَا هُوَ السَّمِيمُ الْعَلِيُّمُ﴾

(٤١/ حُمَّ السجدة: ٣٦-٣٤)

”اور بھلائی اور برائی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے، ناتے والا اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جن میں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اگر (اس میں) شیطان کے کوچخے سے کوئی کوچخ تجوہ کو لگ جائے، تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ، بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔“

آیت کے اخیر لکھے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگز رکے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے، اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، کہ انہوں نے کہا:

”اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگز رکا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔“ ﴿

ابو مسعود صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مزکر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے، فرمارہے تھے کہ ”اے ابو مسعود! جتنا قابومن کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ اللہ کو تم پر ہے۔“ ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں؟ آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر روز ستر دفعہ۔“ ﴿ اس سے مقصود نبوی ﷺ تعداد کی تحد نہیں بلکہ عفو و درگز رکی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگز رکے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آ جائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گوفروی جذبہ کی تسلیکن ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بینچے جاتی ہے، مگر اس سے کسی پاسیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگز رکی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَمَا زَادَ اللَّهُ رَجُلًا يَعْفُو إِلَّا عِزًّا)) ﴿

”اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگز رکرتا ہے، نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔“

﴿ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورہ حم السجدة، ج ۴، ص: ۱۰۱ آیت مذکور۔

﴿ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب النہی عن ضرب الخدام: ۱۹۴۸ اور باب ماجاء فی العفو: ۱۹۶۹ میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔﴾

﴿ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی التواضع: ۲۰۲۹۔﴾

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصوردار سے اس کے لیے کوئی تعریض نہ کیا جائے، قدرت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (۲/ البقرة: ۲۲۵، ۵/ المائدۃ: ۱۰۱)

”اور اللہ ہے بخشش والا بردبار۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (۳/آل عمران: ۱۵۵)

”بے شک اللہ ہے بخشش والا بردبار۔“

﴿إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ (۱۷/ بنی اسراء: ۴۴، ۳۵/ فاطر: ۵۱)

”بے شک وہ (اللہ) ہے بخشش والا بردبار۔“

ان سب آقوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔ دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ﴾ (۴/ النساء: ۱۲)

”اور اللہ ہے جانے والا بردبار۔“

﴿وَكَانَ اللَّهُ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ﴾ (۵۹/ الحج: ۲۲)

”بے شک ہے اللہ جانے والا بردبار۔“

﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا﴾ (۵۱/ الاحزاب: ۲۳)

”اور ہے اللہ جانے والا بردبار۔“

ان آقوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بو جھے، یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

﴿وَاللَّهُ عَنِّيْ حَلِيمٌ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۳)

”اوَرَاللّٰهُ مُسْتَغْنٰی اور تخلٰ والا ہے۔“

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔ انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً: انتقام کے مقابلہ میں حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلم اور بردبار آدمی کی کمزوری کاراز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لیے اس نے اپنے حلم اور داروں گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں ماہیوں اور بردباری کے عبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَفْسَلَمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾

(۲/ البقرہ: ۲۳۵)

”اوْ جَانَ رَكْهُوكَ اللّٰهُ كَوْ مَعْلُومٌ هُبْ جَوْمَهَارَ دَلُونَ مِنْ هُبْ هُبْ، توَسَ سَهْ ذَرَتَ رَهْ اوْ جَانَ رَكْهُوكَ كَرَ اللّٰهُ بَخْشَشَ دَلَالَ هُبْ تَحْلَ والا“

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے، دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھی معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ذرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لیے اس سے پرامید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں خاصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

﴿إِنْ تَفْرِضُوا اللّٰهَ كُفُراً حَسْنًا يُضِعْفُهُ لَكُمْ وَيُعْزِّزُكُمْ وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ﴾

(۱۷/ التغابن: ۶۴)

”اگر تم اللہ کو فرض دواجھی طرح فرض دینا تو وہ اس کو دو گناہ کر دے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ ہے قدر دان اور تخلٰ والا“

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلے دودے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی تصور وار کے کسی تصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں، اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں، تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرمائروہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیاء کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ علیہ السلام کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بٹ پرست باب پ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الہی سے نجی جائے، انہوں نے اس کافرباپ کے ہاتھوں طرح طرح کلہم ہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے، جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہو گئی اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ أُسْتَغْفَارًا إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَكَيْفَةً إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ حَلِيمٌ ﴾ (٩٦: التوبہ)

”اور (نتحا) ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باب پ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باب سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو باب سے (مطلقًا) دست بردار ہو گئے، بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باب کے کافر ہونے کے باوجود اللہ سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)۔“

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوٹ کی بربادی کی خبر پا کروہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّلَاهُ مُنِيبٌ ﴾ (١١: هود: ٧٥)

”بے شک ابراہیم علیہ السلام بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔“

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگزر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال

کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصف میں اوہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے غفو و درگزرا اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا ہے:

﴿فَبَشَّرَنَاهُ بِعِلْمٍ حَلِيمٍ﴾ (۱۰۱: الصافات)

”تو ہم نے ان کو (ابراہیم علیہ السلام کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل علیہ السلام کے پیرو
ہونے) کی خوشخبری دی۔“

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا:

﴿يَا أَيُّهُ الْمُفْلِحُ مَا تُؤْمِنُ رَسُكْدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾

(۱۰۲: الصافات)

”اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تقلیل کیجئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابری
پائیں گے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزو ہے۔ حلم کی صفت اللہ کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا۔“ یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچ سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ دخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، آپ ﷺ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ”غصہ نہ کرو۔“ اگر غصہ آبھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”پہلوان و نہمیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔“ ایک اور حدیث میں ہے کہ ”جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ہٹھرائے گا۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ امیر کے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں، ۴ وہ کاٹتے ہیں میں بھلانی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں محل کوراہ دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ”اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو، تو تم ان کے منہ میں گرم را کھبھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔“

● ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الثاني والعلقة، ۲۰۱۱: بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغصب: ۶۱۱۴، ۶۱۱۶۔ ● ترمذی، ابواب البر والصلة، باب فی کظم الغیظ، ۲۰۲۱: یعنی صدر کم کرتا ہوں۔ ● صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم: ۱۵۲۵: واب المفرد امام بخاری، باب فضل صلة الرحم: ۵۲۔

رفق و لطف

رفق و لطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبه کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو مودہ لے اور پھر کو بھی موم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ”لطیف“ فرمایا ہے، ۱۰۰ اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے، ۲۰۰ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق و لطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطیف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پردازیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم و شرمندہ کر کے ان کے آگے سرگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيُّمُ الْحَكِيْمُ﴾ (۱۲ / یوسف: ۱۰۰)

”بے شک میر ارب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا حکمت والا ہے۔“
حضرت یوسف علیہ السلام کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، ان کی حکمت کو اللہ ہی جانتا تھا اور اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق و لطف کا انہیاں طرح فرماتا ہے:

﴿أَكَلَهُ طِيْفٌ يَعْبَادُهُ يَرْبُّهُ يَرْبُّهُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْقَوْيُ الْعَزِيْزُ﴾ (۴۲ / الشوریٰ: ۱۹)

”اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔“
اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے موننوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیجے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، حق میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطف الہی کا فرموم من دونوں کے ساتھ ہے کہ

۳۰۰ راغب اصفہانی ”لطیف“ کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ تھا ہے: ”وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں رہی (رفق) فرماتا ہے۔“ (لطف لطف المفردات فی غریب القرآن، لام مع الطاہص: ۳۶۶) امام تہمی کتاب الاماء والصفات میں نقل کرتے ہیں: ”اللہ کا نام طیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلاکی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور سرگز کے اسہاب کا فیضان کرتا ہے، طیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلاکی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعربی کا قول ہے، طیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔“ (صحیح البخاری: ۲۷۰)

امام غزالی کہتے ہیں: ”اس صفت کا سختی وہی ہے جو ناڑک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو زری کے طریق سے، حق سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مقید ہیں۔ جب عمل میں زری اور ادراک میں لطاافت ہوتا لطف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے۔“ (روح المعانی، تفسیر سورہ شوریٰ پارہ ۲۵، جزء ۲۵، ص: ۲۵)

۴۰۰ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الرفق: ۱۔ ۶۶۰۔

دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے، ۱۰ اور اس لیے قیامت کو رکھنا بھی اس کے الٹاف بے کران کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت حنفی کے پیشوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہ الہی میں گوید عاصتیاب نہ ہوئی، ۱۱ مگر ابراہیم علیہ السلام خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّلَةُ حَكِيلٍ﴾ (التوبۃ: ۹/ ۱۱۴)

”بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔“

اسی طرح جب وہ قوم لوٹ کی گناہ گار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گوئوں نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَكِيلًا أَوَّلَةُ مُنْبِيْبٍ﴾ (ہود: ۱۱/ ۷۵)

”بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔“

اوہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیتے تھے، وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یادیں کے نرم تھے، اس لیے جلد پیش جاتے تھے اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت حنفی کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام فرعون جیسے سگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيْسَا لَعْلَةً يَتَّبِعُكُمْ أَوْ يَغْنِيُهُمْ﴾ (طہ: ۲۰/ ۴۴)

”سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا (اللہ سے) ذرے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے دین حنفی کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ علیہ السلام کو رحمتِ الہی نے خاص طور سے اس کا حصہ و افر عنايت فرمایا تھا۔ خود حضور علیہ السلام کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

﴿فِيهَا رَحْمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ لِنَّتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَطَّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَأَنْفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ سَ﴾

(آل عمران: ۱۵۹/ ۳)

”تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مراج کے اکھڑا اور دل

۱۰ تفسیر روح المعانی میں متأثر کا ہیں کہ قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں (رج ۲۵، ج ۲۵: ۲۵)۔

۱۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پا کر اس کے بعد اس سے اپنی علیحدگی ظاہر کر دی۔

کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تر بڑھ گئے ہوتے۔“

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ صفت نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقة اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمت عالم ﷺ کی ذات پاک میں یہ صفت سب سے نمایاں طور پر دلیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردا بردا، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطیف اور نرم دلی و زرم خوبی ہے۔ جس طرح حسن فطرت زینت و آرائش سے دو بالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرم کی خوبی سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہ ؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا:

((الرُّفِقُ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يَنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ)) *

”زمی جس چیز میں ہواں کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے، اس کو بد نہ مانا دیتی ہے۔“

”جس چیز“ کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں زمی کام کو بنا دیتی اور سختی بگاڑتی ہے، الای کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہ ؓ سے مردی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ زرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔“ * جیری بن عبد اللہ ؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو زمی سے محروم رہا، وہ بھلائی سے محروم رہا۔“ * اور فرمایا کہ ”تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی اللہ اپنے سماں کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ زمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔“ *

اسی اخلاقی و صفت کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

((الاَخْبَرُ كُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَتَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارَ، عَلَى كُلِّ قَرِيبٍ هُنَّ

سهل)) *

”کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔“

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ۶۶۰۲۔

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ۱۱۰۱۔ * صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق: ۶۵۹۸۔ * ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب فیه أربعة أحادیث: ۲۴۹۴۔

* ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب فضل كل قریب هین سهل: ۲۴۸۸۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ نے پھر کہیں اور انہوں نے جواب میں کہا "وعلیکم السام واللعنة" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے ساتو فرمایا کہ "عائشہؓ نہ ہر جاؤ، اللہ تمام کا موس میں نہیں پسند کرتا ہے۔" بولیں، یا رسول اللہ ﷺ انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ ﷺ نے نہیں سناء فرمایا: "میں نے بھی تو کہہ دیا کہ علیکم یعنی "تم پر۔"

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس میں تختی کا نشان نہیں اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچ تو خود بخود اس کا دل شرمند ہو۔ شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس تختی کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں، تو ان کے شرکروں کے نہ سازشوں کے قلع و قلع کرنے کے لیے ان پر پوری تختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّٰبِيُّ جَاهِدُ الْكُفَّارِ وَالْمُنْفِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (۶۶/ التحریم: ۹)

"اے پیغمبر ﷺ! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر تختی کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَلَوُ الَّذِينَ يَلُوِّنُونَ مِنَ الْكُفَّارِ وَلِجَدُوا فِيْكُمْ غُلْظَةً﴾

(۱۲۳/ التوبۃ: ۹)

"اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے کہ وہ تم میں کٹا پن پائیں۔"

اسی طرح شریعت کے گناہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجر میں نہیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَأْخُذْ كُمْ يَهْمَارُهُ فِي وَبْنِي الْهُوَانَ كُلُّمُؤْمِنٍ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾

(۲۴/ النور: ۲)

"اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہوں۔"

آنحضرت ﷺ کے مکار مخلوق کے اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ نے کہا سے مردی ہے، اس میں بھی نرمی اور

بخاری، کتاب الادب، باب الرفق فی الامر کلہ: ۶۰۲۴

سخت کے موقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المؤمنین شیعہ فرماتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلتیں لیا، البتہ جب احکام اللہ کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔“ ❷ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں بلکہ ازواج مطہرات شیعہ تک پرکسی کسی کسی بات میں سختی برتری ہے۔ ❸ حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

”گو امام بخاری: اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن اللہ کے حق میں آپ اس قدر سختی سے کام لیتے تھے جس کا اللہ نے حکم دیا تھا۔“ ❹

آنحضرت ﷺ صحابہ شیعہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ”آسانی کرو، سختی نہ کرو۔“ ❻ شارح بن حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحثات میں سختی نہ برتری جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہواں میں شیعی نہ کی جائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہو گئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ذریعے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اسکیلے ہی خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ ارشاد ہوا: ”ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔“ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس گردن کے سو امیری کوئی ملکیت نہیں۔ فرمایا: ”لگا تارو و مہینے روزے رکھو۔“ گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی، پھر روزہ رکھوں، فرمایا: ”سماں مسکینوں کو کھانا کھاؤ۔“ عرض پرداز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے۔ فرمایا کہ ”صدقة کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوپاہارے لے لو، اس سے سماں مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو نج رہے وہ خود کھاؤ۔“ وہ صحابی شیعہ ہمی خوشی اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ میں نے تمہارے پاس تیکی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔ ❽

❶ بخاری، کتاب الادب، باب قول النبي ﷺ: يسروا ولا تعسروا: ٦١٢٦۔ ❷ باب ما يجوز من الغضب والشدة لا من الله تعالى، رقم الباب (٧٥)۔ ❸ فتح الباري، ج ١، ص: ٤٢٩۔

❹ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبي ﷺ: يسرا ولا تعسر: ٦١٢٥۔

❺ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی الظهار: ٢٢١٣۔

تواضع و خاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں:

﴿وَلَمْ يَكُنْ يَأْتُوا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سَوْفَ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۴۵/ الحجۃ: ۳۷)

”اور اسی کو بڑائی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔“

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کریں اور عاجزی و فروتنی برتبیں۔

تواضع و خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا صفت بتایا ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگز رکا، پھر مومنوں کے ساتھ پر محبت تواضع کا حکم دیا ہے:

﴿وَأَخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۵/ الحجر: ۸۸)

”اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَأَخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۲۱۵)

”اور اپنا بازو جھکا رکھاں کے واسطے جوتیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔“

اولاد کو مال باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آتا چاہیے:

﴿وَأَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِلِّ وَمِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (بنت اسرائیل: ۲۴)

”اوہ مال باپ کے لیے عاجزی کا بازو وہر و محبت سے جھکا دے۔“

”خفیض جناح“ یعنی بازو و جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پر نہ کے بازو کو کہتے ہیں، پر نہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوں کو جھکا دیتا ہے۔ اس سے یہ استعارہ ہے کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوں کو نیچے کر لیتا ہے اور سکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ صفت بتایا ہے:

﴿وَعَبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَسْتَوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هُوَنَّا إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجِهَنَّمُ قَالُوا سَلَامٌ﴾

(۲۰/ الفرقان: ۶۳)

”اور رحمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور

● کتاب المثل السائر، باب النزع الثاني فی التشبيه، ص: ۱۶۰ مطبوعہ مصر: ۱۹۳۴ھ و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذکر، ج ۵، ص: ۵۷۴ دار الطباعة العاصمة۔

جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔¹

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے اللہ کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ اللہ جب رحمت اور مہرب و کرم والا ہے تو اس کے بندوں میں علیق اللہ کے ساتھ تو واضح اور ملکساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

﴿وَلَا تُصْعِرْ خَدَّاكَ لِلتَّأْسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ فَحْشَاءٍ فَحْشَاءٌ
وَاقْصِدْ فِي مَشِّكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوِيكَ طَإِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصُوتُ الْجِنِّيِّ﴾

(۱۸-۱۹) / لقمان

”اور لوگوں سے بے رخی نہ کرو زمین پر اتر اکرنے چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شخصی خورے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کرو اور (کسی سے بات کرے تو) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بڑی سے بڑی آواز گدھوں کی آواز ہے۔“

اس آیت میں خاکساری اور توضیح کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کرنا نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شاید نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کر خیلی ہو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ توضیح خاکساری اور دنایت و پستی میں برا فرق ہے۔ توضیح خاکساری کا مشایہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور بیدانہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنایت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھو دے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روشن سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وہاں بخارنے ان کو کمزور کر کر کھاتا، اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ ﷺ نے صحابہ علیہ السلام کو حکم دیا کہ طواف کے قسم چکر کر کریں، تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔²

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ”بعض غرور کو اللہ ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا اللہ کو پسند ہے اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند۔“³

¹ مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف: ۳۰۵ و صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ۴۲۵۶۔ ² ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب ما يؤمر من انضمام..... ۲۶۲۹۔

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سرو سامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے، لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنادیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے۔“ * ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ”جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو اللہ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے۔“ *

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ دھی تھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو، تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔“ * اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشنوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

* ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في التواضع: ۲۰۲۹۔ * ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب البناء كله و بالي: ۲۴۸۱۔ * ابر داؤد، کتاب الادب، باب فی التواضع: ۴۸۹۵۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو بخوبی رکھے، تاکہ آپ میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مردود اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا، شکر یہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعا کیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزویات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک میں بھی دہرا�ا ہے:

﴿وَقُولُوا لِلّٰهِ أَسْمَاعُهُ﴾ (۸۳/۲) (الفرقہ)

”اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔“

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَقُلْ لِعَبَادِنِي يَقُولُوا إِنَّمَا هُنَّ أَحْسَنُ مَا إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَعُ عَنْهُمْ مَا إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْأَنْسَانِ عَذَّابًا مُّؤْتَمِنًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل) (۵۳:)

”اور اے (چنبر)! میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان بھئڑ پوانتا ہے آپ میں، بے شک شیطان انسان کا لکھا دشمن ہے۔“

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپ میں میل ملا پ پیدا کرتی ہے اور بد گوئی و بد کلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپ میں ملا پ اور مہر و محبت پیدا ہو۔ اسی لیے تنابز بالا لقب لیتی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو کافر یا منافق اور تحقیر کرنا ہتھ کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا:

﴿وَلَا تَلْبِذُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَبَّذُوا إِلَيْكُمْ لِإِنَّ الْأَنْفُسَ لَفُسُوقٌ بَعْدَ الْإِيمَانِ﴾

(۴۹/ الحجرات: ۱۱)

”اور نہ تم آپ میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو، ایمان کے بعد گناہگاری برناام ہے۔“

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهَرُ بِالشَّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ طَلِمَهُ﴾ (۴۸ / النساء: ۱۴۸)

”اللہ کو بربی بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظالموں کو بیان کرے)۔“

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجا ہے، نہ بذریانی اور فخش کلامی کرتا ہے۔“ * اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت سا اوپری ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیرخواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے۔“ * اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلہ خیر کے سوا پکھا اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنایہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی برا کہیے تو ہو سکے تو چپ رہو کے اس کی جزا اچھیں تو کل اس کوں کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا: ”دوزخ سے پکو، اگر چہ چھوہارے کے ایک نکٹرے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔“ *

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوسی صحابی رضی اللہ عنہ مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ ایہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا: ”جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔“ *

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اچھی بات صدقہ ہے۔“ * یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دل جوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی ممکحہ سے اس کے زخموں پر پھاہار کھا جاسکتا ہے اور پچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جاسکتی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ انجات کیونکر لے؟ فرمایا: ”اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویدا کرو۔“ * ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ذرہ ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو کپڑا کر فرمایا ”اس کا ذرہ ہے۔“ *

* ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في اللعنة: ۱۹۷۷ - * صحيح مسلم، كتاب اليمان، باب الحث على اكرام الجار: ۱۷۲ - * صحيح بخاري، كتاب الادب، باب طيب الكلام: ۶۰۲۳ -

* ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في قول المعروف: ۱۹۸۴ - * صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب فضل من حمل متعة صاحبه في السفر: ۲۸۹۱ - * ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء في حفظ اللسان: ۲۴۰۶ -

* ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء في حفظ اللسان: ۲۴۱۰ -

ایشار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکار ہے اور دوسرے کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام ﷺ میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مهاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی مکنتوں میں ان کو شرکیک کیا ۔ اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سواباتی ساری زمین مهاجروں کو دے دی تو انصار نے نہی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادابت پسند آئی اور ان کی مدح و ستائش کی۔ ۲

﴿وَالَّذِينَ تَبَعَّدُ الدَّارُ وَالْإِيمَانَ هُنْ قَبْلُهُمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً قَمِيًّا أَوْ تُؤْثِرُ وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ يِهُمْ خَاصَّةً ۚ وَمَنْ يُؤْقَ شَرَّهُ نَفِيسٌ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِعُونَ ۝﴾ (الحضر: ۹)

”اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مهاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں، اس پر جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مهاجروں) کو دیے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مهاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاں پائیں گے۔“

بھریں جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ ”میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔“ ان ایشارے کے پکروں نے عرض کی، جب تک ہمارے مهاجر بھائیوں کو کبھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں۔ فرمایا ”اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچی گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔“ ۳

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت

۱- صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین۔

۲- تفسیر آیت ذیل ابن حیرہ طبری، پارہ ۲۸، ج ۲۸، ص: ۲۷۔

۳- صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول النبی ﷺ للانصار۔

میں پیش کی، آپ ﷺ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تھنڈ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ بھجے عنایت ہو، آپ نے اسی وقت اشار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہ ﷺ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رہ نہیں فرماتے۔ تم نے کیوں مانگ لی؟ بولے، ہاں میں نے توبہ کرتے کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ *

ایک دفعہ ایک بھوک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانہ نبوی ﷺ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص آج رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔“ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا۔ بولے، بچوں کو سلا دو اور چرا غ کو بھادو۔ ہم دونوں رات بھر بھوک کر رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھار ہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صحیح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔“ *

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے، اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے * لیکن قرآن پاک کا سیاق و سبق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والخاء: ۶۰۳۶ و کتاب الجنائز، باب من استعد الكفن: ۱۲۷۷۔ * صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضيف وفضل ایثاره: ۵۳۵۹ و صحیح بخاری، کتاب التفسیر: ۴۸۸۹۔ * ایضاً۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسلموں کے افراط و تفریط کے پیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو «امۃ و سلطًا» ”پیغ کی امت“ کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان میں یہ بھی ہے کہ ان کا نہ ہب افراط و تفریط کے درمیان ہے، ۲۱ اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔ دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغْ بَيْنَ ذَلِكَ سَيِّلًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”اور تو نہ پکارا پی دعا (نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے پیغ میں راہ۔“ یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نماش ہو جائے، یا مخالف اس کوں کر بر ابھلا کئے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے پیغ کی راہ اختیار کی جائے۔ ہماری چال کیسی ہواں کی نسبت حضرت لقمان علیہ السلام کے نصائح میں ہے:

﴿وَاقْصُدْ فِي مَشِيْكَ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۹) ”اور چل پیغ کی چال۔“

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریا کار زاہدوں کی نماشی چال بن جائے۔ ۲۲

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سارے مذہبوں نے اس پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹاسکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتمادی سے پر ہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک اتنے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے۔ فرمایا:

﴿وَلَا جَعْلْ يَرَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنْقَكَ وَلَا تَبْطِلْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مُلْوِعًا مَسْوِعًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۲۹)

”اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔“

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا أَمْيَسْ فُوْلُ وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۷)

۲۱ تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ)، ج ۱، ص: ۵۳۲۔ ۲۲ ابن جریر طبری تفسیر سورہ لقمان، ج ۲۱، ص: ۴۴؛ روح المعانی تفسیر سورہ لقمان جزء ۲۱، ص: ۸۱۔

”اور جو خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہواں کے درمیان اعتدال سے۔“

یعنی نہ اسرا ف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو۔
صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اکلفوا من الاعمال ما تطیقون)) ﴿١﴾
”اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو۔“

”عمل“ کا لفظ گویہاں عام ہے، مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں۔
مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو،
دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں، بلکہ
وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔ مند بزار میں حضرت حدیفہ ؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿٢﴾

((ما احسن القصد فی الغنی، ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادة))

”دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔“

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قاروں وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا تھاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوه عز و جاه اور عیش و تعمیر کی زندگی بر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر غنی اور متبدل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نحتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گرجانا چاہیے۔ عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو مخواڑ کھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھنڈوں کے لائق شر ہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعون ؓ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر پچا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا: ”کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔“

﴿١﴾ صحیح بخاری، کتاب الرفق، باب القصد والمداومة على العمل: ٦٤٦٥ وفتح الباری، ج ١١، ص: ٢٥٦۔

﴿٢﴾ بروایت کنز العمال جلد ثانی، ص: ٧۔

خودداری یا عزت نفس

یہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے کھانے پینے، اوڑھنے پہنچنے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفت، نہ اخلاق کی اوپرچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔ یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند در بر تر ذاتِ الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہبھتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَزِيزٌ لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت والا۔ اور غالب، کہیں کہیں عَزِيزٌ کے ساتھ قویٰ (قوت والا) یا مقتدر (اقدار والا) بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی کچی عزت ہے، جو اس کے وسیلے سے حاصل ہوا سلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب کار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا:

﴿أَيَّتُقْنُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةُ فَإِنَّ الْعِزَّةَ يَلِهِ الْجَمِيعَ﴾ (۴/ النساء: ۱۳۹)

”کیا ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔“

فرمایا، اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾ (۱۰:۵ فاطر)

”جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔“

﴿وَتَقْرُئُ مَنْ نَشَاءُ وَتُنْزِلُ مَنْ تَشَاءُ﴾ (۲۶/آل عمران: ۲۶)

”اے خدا تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔“

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوث کرمدینہ کے معززان ذیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نحوہ باللہ) محمد ﷺ کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكُنَ الْمُنْفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۸: المناافقون)

عزہ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور تھوت (حیثیت) کی معنوں میں آیا ہے، اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے، جو سیاق و سیاق کے مناسب ہو، اس کا اصل معنی جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: ”کسی کا ایسی حالت و مزاجت میں ہونا کہ اس کو کوئی دہانہ سکے۔“ دیکھو لسان العرب، ج ۲، ص ۲۳۷، و مفردات راغب اصفہانی، ص ۳۳۶، اور ابن حجر یطبری آیات عزت و سورہ کو تقریب و نہاد و منافقوں۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ المناافقون: ۴۹۰۷۔

”اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے، لیکن منافق نہیں جانتے۔“

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی جھینی نہ جائے گی، اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اوپنچار ہنا چاہیے۔ اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیمِ محمدی ﷺ کے اثر سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل اسی تصحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا: ”بے شک ایسا ہی ہے۔“ عرض کی، تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں؟ ارشاد ہوا: ”میں خدا کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدد و نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسول خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگئے تھی اور واقعہ نے فبلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوہ الخندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کوتا لئے کے لیے قبلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (بکھور) کا تھائی حصہ دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصار رضی اللہ عنہ کے سرداروں کو بلا کراپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:

”یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم توں کو پوجا کرتے تھے اور اللہ سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور ﷺ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں۔ ہم ان کو یوں اپنا مال دیتا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم! ہمیں اس معاملہ کی ضرورت نہیں۔“ *

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسری کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسری کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جب تک مسلمان رہے، یعنی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولاد المعز میوں کا باعث تھا اور سائز ہے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرًا أُخْرِجْتُ لِلنَّاسِ﴾ (۱۱۰:آل عمران: ۲/۳)

* صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد: ۲۷۳۲، ۲۷۳۱۔ ** سیرۃ ابن ہشام، الخندق و قربیظہ والنضیر، ج ۲، ص ۶۱۱ و تاریخ طبری ذکر واقعة احزاب بستد، ج ۳، ص: ۱۴۷۴۔

”تم بہترین امت ہو جلوگوں (کی سر برائی) کے لئے ظہور میں لائی گئی۔“

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علیؑ سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا: ”غرور نہیں خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مخلصی نہیں۔“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی 『وَإِلَهُ الْعَزَّةُ وَكَرَسُولُهُ وَلِلْمُؤْمِنِينَ』 (المنافقون: ۸)

ایک مسلمان صالح بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولیں، کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جانے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔ ۲ یہ خودداری کے عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگز رکنا پڑتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

﴿وَإِذَا أَمْرُوا بِالْكَفْرِ فَلَمْ يَأْمُرُوا كَمَا أَمْرُوا﴾ (۲۵ / الفرقان: ۷۲)

”اور جب وہ ہوکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔“

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ کھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔ اس اخلاقی خودداری، اور شریفانہ رکھ کھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا بین یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی بوتک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزو شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص کے دل میں ذرا بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ ”خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔“ ۳ اسلام میں صاف سترے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا، جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ ”کیا

۴ یہ قول امام رازی، تفسیر بکیر تفسیر سورۃ المنافقون، ج ۲، ج ۲۹، اور صاحب روح المعانی نے سورۃ منافقون ج ۲، ج ۲۸، ج ۱۰۲ کی آیت ﴿وَإِلَهُ الْعَزَّةُ﴾ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔ ۵ تمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الكبر: ۱۹۹۹۔

اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟، ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھتے تو فرمایا: ”کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا؟“ ❶ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا: ”تمہارے پاس کچھ مال ہے؟“ اس نے کہا، اونٹ بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ”جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔“ ❷

خودداری کا سب سے بڑا مظہر و قاریعی سمجھیگی اور ممتاز ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی بدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلَاةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ وَلَا تُسْرِعُوا)) ❸

”جب تم اقامت سنلو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔“
لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تک بزرگ نہیں یا کوئی میلتے ہیں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز ممتاز کے خلاف ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ آہستہ چلنا، رُگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔ وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابو داؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:
((الْهَدِی الصَّالِحُ وَالسُّمْتُ الصَّالِحُ وَالا قِنْصَادُ جَزْءٌ مِنْ خَمْسَةِ وَعَشْرِينَ

جزء من النبوة)) ❹

”نیک طور طریق، نیک انداز اور میانہ روی، نبوت کے کچیں اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔“
کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار نہ ملتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دل کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل و صورت، وضع و لباس اور اپنی عام روش میں باوقار ہے اور نیک مسلمانوں کا طور و طریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور موچھ کے ترشوانے اور خستہ کرانے کا جو حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا، وقار۔ بولے، خداوند امیرے وقار کو اور بریڑھا۔ ❺

❶ ابو داؤد، کتاب اللباس، باب فی الخلقان و فی غسل الثوب: ۴۰۶۲۔ ❷ ایضاً: ۴۰۶۳۔

❸ بخاری، کتاب الاذان، باب لا يسعى الى الصلوة ولیاها بالسکينة والوقار: ۶۳۶۔

❹ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی الوقار: ۴۷۷۶۔ ❺ ادب المفرد، باب الختان للکبیر: ۱۲۵۰۔

فقر و فاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے خودداری ظاہر ہوتی ہے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استغفار ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصرف ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اصحاب صدقہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

﴿لِلْفَقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَيِّئِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِعُونَ ضَرِيًّا فِي الْأَرْضِ ۖ يَسْبِمُهُمْ﴾

﴿الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۖ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمُهُمْ لَا يُسْتَوْنَ النَّاسُ إِلَيْهَا طَاءٌ﴾

(بقرہ: ۲/ ۲۷۳)

”(خبرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جانہیں سکتے، بے خبران کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھیے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔“

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقردوں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحب کشاف نے «لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلَّا حَافَّاً» کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ”وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن بنا پر حاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے، بلکہ ذریٰ کے ساتھ کرتے ہیں۔“ * لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں، ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی، اصحاب صدقہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کوخت تکلیفوں میں بہلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے، لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی بنا پر حاجت و اصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علمتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے لیے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لیے یہ حالت خود بنا پر حاجت و اصرار کا سوال ہے، لیکن جب خدا کہتا ہے کہ اصحاب صدقہ لوگوں سے بنا پر حاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پہنچے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو بنا پر حاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ *

* تفسیر سورہ بقرہ، ج ۱، ص: ۱۷۹۔ ۲ تفسیر کبیر جلد ثانی، ص: ۵۲۶، ۵۲۷۔

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ”جو شخص بیمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک نکڑا بھی نہ ہوگا۔“ یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہو گی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ ﷺ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ”میرے پاس جو کچھ ہو گا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا،“ جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطا یہ کہ کوئی نہیں دیا۔“

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دو نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔“

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے، لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً: اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ کوئی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گویظا ہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا۔ اسی لیے کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات تھی: ((لَأَتَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا)) ”تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔“ ان میں سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پران کا کوڑا اگر جاتا تھا، تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت نہیں دی، پھر فرمایا کہ ”اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو۔“ ﴿ صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پرسوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاحظت کے ساتھ اس کو روک دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ

ابرداود، کتاب الزکوہ، باب کراہیۃ المسئلۃ: ۱۶۴۲، ۱۶۴۳ و باب فی الاستغفار: ۱۶۴۴ تا ۱۶۴۶ میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں بیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پردازیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں بھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ پڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو، گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے، جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی براہی سے پاک اور ہر دنست اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔ اس باب کا خاتمه ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ ترک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے واضح اور دل کی خاک ساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو انچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مغلظ اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سر بلند رہے اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و بد بہ کے لیے ظاہری نمائی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے۔ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم میوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جاری ہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچنے سے سلاسل اسلام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمر بن الخطاب نامہ سے اتر آئے، پاؤں سے چربی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور نامہ کی مہار کپڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرمانبردار رضی اللہ عنہم میوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابو عبیدہ بن الخطاب نے عرض کی، یا امیر المؤمنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹی کی کیلیں آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے کپڑا کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنہ آیا ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا، اے ابو عبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کرامت محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے، اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے، تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔

﴿ مستدرک حاکم، کتاب الایمان، ج ۱، ص: ۶۲، علی شرط الصحیحین - ﴾

شجاعت اور بہادری

قدیر (قدرت والا) قادر، مُقتدر، قوی، جبار، (جس کو کوئی پچھاڑنے سکے) قاهر (جو ہر کسی کو دبادے) غالب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پروپریتی ہے تو اس میں اخلاقی و جسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام اسی وہ مذہب ہے، جس نے اپنے پیر و دوں میں شجاعت و بہادری کے جو ہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاته کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برآ ہوتا ہے، اس لیے تعلیم محمدی علیہ السلام نے بہادری و شجاعت کو سراہا اور اس کے متعاقوں کی تعین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نکیوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل و قتوں کا بہادرانہ مقابلہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کا میاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جوختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لا رائیوں میں داد مردگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:

«وَالظَّيْرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَجِئْنَ الْبَأْسِ † أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا طَوَّافًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ» (۲/ البقرة: ۱۷۷)

”اور جوختی اور تکلیف اور راثائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقدم ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپرے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے، جو اپنے موصوف کو راست بازاو مرتبی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان نکل کی بازی لگادے اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست بازا اور سچا ٹھہرتا ہے۔ جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے، وہی القا کا مشاہدہ، ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:

«يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَيَتَمُّ الَّذِينَ كُفَّارٌ وَّ حَفَّاً فَلَا تُؤْلُهُمُ الْأَذْبَارُ»

(۱۵/ الانفال)

”اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میراں جنگ میں مقابلہ ہو تو ان کو پیغام دو۔“
یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرع ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیغام پھیر کر بزدلی نہ

دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈلے رہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ”ایمان والے“ کہہ کر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی ”ایمان“ مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزرگی سے دشمن کو پیچہ دکھائے گا، وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہو گا:

﴿وَمَنْ يُوَلِّهُمْ بُوْمَيْدَ دُبْرَةً إِلَّا مُتَعَرِّفًا لِّيَتَالِ أَوْ مُتَعَيِّنًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَأْءَ بِغَضَبِ قَنَّ

اللَّهُوَمَا أَوْهُ جَهَنَّمَ وَكِيسَ الْمَهْرِيُّ﴾ (۸/ الانفال: ۱۶)

”اور جوان کو اس دن پیچھے دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو، یا کسی (مسلمان) دستے سے جامانتا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کاٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا براثٹکا نہ ہے۔“
یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیچھیں دکھانی چاہیے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجادی حکم دیتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيْتُمْ فِيَّةَ قَاتِلُوْنَا﴾ (۴۵/ الانفال: ۴۵)

”اے ایمان والو! جب تم کسی دستے سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔“

یعنی اپنی جگہ پر جنم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو گھنی خاطر میں نہیں لاتے۔

﴿أَشِدَّ أَعْلَى الْكُفَّارِ﴾ (۴۸/ الفتح: ۲۹)

”وہ کافروں پر زور آور ہیں۔“

اُشدَّ آءَ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زور مندا اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَأَعْدُوا لَهُمْ مَا أَسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ يَّابَاطِ الْخَيْلِ ثُرُّهُوْنَ يَهُ عَدُوُ اللَّهِ وَعَدُوُّكُمْ

وَآخَرِينَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْهُمْ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (۸/ الانفال: ۶۰)

”اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا تیار کرو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنمیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو۔“
اس ”قوت“ کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ و قتل سے کی گئی ہے، مثلاً: قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معنا مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔ *** غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جو ہر پیدا کرنے**

* تفسیر طبری، تفسیر سورہ انفال آیت مذکورہ پارہ، ۱۰، جزء ۱۰، ص: ۱۹۔

اور جنگی سامان والجھ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں اور ان سے معابدہ کر کے توڑنے کی بہت نہ کر سکیں۔
برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی، متوجہ ہو رہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر نہ مرت کے ساتھ کیا:

﴿كَائِنَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۚ﴾ (٨ / الانفال: ٦)

”گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔“

سورہ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یقشہ کھینچا ہے:

﴿فَإِذَا جَاءَهُمُ الْخُوفُ رَأَيْتُهُمْ يَنْتَظِرُونَ إِلَيْكُ تَدْرُ أَعْيُّنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۝﴾ (٣٢ / احزاب: ١٩)

”جب ذر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف نکل کر دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے۔“

سورہ محمد میں ان کی دلی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

﴿فَإِذَا أُنْزِلَتُ سُورَةً فَتَنَكِمُوا وَذَكَرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ

يَنْتَظِرُونَ إِلَيْكَ نَظَرًا مَعْنَوِيًّا عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَى لَهُمْ ۝﴾ (٤٧ / محمد: ٢٠)

”جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھے گا کہ سکتے ہیں، تیری طرف جیسے تکشی لگائے وہ جس پر موت کی بے ہوشی ہے، سو خرابی ہوان کی۔“

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا:

﴿وَإِذَا رَأَيْتُمُ تَعْجِيلَكُمْ أَجْسَامَهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعُ لِقُولِهِمْ كَائِنُهُمْ خُشُبٌ مَسْنَدَةٌ ۝

يَكُسُبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۝﴾ (٦٣ / المنافقون: ٤)

”اور جب تو انہیں دیکھے، تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو نہ، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، جو کوئی چھے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔“

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہ اور موتا کی سے نہیں، بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں۔ دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سمجھے اور گھٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا گھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی

لہوں کو نیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تر نگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں، اس لیے ذرا خلینے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے بیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جو جو ہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گواں میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضمکہ اڑایا ہے، اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اس بنا پر وہ اپنے بیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جو ہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے، جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

① جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضل الہی اور نصرت خداوندی چاہیے۔

② ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹال نہیں سکتی اور جب سکن نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

③ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا افڑہ حل جاتا ہے اور جو اس غرام میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلت و کثرت

تعداد کی قلت و کثرت پر جدوجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر محصور ہے، تعداد کو کتنی بھی جھوٹی ہو، اگر اس میں ایمان و یقین کی قوت موجود ہے تو بفضلی خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ یافتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طاولت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان محض نظر لفظوں میں سمجھا دیا ہے:

﴿كُمْ قِنْ فَيَّةٌ قَلِيلَةٌ غَلِبَتْ فَيَّةٌ كَثِيرَةٌ يَأْذُنُ اللَّهُ﴾ (۲۴۹: البقرة)

”کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے۔“

حضرت موسیؑ جب بنی اسرائیل کو آمادہ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور رکھتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے:

﴿إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَيَّانِينَ﴾ (۵/ المائدۃ: ۲۲)

”اس میں تو ایک زبردست قوم ہستی ہے۔“

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَلِيُونَ وَعَلَى اللَّهِ فَتُوَكِّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾

(۲۳) المائدة/۵

”توجب تم شہر کے پھانک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔“

بدرا و راحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَلَئِنْ تُغْنِي عَنْكُمْ فَتَنَمُّ شَيْئًا وَلَئِنْ كَفَرْتُ لَا وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾

(۱۹) الانفال/۸

”اور تم کو تمہارا جھٹا کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔“

﴿فَإِذَا عَزَّمْتَ فَتَوَكَّلْنَ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ إِنْ يَتَصَرَّفُكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبٌ لَّكُمْ وَإِنْ يَجْدُلْ لَكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ قُنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلَيْتَوْكِلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴾

(۱۶۰-۱۵۹)آل عمران/۳

”توجب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہو گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔“

فتح و نکست حکمِ الہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ (۱۰) الانفال/۸

”اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب، حکمت والا ہے۔“

تعداد کی قلت کی تلاشی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ ان کو قاعدہ بنانے کر بھیش کے لیے خوش خبری سنادی، فرمایا کہ ایک پا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور نیس ایسے مسلمان دسوکی فوج پر بھاری ہوں گے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضْ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقَتْالِ إِنْ يَكُنْ قَنْمُ عِشْرُونَ صَارِبُونَ يَغْلِبُونَا مَا نَتَنِّي وَإِنْ يَكُنْ قَنْمُ مَائِةً يَغْلِبُونَا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كُفَّارًا إِنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَقْهَرُونَ ﴾

(۶۵) الانفال/۸

”اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے میں صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں، اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں، کیونکہ وہ سمجھنیں رکھتے۔“

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی تادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و تکلی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس انہم بصیرت سے محروم ہیں۔ اس کے بعد آزمائش کی تختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی، پھر بھی یہ زمی وہ ہوئی جو آخر بھی مرد انگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈال گا میں:

﴿فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ فِي أَنَّهُ صَابِرٌ يَعْلَمُوا مَا تَنْهَىٰ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَفَلَمْ يَعْلَمُوا أَلْفِيْنَ يَادُونَ

اللَّهُ وَأَنَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾ ۱۶﴾ (الانفال: ۱۶)

”تو اگر تم سے صوابر (ثابت) رہیں تو وہ سوپر غالب ہوں اور اگر تم سے ہزار ہوں تو وہ ہزار پر حکم خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔“

اس تعلیم کے نشکنی تیزی اور تندری دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بھدا اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان اڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین ایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پرانیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ سائز ہے تیرہ سو سال سے ہے کہ

﴿سَلْقُونَ فِي قُلُوبِ الظَّالِمِينَ كُفَّارُوا الرُّعْبُ﴾ (آل عمران: ۱۵۱)

”ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔“

﴿سَالِقُونَ فِي قُلُوبِ الظَّالِمِينَ كُفَّارُوا الرُّعْبُ﴾ (الانفال: ۱۲)

”میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔“

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور اڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بڑے بھڑے تھیار ڈال دینے پر بھجوں ہوئے۔

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبُ﴾ (الاحزاب: ۲۳)

”اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔“

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبُ﴾ (الحشر: ۲)

”اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔“

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یقوت باقی ہے اللہ کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ذرہ ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو نہ لٹل سکتا ہے اور نہ بڑائے آسکتا ہے، اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمد ﷺ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے، غزوہ احمد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَيْفَا مُؤْجَلٌ﴾ (۱۴۵/آل عمران: ۲۳)

”اور کسی جان کے نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا ہو اوقت مقرر ہے۔“

جب اللہ کا حکم ہو گا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدی کیوں چھائے، جنگ احراب میں جب منافقوں کو گبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

﴿فُلْنَ لَنْ يَتَفَعَّلُ الْفِرَارُونَ فَرَرُّتُمْ قَنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ﴾ (۳۳/الاحزاب: ۱۶)

”اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔“

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے، سراپا غلط ہے، جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی، وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا:

﴿فُلْنَ لَوْكُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ﴾

(۱۵۴/آل عمران: ۲۳)

”اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑا اوپر آ جاتے۔“

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلا نا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں:

﴿لَوْكَانُوا عِنْدَنَا مَا مَا تَوْا وَمَا فَتَلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذِلْكَ حَسَرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُعْلِمُ وَيُؤْمِنُ﴾ (۱۵۶/آل عمران: ۲۳)

”اگر یہ مر نے یا مارے جانے والے ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس لیے ان کے دل میں آتا ہے، تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حرست بنائے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔“

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول اڑائی میں نہ جاتا تو مارنا جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات صحیح ہے تو وہ اپنی موت نال سکتے ہیں تو نال لیں:

﴿فُلْنَ فَادْرُعُوا عَنْ أَنْقِسْكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِنَ﴾ (۱۶۸/آل عمران: ۲۳)

”اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔“

جو مسلمان ذرا ول کے کمزور تھے، ان کے خطرے کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی:

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَكْتُبُونَ النَّاسَ كَخَشِيَةَ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَاتُلُوا رَبِيعًا لِمَ كَتَبَتْ عَلَيْهَا الْقِتَالُ لَوْلَا أَخْرَجْنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَلَمْ يَأْتِ مَنْ كَانَ مَعَ الدُّنْيَا قَبْلِنَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّيَعْنَى أَنَّقِيَ وَلَا تَظْلَمُونَ فَتَيَّلَهُ أَئِنَّ مَا تَنْهَوْنَ عَنِ دِيْرِكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّسَيَّدَةٍ﴾ (۴/ النساء: ۷۷-۷۸)

”پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر!) جواب دے کر دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آختر پر ہیز گار کے لیے بہتر ہے اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پا لے گی، اگر تم مضبوط قلعوں میں ہو۔“

غرض کیسی بھی تم جا کر رہو موت سے چھکا رائیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراو، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو، جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعَ اللَّهُمَّ فَاخْشُوهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَاتَلُوا حَسْبَنَا اللَّهُ وَنَعَمُ الْوَكِيلُ﴾ (۳/آل عمران: ۱۷۳)

”وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے، سوتھم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑا دیا اور بول اٹھئے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کار ساز ہے۔“

شهادت اور غزوہ اکارتبہ

میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدله میں بکا ہوا ہے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی نیچ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ فَيُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَفَيَقْتَلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾ (۹/ التوبہ: ۱۱۱)

”اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے

جنت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔“

اس سے پہلے سورہ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر کچے ہیں، اعلان ہے:

﴿فَلِيقَاٰٰلُ فِي سَيِّٰلِ اللَّٰهِ الَّٰذِينَ يَكْرُوُنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالآخِرَةِ وَمَنْ يَقَاٰلُ فِي سَيِّٰلِ

اللَّٰهُ فَيُقْتَلُ أَوْ يُغْلَبُ فَسَوْفَ تُؤْتَى هُوَ جُنَاحٌ عَظِيمًا﴾ (٤٠ / النساء: ٧٤)

”تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدله بیچتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑتے

پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔“

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:

﴿فَالَّٰذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيٰرِهِمْ وَأُدْوَافِي سَيِّٰلِ وَقَتَلُوا وَقَتَلُوا لَا يَكُونُ عَنْهُمْ

سَيِّٰلَهِمْ وَلَا دُخْلَهُمْ جَنَّٰتٍ﴾ (٣٢ / آل عمران: ١٩٥)

”تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں

ستائے گئے اور لڑتے اور مارے گئے، اتنا روں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو

جنت میں۔“

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت ثنا کی وہ ان کی زندگی تھی، وہ ان کو از سر نواسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کشیدہ مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:

﴿وَلَا تَحْسِبَنَّ الَّٰذِينَ قُتِلُوا فِي سَيِّٰلِ اللَّٰهِ أَمْوَاتٍ بَلْ أَٰحْيَاهُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُوْزَقُونَ

فَرِّجِينَ يَٰٰاٰتُهُمُ اللَّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (٣٢ / آل عمران: ١٦٩)

”اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس

روزی پاتے ہیں، خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔“

ان کی اس زندگی کو گواں دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لَيْسَ يُقْتَلُ فِي سَيِّٰلِ اللَّٰهِ أَمْوَاتٍ بَلْ أَٰحْيَاهُ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ

(١٥٤ / البقرة: ٢)

”اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔“

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجردہ عالم دوام ما لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں۔ اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اوپنجا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی

ہے۔ اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی۔ فرمایا:

﴿تَبَغْفِلُ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَعَانِيهِ كَثِيرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ قَبْلُ قَمَّةِ اللّٰهِ عَلٰيْكُمْ فَتَبَغْفِلُوا﴾ (٤ / النساء: ٩٤)

”چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سوال اللہ کے پاس بڑا مال غیمت ہے، تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔“

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ و انقام کے لیے لڑتا ہے، تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا ہے:

﴿مَنْ قَاتَلَ لِنَكُونَ كَلِمَةً اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَيِّلِ اللّٰهِ﴾

”جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے، اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کبھی گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ۔“ سوتھم اپنا اجر پاچکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا پکا۔“ غرض جس شجاعت کا مقصد اصلی ریا و نمائش ہو، اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد میں اعلانے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے، تو اسلام نے اس کو برائیں کہا ہے ﴿کیونکہ اس فخر کا منشأ بھی کلمۃ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔﴾

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تختیر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ”بعض ناز و تختیر کو خدا ناپسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تختیر کو پسند کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے ﴿کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔“ ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لجه میں کہا، لوگوں میں اکوئے ہوں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

”یہ فخر اس فخر سے الگ ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز و تختیر سے قریب ہے، جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔“

۱ صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب من قاتل لن تكون كلمة الله هي العليا: ٤٩٢٠، ٤٩٢٢ وصحیح بخاری، كتاب الجهاد بباب من قاتل لن تكون كلمة الله هي العليا فهو في سيل الله: ٢٨١٠۔

۲ صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب من قاتل للرباء والسمعة استحق النار: ٤٩٢٣، جامع ترمذی، أبواب الزهد، باب ما جاء في الرباء والسمعة: ٢٢٨٢۔ ﴿فتح الباری، ج ٦، ص: ٢٢ شرح حديث مذکور۔﴾

۳ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الخبلاء في الحرب: ٢٦٥٩۔ ﴿فتح الباری، ج ٦، ص: ١١٤۔﴾

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم و ثبات کے عربی الجہہ میں فرمایا:

((اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبُ اَنَا اُبْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ))

"میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔"

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں، اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا، چنانچہ اس وقت غیثم کے تیروں کی بارش سے گواہ لوگ بہت گئے، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنشیں نہیں فرمائی۔ *

صحابہؓ میں کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہیں تھا بہادر تھے، ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو اونھر بڑھا، وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے، آپ ﷺ گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا: "خوف کی کوئی بات نہیں۔" * ایک موقع پر جب بدیویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ ﷺ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزول نہ پاؤ گے۔" * بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے، جس سے پناہ مانگتی چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاویں میں جن چیزوں سے پناہ مانگتی ہے ان میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز) کا بیلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپ سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے، پناہ مانگتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے * ایک روایت میں ہے کہ "انسان میں سب سے بڑی بد اخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل بڑا دینے والی بزدلی ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ صحابی نے ایک خط لکھ کر بھجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جب دشمن سے مقابلہ آپ پڑے تو ثابت قدم رہو۔" * اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو سڑھتیہ سو بر س سے مسلمانوں کے بچپن کی زبان پر ہے:

((وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السَّيُوفِ)) *

"یقین کرو کہ بہشت تکواروں کی چھاؤں میں ہے۔"

❶ صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب قول الله تعالى: ويوم حنين ..: ۴۳۱۵: وكتاب الجهاد، باب بغلة النبي ﷺ: ۲۸۷۴۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوۃ حنين: ۴۶۱۶۔

❸ صحيح بخاری، كتاب الجهاد وباب الحمائل وتعليق السيف بالمعنى: ۲۹۰۸۔

❹ بخاری، كتاب الجهاد، باب الشجاعة في الحرب والجنين: ۲۸۲۱۔ ❺ بخاری، كتاب الجهاد، باب ماتتعوذ من الجنين: ۲۸۲۲، ۲۸۲۳۔ ❻ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الجراة والجنين: ۲۵۱۱۔

❻ صحيح بخاری، كتاب الجهاد، باب الصبر عند القتال: ۲۸۳۳۔ ❾ صحيح بخاری، كتاب الجهاد، باب الجنۃ تحت بارقة السیوف: ۲۸۱۸۔ وبا کان النبی ﷺ اذا لم يقاتل اول النهار اخر القتال حتى تزول الشمس: ۲۹۶۶۔

استقامت

”استقامت“ کے لفظی ”معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مثکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، مگر حق سے منہ پھر اجاگئے اور اس راستہ پر ثابت قدی کے ساتھ چلا جائے۔ آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿أَتَمَا لَهُمُ الْهُكْمُ الْأَكْبَرُ وَكَاجْدٌ فَإِسْتَقِمْ بِمَا أُنزِلَ اللَّهُ بِهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ط﴾ (٤١ / حُمَّ السجدة: ٦)

”تمہارا معبود ایک ہی ہے، سوا کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔“

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھرا دھرنہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلو، ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلو، نہ رہ سے بہکونہ حکم ماننے سے سرکشی کرو:

﴿فَإِسْتَقِمْ كَمَا أُمْرَتْ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغُوا إِنَّهُ يَعْلَمُ لُؤْلُؤَ بَصِيرَةٍ﴾

(١١٢ / هود: ١١)

”تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔“

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا سورہ بن گیا تھا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سر زمین مسلمانوں پر دم بدھنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسول اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ”اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔“

﴿فَلَذِلِكَ فَادْعُهُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمْرَتْ وَلَا تَتَقَبَّلْ أَهْوَاءَهُمْ﴾ (٤٢ / الشوری: ١٥)

”پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔“

ایسے ثابت قدموں کو جھوٹوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ذرہ رہ گا اور نہ کسی پیغمبر کا غم ہو گا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا رَبِّنَا اللَّهَ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

(٤٦/الاحقاف)

”بے شک جنہوں نے کہا، ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ (راہ پر) جمع رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم کھائیں گے۔“

اس دن جس دن بہت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا طمینان یہاں حاصل تھا، وہاں تکیں توسلی کا طمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مددوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا رَبِّنَا اللَّهَ تَعَالَى أَسْتَقَامُوا لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَلِكَةُ أَلَا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (٤١/ ختم السجدة: ٣٠)

”بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جسے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوش سلوچی جس کا تم سے وعدہ ہے۔“

ان ہی آئیوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ اجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چھٹ جاؤں، ارشاد ہوا: ”کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔“ ﴿ صحابہؓ نبی ﷺ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنا میں پیش کیے ساڑھے تیرہ سورس گزر گئے، مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر حسنۃ اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقش کھینچا ہے، فرمایا:

﴿إِذْ جَاءُوكُمْ مِّنْ فَوْقَكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ وَإِذْ رَأَيْتُ الْأَبْصَارَ وَلَعْنَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَلَكَظَفَّوْنَ إِلَيْهِ الظُّنُونَ﴾ هنالک ابتعلی المؤمنوں وَلَنْ يُؤْلِمُ إِلَّا أَشَدَّ يُؤْلِمَ﴾

(٢٣-١١/الاحزان)

”جب کفار کی تحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہاں ایمان والے جانچے گے اور خوب جھیڑ جائے گے۔“

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے:

﴿وَكَتَبَرَ الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ لَقَاتُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادُهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيَةً﴾ (٢٢/الاحزان)

”اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان تحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ

• ترمذی، ابواب الرہد، باب ماجاء فی حفظ اللسان: ۲۴۱۰۔

ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔“

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهُ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَةً وَمِنْهُمْ مَنْ كَيْتَبَ لَهُ أَنْ يَبْدِلُهُ﴾ (الاحزاب: ۲۳)

”ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا، اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔“

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔ حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے، جو یہیش سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:

﴿أَمْ حَسِبُّهُمْ أَنْ تَذَلُّخُوا إِلَيْنَاهُ وَلَمَّا يَأْتُكُمْ مُّثْلُ الذِّيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَرَلَزُلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِيْنَ أَمْنَوْا مَعَهُ مَمْلُتُ نَصْرُ اللَّهُ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ فَرِیْبٌ﴾ (البقرة: ۲۱۴)

”کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو ختنی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جھنڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مد کب آئے گی، سن رکھو اللہ کی مد زد دیک ہے۔“

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

﴿رَبَّنَا أَنْرِغْ عَلَيْنَا صَدِّرًا وَتَبَتْ أَقْدَامَنَا وَاصْرَنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَفِرِينَ ﴾

(البقرة: ۲۵۰)

”اے ہمارے پروردگار! ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کا فر

‘‘قوم کے مقابلہ میں ہماری مددگری،’’

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاعدود کا ہے، احادیث دیر میں ہے کہ بنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکفیفیں دیں اور آخر ان کو گزہا کھود کر آگ میں جو نک دما، مگر وہ دن حق سے برگشته نہ ہوئے:

﴿ قُتِلَ أَصْحَابُ الْأَخْدُودِ ﴾ التَّارِدَاتِ الْوَقُودُ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قَعُودٌ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَعْلَمُونَ

يَا مُؤْمِنِينَ شُهُودٌ وَمَا نَقْمُدُ لِأَنَّ يُؤْمِنُوا بِاَنَّ اللَّهَ اَعْلَمُ بِالْحَمْدِ ۝

(٨٥)/ البروج:

”مارے گئے گڑھ کھونے والے، آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھ کے منہ) پر بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے، مگر اسی کا کہ زبردست خوبیوں والے خدا ایرا ایمان لے آئے تھے۔“

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے حن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری رضی اللہ عنہ نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجئے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: "تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دین حن سے روگ دال نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی نکਕھیوں سے اس کا گوشت بدھی سے نوچ کرتا تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔

رسول اسلام ﷺ کی ان تعلیمات اور تلقینیات کا جواہر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہل تاریخ سے چھپائیں، ان ہی خباب بن ارت شیعۃ کا جواہر روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چٹ لٹادیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں بہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے ۲۱ حضرت خباب شیعۃ نے مذوق کے بعد حضرت عمر شیعۃ کو اپنی پیٹھ کھوں کر دکھائی تو تانے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا سکم ان کی پیٹھ رجھک رباتھا۔

حضرت بلاں رشی[ؑ] گرم جلتی پا لوپر لٹائے جاتے، پھر کی بھاری چٹان ان کے سینے پر رکھی جاتی، گلے میں

^١ صحيح مسلم، كتاب الزهد، باب قصة أصحاب الائتمان: ٧٥١١ وسيرت ابن هشام قصة أصحاب

² صحيح بخاري، كتاب مناقب الانصار ، باب مالقى النبي صلوات الله عليه وسلم واصحابه من المشركين الاخدود.

٣٨٥٢- ابن سعد تذكرة خباب بن ارت، ج ٣، ص: ١١٧-

رسی باندھ کر زمین پر گھستیتے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اس وقت بھی ان کی زبان سے اخذ اخذ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیب (علیہ السلام) رسول پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دو گانے شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت (علیہ السلام) کا وہ فقرہ جس کو آپ (علیہ السلام) نے اپنے بچا اور ابوطالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہو گی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا بچا جان! اگر یہ کافر میرے را بنے ہاتھ میں سورج اور بائیکیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول (علیہ السلام) اس راہ میں مر جائے، یا مارا جائے، تو کیا تم اس راستے جس پر تم چل رہے ہو، اللہ پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت و حیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ۝ قَدْ خَلَقْتَ مِنْ قَبْلِهِ الرُّؤْسُ۝ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ فُتِّلَ أَنْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ۝

﴿أَعْقَابِكُمْ۝ وَمَنْ يَتَّقِلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَكُنْ يَضْرِبَ اللَّهُ شَيْئًا﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

”اور محمد (علیہ السلام) تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم اسے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو اسے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بکاڑے گا۔“ پھر اگلی ایتوں کا حال سن کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:

﴿وَكَانَ إِنْ قُنْ لَّيْتَ قُتْلَ۝ مَعَةَ رَبِيعَنَّ گَثِيرَ۝ فَمَا وَهَنُوا لِيَآ أَصَابَهُمْ فِي سَيِّئِ اللَّهُ وَمَا

ضَعْفُوا وَمَا أُسْتَكَانُوا۝ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ۝ وَمَا كَانَ قُولَهُمُ الْأَكْنُ قَالُوا رَبَّنَا أَغْفِرْنَا۝

﴿ذُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَتَبَتَّ أَقْدَامَنَا وَأَنْعَرَنَا عَنِ الْقَوْمِ الْكُفَّارِينَ۝﴾ (آل عمران: ۱۴۶)

(۳/۱۴۶ آل عمران: ۱۴۶)

”اور کتنے سنبھر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خداوائے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو بہت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہاے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھو اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔“

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہوئی چاہیے، اس ایمانی استقامت یہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو یہیش اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی سمجھے اور کبھی نہ سمجھے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان

کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:

﴿إِلَّا الْمُصْلِيْنَ هُمُ عَلَى صَلَاةِ حَمْدَ آيَهُونَ ﴾ (۷۰ / المعارج: ۲۲-۲۳)

”لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔“

اخلاق کی کیساںی، اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا: ”وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔“ ❶ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔“ ❷

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل: ۶۴۶۵۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل: ۶۴۶۴۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پا سردی کا اظہار کرتی ہیں، یعنیہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جوآواز بلند کی جاتی ہے، اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتوں ہوا اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کی تعلیم دیا ہے:

﴿فَاصْدِعْ بِمَا تُؤْمِنْ وَأَغْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ الَّذِينَ

يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ الَّهَا أَخْرَى﴾ (١٥ / الحجر: ٩٤-٩٦)

”پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کو کھول کر سنادا اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو اللہ کے ساتھ دوسرے مجبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔“

یعنی اب مخفی طور پر دعوت تو حید کازمانہ گزیر گیا اور علامہ اس کی دعوت دینے کا وقت آگیا ہے، اس لیے حکمل کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزا کی مطلق پروانہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے، جس کی مختلف نتیجیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے، جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

﴿وَلَا يَجْنَانُونَ لَوْمَةَ لَا يَبْيَطُونَ﴾ (٥ / المائدۃ: ٥٤)

”یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن و طعن کی پرواہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابلہ میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔“ * ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر کیوں سمجھ سکتا ہے؟

* این ماجہ، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف والنهی عن المنكر: ٤٠٠٧، وابعد میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

فرمایا: "اس طرح کو اللہ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہوا وہ نہ کہے، ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ میت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہو گا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔" ① انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہبیت ناک شخصیت ظلم پیشہ بارشا ہوں کی ہوتی ہے، اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے برا جہاد فرار دیا اور فرمایا:

((افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائز)) ②

"بہترین جہاد ظالم بارشا کے سامنے انصاف کی بات کا ہے۔"

دوسری روایت میں "کلمہ حق" کا الفاظ ہے۔ ③

اسلام میں امر بالمعروف اور نهى عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ہیں، ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مردانے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مردان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنائے کہ "تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" ④

صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا، یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجع میں حرم میں جا کر تو حید کا نعروہ بلند کیا اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے، لیکن اس پر بھی ان کا ناشئ نہیں اتر اور دوسرے دن پھر جا کر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق گوئی نہیں"۔ ⑤ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اس پر انہوں نے بے محابا دار و گیر کی اور اس میں امیر معاویہ کی پروانگوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا: "ہشیار ہنا کہ کسی کی ہبیت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے۔" یہ سن کر حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رونے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہبیت میں آ گئے۔ ⑥

① ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف: ۴۰۰۸۔ ② ایضاً: ۴۰۱۱۔ ③ ایضاً: ۴۰۱۲۔

④ ایضاً: ۴۰۱۳۔ ⑤ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب ابی ذر الغفاری: ۲۸۰۱۔

⑥ ترمذی، ابواب الفتن، باب ما اخبر النبي ﷺ اصحابه: ۲۱۹۱۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:

﴿وَمَنْ لَكَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (آل عمران: ۹۷)

”اور جو (مقدور رکھے پچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور جو کونہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔“

اور اس بے نیازی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے:

﴿وَاللَّهُ الْغَنِيٌّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ۝﴾ (محمد: ۴۷)

”اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔“

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذات بے نیاز کے سوا رسولوں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرا اسماق سے متاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئین اخلاقی میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے با تحفہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دھراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

﴿إِنَّا لَنَعْبُدُ وَإِنَّا لَنَسْتَغْنِيُّنَ ۝﴾ (الفاتحہ: ۴)

”(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔“

اللہ نے جا بجا پیے کو بندہ کا اصلی کار ساز اور کار رہا باتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسلیم دی ہے، فرمایا:

﴿وَيَعْمَلُ الْوَيْلُ ۝﴾ (آل عمران: ۱۷۳)

”اوہ کیسا اچھا کار ساز۔“

﴿وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكَيْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۶۵)

”اوہ تیراب کار ساز بس ہے۔“

﴿أَلَا تَكَفِّنُوا مِنْ دُونِي وَكَيْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۲)

”میرے سوا کسی کو کار ساز نہ بناؤ۔“

﴿وَكَفَى بِاللَّهِ وَكَيْلًا ۝﴾ (النساء: ۸۱)

”اوہ اللہ کار ساز بس ہے۔“

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:

﴿اَلَّىٰسُ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ﴾ (٣٦/ الزمر)

”کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔“

اس لیے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھاکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے، اسی پر طہانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لذت نہ کیا جائے:

﴿وَلَا تَتَمَّتُوا مَا فَصَّلَ اللّٰهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (٤/ النساء)

”اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوں مست کرو۔“

﴿وَلَا تَمُدُّنَّ عَيْنِيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا يٰهٗ أَنْوَاجًا قِنْهُمْ﴾ (٢٠/ طہ)

”اور اپنی آنکھیں نہ پار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔“

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے مقابح ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا، تاہم اللہ نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنى اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس)) *

”دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔“

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ”تونگری بدلت نہ بہ مال“ ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ابوزرا تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟“ میں نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ”تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟“ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ”بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی ہے۔“ اس بنا پر بے نیازی و حقیقت رضاو

* صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس: ٦٤٤٦۔

** صحیح ابن حبان، کتاب الرقاق، باب الفقر والزهد: ٦٨٤۔

تلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی اللہ انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جو ہر شخص میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ ”جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔“ * ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے ان کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ”میرے پاس جو کچھ مال ہو گاتم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، اللہ اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، اللہ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔“ * اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حرام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ ”اے حکیم یا مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے، لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔“ ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطا نہیں قبول کیا۔

فضلہ بن عبد رضی رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قائم بنا دیا ہے۔“ * حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ ”مؤمن کا شرف رات کی نماز اور مؤمن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔“ *

* فتح الباری، ج ۱۱، ص: ۲۳۴۔

* ابو داود، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الاستعفاف: ۱۶۴۴۔

* ترمذی، ابواب صفة القيمة، باب ان هذا المال خضراء: ۲۴۶۳۔

* صحیح ابن حبان، کتاب الرقائق، باب الفقر والزهد: ۷۰۳۔

* مستدرک حاکم، کتاب الرفاقت، ج ۴، ص: ۳۲۵۔

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی برقی خصلتیں) وہ اخلاقی ذمیہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گناہ گار تھرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر قلندر جانتا اور سانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتیں کو روحاں اور مادی نقصانات تکچھے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جسب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بر بادی کا سبب بن جاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً: اکثر ان کو مُنْكَر (بری باشیں اور فحشاء (بے حیائی) اور کھلی فاجحۃ (فحش سیستہ) (برا) سُو (برائی) مُنْكَر وہ (ناپسندیدہ) خطأ (ناصواب یا بھول) ائم (گناہ) عُدُوان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہو گا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنا و نا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں، جو عقل اور شرع دونوں کی نکاحوں میں بدمما ہیں، فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أُولَٰئِكُمْ خَشِيَةً إِمْلَاقٍ طَّعْنٌ تَرْزُقُهُمْ وَإِلَيْكُمْ إِنَّ قَاتِلَهُمْ كَانَ حَاطِطاً
كَبِيرًا وَلَا تَقْرِبُوا إِلَيْهِ كَانَ فَاجِحَةً طَّوَّاعَ سَيِّلًا وَلَا تَمْشِ في
الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَكُنْ تَبَغَّ الْجِبَالَ طُولًا گُلْ ذَلِكَ كَانَ سَيِّلًا
عِنْدَ رَبِّكَ مَنْكُرُهَا﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۳۱-۳۲-۳۷-۳۸)

”اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مارڈا لو، ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہ ان کا مارڈا نا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے..... اور ز میں میں اتر اکرنہ چل کر تو ز میں کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پھاڑ کو پنج جائے گا، ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پر در دگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔“

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنکر ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ مُنکر سے ادا کیا گیا ہے:

﴿كَانُوا لَا يَكْنَا هُوْنَ عَنْ مُنْكِرٍ فَعُلُوٌ طَّلِيسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝﴾ (۵ / المائدۃ: ۷۹)

”وہ ایک دوسرے کو اس مُنکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے، کیا برآ کام ہے جو وہ کرتے تھے۔“

ایک بد کار قوم کی برائیاں گناہی جاری ہیں، اس سلسلہ میں ہے:

(፩፻፲፭/፳፻፲፭/፳፻፲፭)

وَمِنْهُمْ مَنْ يَرْجُو أَنَّ لَهُمْ دِيْنًا مُّؤْمِنُونَ وَمَنْ يَرْجُوا
أَنَّ اللَّهَ يُعَذِّبَهُمْ فَلَا يُعَذِّبَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَصْنَعُونَ

四百九

۱۰۷- میراث اسلامی

“**କାହାରେ ପାଇଲା ତାହାର ମହିଳା**”
“**କାହାରେ ପାଇଲା ତାହାର ମହିଳା**”

《藏文大藏经》(八十一卷) (八一/三三三·三三)

ହେଉଥିବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା

《聖經》卷之三

۱۰- ۱۱- ۱۲- ۱۳- ۱۴- ۱۵- ۱۶- ۱۷- ۱۸- ۱۹- ۲۰- ۲۱- ۲۲- ۲۳- ۲۴- ۲۵- ۲۶- ۲۷- ۲۸- ۲۹- ۳۰-

473

ବିଜ୍ଞାନ ପରିଷଦ

କେବଳ ଏହାରେ ମାତ୍ର ନାହିଁ ଯାହାରେ ପାଇଁ ଆଜିର ଦିନରେ କାହାରେ ନାହିଁ

آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشا اور منکر اور غنی
ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاَءَ ہے، جس کی دوسرا صورت فَاحِشَةٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس
کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اور اس کے دوسرا لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ
جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے
زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الہی سے تعدد اور تجاوز کے الفاظ بھی
استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں بحث کئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تکییں کے لئے کچھ حد میں مقرر فرمایا
دیں، اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدد حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرٹکب ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفَرْدٍ جِهَمَ حَفَظُونَ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكُتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ عَيْرٌ مُّلْوَقِينَ﴾ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَأَءَعَدِ الْذِكَرَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ﴾۲۳﴾ (المؤمنون: ۷-۵)

”اور جو اپنی شرم گاہوں کی تگہ بانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو
انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے
والے ہیں۔“

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ کھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

﴿وَلَا تَقْرِبُوا الِّذِي أَنْهَكَ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَيِّلًا﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۳۲)

”اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ”فاحشہ“ (یعنی قبح بات) اور بری راہ ہے۔“

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ
نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرالفظ منکر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے
پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پچانا کام ہے، اسی لئے اس کو
معروف (نشناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گرجاتا
ہے، وہ منکر (نشناسا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آ جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں:

﴿قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۶۲ و ۵۱ / الذاريات: ۲۵)

ابن حجریر طبری تفسیر آیت مذکور جزء ۱۴، ص: ۱۰۰۔

الصحاح للجوهری لفظ فحش و لسان العرب لفظ فاحش زیر ”فحش“ ج ۲، ص: ۱۰۵۶۔

”لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے:

﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ﴾ (۱۲/ یوسف: ۵۸)

”یوسف نے تو ان کو پہچان لیا، مگر وہ ان کو نہ پہچان سکے۔“

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگو جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بدابہ ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی منکر ہے، فرمایا:

﴿وَإِذَا مُتَّلِّى عَلَيْهِمْ أَيْقَنًا بِئْتَتِي تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنْكَرُ يَكَادُونَ يَسْطُطُونَ

﴿إِلَيَّ الَّذِينَ يَتَّلَوْنَ عَلَيْهِمْ أَيْتَنَا﴾ (۲۲/ الحج: ۷۲)

”اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آئیں سنائی جائیں، تو کافروں کے چہروں میں تو منکر کو (بگزی ہوئی شکل) پہچانے گا، بزرد یک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آئیں سناتے ہیں، جملہ کر بیخیں۔“

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمای پیدا ہوتی ہے، اس کو منکر کہا گیا ہے۔ ان آجتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں، جن کو ہر شخص فطرۃ اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مد ہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔
بغی کے معنی

تیرالظہ بھی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یادست درازی کرنا ہیں:

﴿حَصْمِنَ بَعْثَى بَعْضًا أَعْلَى بَعْضِهِ﴾ (۳۸/ ص: ۲۲)

”ہم دو جھٹکنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔“

الشفر ماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:

﴿وَلَوْبَسَطَ اللَّهُ التِّرْزُقَ لِعِبَادَةِ لَبَغْوَافِ الْأَرْضِ﴾ (۴۲/ الشوری: ۲۷)

”اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔“

ای سورہ میں ہے:

﴿إِنَّمَا السَّيِّلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَسْعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

(۴۲/ الشوری)

”راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔“

ان آئینوں سے معلوم ہوا کہ بھی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تقدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیہ برے کیوں ہیں

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء، منکر اور بغی میں محصر ہیں۔ صفات ذمیہ فحشا یعنی حد درجہ فتح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں، جن کو سارے انسان فطرۃ ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کردنے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورہ اعراف کی ایک آیت ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبُّكَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَالإِثْمُ وَالْبَغْيُ بَغْيُ الرَّحْمَنِ﴾

(الاعراف: ۳۳)

”اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے

ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔“

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں محصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرا ناحق زیادتی، ان اخلاقی ذمیہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تخلیل کی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز تھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے ایمان انھوں جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔

رذائل کی ترتیب

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور عدم رضا سے کس کو کتنا کا وہ ہے۔ اور پر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گواہ تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشا پھر منکر، پھر بھی فحشاء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے، وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگ رہنا، بدکاری میں بنتلا ہونا وغیرہ۔ منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگدی، اولاد کی نالائقی اور بھی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو چھالیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاک وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفات ذمیہ ہیں جن سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں، جو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

• منطقی اصطلاح میں فحشاء، منکر اور بھی میں مانعہ الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاتی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے، مگر کوئی بداخلاتی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاتی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقی ذمیہ میں سب سے زیادہ بری اور نرموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر ہو جائے، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ تھیک اس کی خد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قوی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندر ورنی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑا لایا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَإِذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِذْرِيزْ إِنَّهُ كَانَ صَدِيقًا لَّيْلَةً﴾ (۱۹ / مریم: ۵۶)

”اور اس کتاب میں اور یہی کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔“

اسی لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ بھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدقی نبوت پر ان کی عام جھائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جو نہ اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا:

﴿وَإِنْ يَكُ صَادِقًا لَّيُبْلُغُ بَعْضَ الَّذِي يَعْدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسِرِّفٌ كَذَابٌ﴾ (۵۰)

(۴۰ / المؤمن: ۲۸)

”اگر یہ جھوٹا ہو گا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہو گا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔“

اس میں یہ تائیج بھی چھپی ہے کہ مدی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔ روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا؟ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ قیصر نے کہا، جو

بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا؟ ॥ یہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

﴿تَزَّلَّ عَلٰى مُكْلٰى أَقْلٰى أَقْنٰى مِنْ يُلْفُونَ السَّمَاءَ وَأَكْثَرُهُمْ كُلُّ ذِيْبُونَ ﴾ (۲۶/الشعراء: ۲۲۳)

”شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہ گار پر، لاڈائیتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔“

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیاء کرام علیهم السلام کی سنت اور روشن کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے اللہ کی روشی (ہدایت) بچھ جاتی ہے، ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳)

”بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا۔“

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولنے بولنے آدمی اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔“ ۲ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ علیہ السلام! اجنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ”سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھر پور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھر پور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔“ اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ علیہ السلام! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ”جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔“ ۳

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے، جس سے زیادہ بربی چیز کوئی دوسرا نہیں اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دارہ و سبق ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمٰۃ اللہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادی موم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ”لعنۃ“ کے معنی ”اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی“ کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنۃ سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہواں پر اللہ کی لعنۃ کی جائے مبلہ کے موقع پر

۱ صحیح بخاری، کتاب بندے الوحی: ۷۔ ۲ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله تعالى: (أَوْ كُونوا مع الصادقين)، ۶۰۹۴ و جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الصدق: ۱۹۷۱ و ابو داود، کتاب الادب، باب التشديد فی الكذب: ۴۹۸۹۔ ۳ مسند احمد، ج ۲، ص: ۱۷۶۔

فرمایا گیا کہ دونوں فریق خداۓ تعالیٰ سے گزگرا کر دعا مکنیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہواں پر اللہ کی لعنت ہو:

﴿لَئِنْ تَتَبَيَّنُ فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (آل عمران: ۶۱)

”پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجنیں۔“

میاں یہوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر یہوی پر بد کاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعاً پہی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچ ہزار دفعہ یہ کہنا پڑے گا:

﴿أَنَّ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (النور: ۷)

”اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بڑی چیز ہے کہ جو اس کا مرتكب ہوتا ہے، وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بد دعا کا سخت ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے، حق کا علم رکھ کر اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے:

«إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَهُ اللَّهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ لَا وَلِكَ يَأْعُنُهُمُ اللَّهُ وَيَأْعُنُهُمُ الْعَنْوَنُ» (آل بقرة: ۲)

”بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم

نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔“

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا بھیجیں، اس لیے وہ جھوٹ کے گوؤا نہیں، لیکن عملًا مرتكب ہوتے ہیں اور نفاق کی پروش کرتے ہیں۔ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہوا اور زبان پر کچھ، اس لیے جو منافق ہو گا وہ جھوٹا ہو گا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:

«وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّ الْمُفْقِدِينَ لَكَذِبُونَ» (المنافقون: ۱)

”اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔“

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ ”منافق کی پیچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدے کرے اور جب ایسی بنا جائے تو خیانت کرے۔“ * لغطوں میں تو یہ تین تین ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ با تین کرنا

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله تعالى: ﴿إِنَّمَا الَّذِينَ امْنَوْا أَنْقَرُوا اللَّهَ وَكَرْنَوْا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾۔ ۶۰۹۵۔

تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنا اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملی جھوٹ بولا۔ جھوٹ ایکی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بڑی صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

﴿أَفَكُمْ أَتَيْتُهُمْ﴾ (۲۶ / الشعرا، ۲۲۲)

”جھوٹ بولنے والا گناہ گار“

﴿كَذِيبٌ كُفَّارٌ﴾ (۳۹ / الزمر)

”جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا“

﴿مُسِرِّفٌ كَذَابٌ﴾ (۴۰ / المؤمن)

”بے باک جھوٹا“

ان آیوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لست پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے بچھلنا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہو گا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس بات پر یقین کا ہے کہ کوآنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہرگز نا پر لیا رہا اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا اس کے اندر ورنی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذب قوی یعنی زبان کا جھوٹ ہے۔ کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے:

﴿يٰ أَيُّهَا الَّٰهُمَّ مَا أَوْعَدْتُهُ وَمَا كَانَ أَعْوَدُنَا يَكُذِّبُونَ﴾ (۹ / التوبۃ: ۷۷)

”اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے کہ جھوٹ بولنے تھے۔“

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور وعدہ کر کے کسی کام کو

طااقت رکھ کر بھرنہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے:

﴿وَسَيَحْلُفُونَ بِاللّٰهِ لَوْ أُسْتَطَعْتُ لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَذِيبُونَ﴾ (۹ / التوبۃ: ۴۲)

”اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹی ہیں۔“

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے، جنہوں نے اپنی صحائی کا عملًا ثبوت دیا اور جو عمل جھوٹی تھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا:

﴿لَيَعْزِزُ اللَّهُ الصَّدِيقِينَ بِصَدْقَهُمْ وَيُعَذِّبُ الْمُنْفِقِينَ إِنَّ شَاءَ اللَّهُ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ط﴾

(الاحزان: ۲۴/۲۳)

”ناکر اللہ بھوں کو ان کی صحائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزادے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔“
انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتكب ہو سکتا ہے، فرمایا:
﴿نَأَوْصِيَةٌ كَانَتْ بِكَاهِنَةٍ﴾ (العلق: ۹۶) (۱۶/العلق: ۹۶)
”جبھوٹی خطا کا رپیشانی۔“

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہیے، پھر بھی پیشانی کا جھوٹ لکھ کا لیکا ہے، جو مت نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملًا جھوٹ ہے:

﴿فَإِنَّمَا كُوْنُوكُوْنَ لَآتَتِ الْعِلْمَ هُمُ الْكُفَّارُ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْأَيْمَانِ ۚ يَقُولُونَ إِنَّا فَوَاهِمُ مَا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ ۝﴾ (آل عمران: ۱۶۷) (۱۶۷/آل عمران: ۱۶۷)

”انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہو گی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔“

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ ۝﴾ (النساء: ۶۳) (۶۳/النساء: ۶۳)

”یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔“

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے آپ کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرنا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہرنے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ ہو صرف اس کو جلانا نہ نظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟ فرمایا: ”جو حق تائیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جائے پہنچے والے کی طرح ہے۔“ * حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جائے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے

* ابو داود، کتاب الادب، باب فیمن یتشیع بمالم یعط ۴۹۹۷۔

پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامد ہوا اور جس نے جو نہیں دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھتا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامد ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرنے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی رُوزِ فرمایا ہے۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، ابھی اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برائیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے۔ اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کمن صحابی عبد اللہ بن عاصم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلا یا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلا نے کے لیے کہا کہ یہاں آتھے کچھ دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”تم کہتی ہو مگر تم اس کو پکھو دینا نہیں چاہتی ہو۔“ ماں نے کہا، اس کو بھجو دے دوں گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا۔“

اس تعلیم کا منشاء یہ ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلوہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس موقع پر بچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کی غلط تعلیم و تربیت سے بچے پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا، اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔ بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو لکھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ تصنیع اور بناؤٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں، حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے اور وہ انکار کرتے ہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت زین الدین رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ”ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔“ اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش پیگی کے موقع پر شخص لطف صحبت کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک بیچاری کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”بیٹھوں لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولنا

❶ صحيح بخاري، كتاباللباس، باب الوصل الشعر: ٥٩٣٨۔

❷ أبو داود، كتابالادب، باب الشديد في الكذب: ٤٩٩١۔ ❸ مسنداحمد، ٦/٤٣٨ وطبراني كبير (مجمع الزوائد هيشمي)، كتابالعلم، باب فی ذم الكذب، ج ١، ص: ١٤٠۔

ہے، اس پر افسوس، اس پر افسوس۔“ ۲ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلاکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس شخص کا حق جھوٹ برابر ہے۔ اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی حقیقت خطرناک صورتیں ہیں، ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مارج مقرر کیے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتبار سمجھتا ہے، اس لیے اس کی ہربات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”یا ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو در آنحالیہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔“ ۳ اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے، جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو رُور اور افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی مخرف ہونے اور الٹ پلت دینے کے ہیں۔ جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا تَوْلَى الْرُّؤْرِ﴾ (۲۲ / الحج: ۳۰)

”توں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔“

رُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے، جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ”کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟“ صحابہ شیعۃ القمی نے کہا، ہاں یا رسول اللہ ﷺ افرمایا کہ ”شرک اور باب پاک کی نافرمانی“۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃ الشھب بیٹھے اور کہا کہ ”جھوٹی شہادت“ یا ”جھوٹی بات“ اور برابر سہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ ۴

اس آیت پاک اور اس کی اس تشرییحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہو گا۔ افک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا۔ شرک اللہ پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو بہتان لگایا تھا، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ”افک“ سے

۱ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ۴۹۹۔

۲ ادب المفرد، باب اذا كذبت لرجل هو لوك مصدق: ۳۹۳۔

۳ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة باب ماجاء فی حقوق الوالدين: ۱۹۰۱۔

تعمیر کیا ہے۔ (سورۃ النور) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یا فک بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا:

﴿تَنَزَّلَ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثْيُوْلٌ﴾ (۲۶ / الشّعْر آء: ۲۲۲)

”اور شیطان (تو) اتر اکرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکروار پر۔“

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ نے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سو سائی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿كَفَىٰ بِالْمُرْءِ كَذِبًاٰ أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ﴾

”آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔“

ایسے لوگوں کو جو ہر سی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے:

﴿سَمُّعُونَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵ / المائدۃ: ۴۱)

”جھوٹ کے بڑے سننے والوں۔“

کاظم اخلاق دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

﴿سَمُّعُونَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵ / المائدۃ: ۴۱)

”جھوٹ کے بڑے سننے والے میں۔“

❶ صحیح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع: ۷۔

جوہی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے، وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جوہی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برآ ہے۔ پھر جوہی قسمیں کھانا تو اور بھی برآ ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ اللہ کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی لیے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھانے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورانہ کر سکے تو وہ گناہ ہگار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا اس مسکینوں کو کھانا کھائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی قوم کھانے کے بعد اگر وسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔

﴿لَا يَأْخُذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ إِنَّكُمْ لَكُمْ بِمَا عَصَدُتُمُ الْأَيْمَانَ﴾
 اطْعَامُ عَشَرَةِ مَسْكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيَّتُمْ أَوْ كُسُوهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ
 لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ آيَاتٍ ذَلِكَ كَفَارَةٌ إِنَّكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا إِيمَانَكُمْ﴾

(۵) / المائدۃ: ۸۹

”اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گردہ باندھا، تو اس قسم کے توڑے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا چیز کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ بیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمہاری قسموں کا انتار جب تم قسم کھانی ہو تو اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔“

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انساب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جاسکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے، تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

 ۱ ابو داود، کتاب الایمان والنذور، باب الحث اذا كان خيراً: ۳۲۷۶ تا ۳۲۷۸۔

کسی خلاف شرع بات پر قسم کھائی جاتی ہے یادہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے، بعد کو غیر انصب معلوم ہو، تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿قَذْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحْلِلَةً أَيْمَانَكُمْ﴾ (۲۶/ التحریم)

”اللہ نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا تھا ہر دن یا ہے۔“

اور احادیث میں اس کی جزوی تصریحات مذکور ہیں۔

گزشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا لگنا ہے، اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھا تارہتا ہے، حد رجھے بے اعتبار اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسا شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿وَلَا تُطِعْ مُلْكَ حَلَافِ مَهِينٍ﴾ (۱۰/ القلم)

”اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہانہ مان۔“

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں، لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ مثنا نتخا، ہماری نیت نیک تھی، اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:

﴿فَلَيَكُفَّ إِذَا آأَاصَابَهُمْ مُّؤْصِبَةً بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَخْلُقُونَهُ بِإِلَهٰهِ أُنَّ أَرْدَنَّا إِلَّا إِحْسَانًا وَلَا تَنْفِيَهًا أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (۴/ النساء)

”پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوں سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔“

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر کچھ کو جھوٹ کو کچھ بنایا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں، اللہ فرماتا ہے کہ اگر ان کے پاس ایمان ہو تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے اللہ اور رسول کو خوش کریں:

﴿يَخْلُقُونَهُ بِإِلَهٰهِ لَكُمْ لَيْسُوا كُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾

(۶۲/التوبہ: ۹)

”تمہارے (مسلمانوں کے) آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ وہ تم کو راضی کر لیں اور اللہ اور رسول کو راضی کرنے زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایمان دار ہیں۔“

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گھونے لگتے ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں:

﴿يَجْعَلُونَ إِلَيْهِ مَا قَاتَلُوا وَلَقَدْ قَاتَلُوا كَلِمَةَ الْكُفَّارِ وَلَفَرُوا﴾ (۷۴/التوبہ: ۹)

”اللہ کی (جوہی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا، حالانکہ انہوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔“

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا، اللہ نے فرمایا کہ تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ اللہ کی قسم کھا جائیں گے۔ **﴿سَيَحْلِفُونَ إِلَيْهِ﴾** (۹۵/التوبہ: ۹) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَجْحَلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضِي عَنِ الْقَوْمِ الْفَسِيقِينَ﴾ (۹/التوبہ: ۹)

”تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔“

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں، وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، اللہ نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا:

﴿وَلَيَعْلِمُنَّ إِنْ أَرْدَنَا إِلَّا الْحُسْنَى طَوَّلَ اللَّهُ يَسْهُلُ إِلَيْهِمْ لِكَذِبِهِنَّ﴾ (۱۰۷/التوبہ: ۹)

”اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلانی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔“

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے:

﴿وَيَسْجُلُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (۱۴/المجادلة: ۵۸)

”وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔“

﴿إِنْخَدُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَاحَةَ﴾ (۲/المنافقون: ۶۳ و ۱۶/المجادلة: ۵۸)



”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا�ا ہے۔“

یعنی قسمیں کھا کر بچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو بچ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنا�ا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تائید فرمائی:

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقُدْ جَعَلَتِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾

﴿وَلَا تَكُونُوا مُجَاهِينَ نَقْضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَانَاهَا تَنْجِذُونَ آئِيَاتَهُ دَخْلًا﴾

﴿بَيْنَمَا أُنْتُمْ تَكُونُونَ أُمَّةً هِيَ آرْبَى مِنْ أَمْمَةٍ﴾ (۱۶ / النحل: ۹۲-۹۱)

”اور قسموں کو پکارنے کے بعد تو روزِ مت ڈالا وار تم نے اپنے پراللہ کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ تھاہارے کاموں کو جانتا ہے اور اس عورت کے جیسے نہ بوجو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے پیچھے توڑ کر نکلوے کر دیتی ہے، تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔“

اللہ کا نام لے کر کوئی معابدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا اللہ کے مقدس نام کی تحیر ہے، اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھاتی اس پر اس نے گویا اللہ کو ضامن تھا برا یا، اس لیے قسم کھا کر توڑ ان کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے، جیسا عرب کی ایک بیوی قوف عورت کا تھا، جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا نکلوے نکلوے کر رہی تھی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے اللہ کا نام لے کر معابدہ کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بد عہدی کرتا ہے اور اس فریق سے نوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا اللہ کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کی بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی اللہ کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَنْتَرُونَ يَعْهَدُ اللَّهُ وَآئِيَاهُمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أَوْ لِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكْلِمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَغْنِرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يَرْكَبُهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(آل عمران: ۷۷)

”بے شک جو لوگ اللہ کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سامال خریدتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی تصوری ہے، مگر آیت اپنے حکم

کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن علیؑ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہو گا“۔ اشعث بن قیسؓ صحابی نے کہا، اللہ کی قسم! یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے اس یہودی سے فرمایا کہ ”تم قسم کھاؤ“، تو میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ!

وہ تواب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا، اس وقت یہ آیت اتری۔ ❶

اہن جریکی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی تسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تمیں دفعہ فرمایا: ”تم آدمی ہیں، جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پا کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ وہ لوگ جونا کام ہوئے اور خسارے میں پڑے، وہ کون ہیں؟ یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ”جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لاکاتا ہے، (کیونکہ یہ غور کی علامت ہے) اور جو احسان جاتا ہے اور جو جھوٹی تسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے۔“ ❷ بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شان نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے، اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ کیا اگرچہ کوئی معنوی سی چیز ہو، فرمایا: ”درخت (اراک) کی ذالی ہی کیوں نہ ہو۔“ ❸ حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا۔“ ❹ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹکھکا ناپائے گا۔“ ❻ چہرہ کی

❶ ابو داود، کتاب الایمان والندور، باب فی من حلف لیقطع بہا مالا: ۳۲۴۳؛ ابن جریر، ج ۳، ص: ۲۰۸۔ سورہ آل عمران۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلط تحريم اسبال: ۲۹۳؛ ابو داود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۷؛ ترمذی، کتاب البویع، باب ما جاء فیمن حلف علی سلعة کاذبة: ۱۲۱۱؛ نسائی، کتاب الرینۃ، باب اسبال الازار: ۵۳۲۵؛ ابن ماجہ، ابواب التجارات: ۲۰۰۸۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقطع حق مسلم بیمن: ۳۵۳۔ ❹ سنن نسائی، کتاب المحاربة، باب ذکر الكبار: ۴۰۱۵۔ ❺ سنن ابی داود، کتاب الایمان والندور، باب التغليظ فی یمین الفاجر: ۳۲۴۲۔

خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھنائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتكب ہوتے ہیں اور جھوٹی فتمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے پہنچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا: ”جھوٹی قسم مال بکواریتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹادیتی ہے۔“ ❷ روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جونقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریع ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قادہ رضی اللہ عنہ کے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”تجارت میں بہت فتمیں کھانے سے پر ہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے۔“ کیے بلغ فقرے میں: ((فانہ ینفق ثم یسْمَحُق)) ❸ جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ فتمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی آیت اوپر گزر جویں ہے کہ بے سبب فتمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔

﴿وَلَا تُطْعِمُ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٌ﴾ (٦٨/ السَّلْمٌ) ١٠ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”فتمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے، یا نادامت اور شرمساری کا موجب ہے۔“ ❹

❶ صحيح بخارى، كتاب البيوع، باب بمحقق الله الربا: ٢٠٨٧؛ صحيح مسلم، كتاب المسافة، باب النهى عن الحلف في البيع: ٤١٢٥؛ أبو داود، كتاب البيوع، باب في كراهةية الحلف في البيع: ٣٣٣٥؛ نسائي، كتاب البيوع، باب المتفق سلطنته بالحلف: ٤٤٦.

❷ صحيح مسلم، أيضًا: ٤١٢٦؛ نسائي، أيضًا: ٤٤٦٥؛ ابن ماجه، أبواب التجارات، باب ما جاء في كراهةية اليمان: ٢٢٠٩۔ ❸ ابن ماجه، أبواب الكفارات، باب اليمين حثاً أوندم: ٢١٠٣؛ صحيح ابن حبان، كتاب اليمان: ٤٣٤١۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا، بہت بڑی برائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اور ہدایت ہے، فرمایا: «

﴿إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسُولًا﴾ (١٧/ بنی اسرائیل: ٣٤)

”بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔“

اور جس کی باز پرس اللہ فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بد عمدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا:

﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمٍ يَلْقَوْنَهُ يَوْمًا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَيَوْمًا كَانُوا

يَكْلِذُونَ﴾ (٩/ التوبہ: ٧٧)

”پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے،

اس لیے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔“

صحیحین میں ہے کہ ”منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔“ ❶ (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) ”اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔“ ❷ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پہا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معابدہ کرے خلاف کرے، جب حجکارے گالی کرے۔“ ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو نیچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب امین بن تو خیانت نہ کرو۔“ ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ٢٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ٢١١۔ ❷ صحیح مسلم، ایضاً: ٢١٤، ٢١٣۔ ❸ صحیح بخاری، ایضاً: ٣٤؛ صحیح مسلم، ایضاً: ٢١٠۔ ❹ احمد: ٣٢٣/٥، حاکم: ٤/٣٥٨، ٣٥٩، ابو یعلی: ٤٢٥٧، بیهقی فی الشعب: ٤٣٥٥، منذری باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بد دیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ اجنب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ بر تنا، خیانت اور بد دیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپسی نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چیز ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے پروردہ ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انعام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلاتے گا۔ علی ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بد دیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نہنا ہنا بھی خیانت ہے، یہ یوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں منوع ہیں، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْتُوا لَا تَخْوِنُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخْوِنُوا أَمْتَكُمْ وَأَنَّمُّ تَعْمَلُونَ ۝﴾

(الانفال: ۲۷)

”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بد دیانتی کرو۔“

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورانہ کیا جائے، ایمان داری سے ان کے حکموں کی تعقیل نہ کی جائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ خداری کی جائے اور اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو، اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔ یہ حدیث کی دفعہ اور آپ سے ایک یہ ہے کہ ”منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے پروردہ کی جائے، تو وہ اس میں خیانت کرے۔“ * اہن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفہ روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لا یا جائے گا، اگرچہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاو اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوند! اب کیسے لاوں، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ باویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان جائے گا اور اس کے چیزے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلا چاہے گا تو وہ بوجہ اس کے کندھ سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے چیزے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔ پھر انہوں نے فرمایا: نماز امانت

* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب حصال المنافق: ۲۱۲۔

ہے، وضو امانت ہے، قول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گناہ کفر مایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب رض صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَا مُرْكُمْ أَنْ تَوَدُّوا إِلَّا كُلُّهُمْ إِلَى أَهْلِهَا﴾ (٤٠/النساء: ٥٨)

”بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ما نہیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔“ *

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلاۓ گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے اور نذر رانیں گے تو پوری نہ کریں گے۔“ *

آنحضرت ﷺ جن بربی با توں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ”اللہ! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا، کہ یہ بہت برادر و فی ساختی ہے۔“ * خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی قدر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا:

﴿وَلَا تَرَأَلَ تَطَلُّعًا عَلَىٰ خَآئِنَةٍ فِيهِمُ الْأَقْلَيْلُ لَا يَنْهُمْ﴾ (٥/المائدۃ: ١٣)

”اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔“

یعنی ان کی کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورانہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان میں عزیز سے کرائی، اس کے بعد، وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا:

﴿ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمَآخْنَهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَآئِنِينَ﴾

(١٢/ یوسف: ٥٢)

”تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔“

حضرت نوح اور حضرت اوط علیہما السلام کی بیویوں نے اپنے مقدس شہروں سے بیویوں کی، ان کی بیویوں کی

* مسنڈ احمد، بیہقی فی الشعب: ٥٢٦٦، باب انتزاع، باب انتزاع غیب فی انجرال وعد، ج ٢، ص: ١٢٠۔

** صحيح بخاری، کتاب الشهادات: ٢٦٥١ و صحيح مسلم، کتاب فضائل الصحابة: ٦٤٧٥۔

*** ابو داود، کتاب الورت، باب فی الاستعاظة: ١٥٤٧، نسانی، کتاب الاستعاظة: ٥٤٧١۔

یقینی کردہ موقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لا سکیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، اللہ نے فرمایا:

«صَرَبَ اللَّهُ مَكَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا أُمْرَاتٌ نُوَّجٍ وَأُمْرَاتٌ لُّوَطٍ ۚ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ

عِبَادَنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتْهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا» (٦٦/ التحریم: ١٠)

”اللہ نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوٹ کی بیوی کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں

ہمارے دونیک بندوں کے گھر میں تھیں، تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی، تو یہ

دونوں (پنجیبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو اللہ سے ذرا نہ بچا سکے۔“

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو
کے اشاروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت
باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا
خاتمه کرتا ہے، فرمایا:

«يَعْلَمُ حَالَةُ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ» (٤٠/ المؤمن: ١٩)

”اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔“

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغا بازی

غداری اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدلتے تھے اور بار بار بعدہ دی کرتے تھے، ان کے ذکر میں اللہ فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ عاهَدُتُ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَكْفُونَ۝ فَإِنَّمَا تَنْقُضُهُمْ فِي الْحُرُبِ فَتَيَّدُهُمُ مَنْ خَفَّهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَكَّرُونَ۝ وَإِمَّا تَخَافَنَ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَالْيَدُ
إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَابِيْنَ﴾ (۸/الانفال: ۵۶-۵۸)

”جن سے تو نے معاملہ کیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقوی (اللہ کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پائے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں اور اگر تجوہ کو کسی قوم کی دغا کا ذرہ ہو تو ان کو تو برا بر کا جواب دے، اللہ کو دعا باز خوش نہیں آتے۔“

اس آیت میں گوان کا فروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بد عہدی اور دغا بازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بعد عہدی، سراسر تقوی کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغا بازی اور بعد عہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے، وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا:

﴿وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلٍۚ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ۝ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حِكْمَةٌ۝﴾ (۸/الانفال: ۷۱)

”اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے بھی خیانت (دغا) کرچکے ہیں، تو اللہ نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جانے والا حکمت والا ہے۔“

اللہ سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو اللہ تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے ان کے چھوٹے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”قيامت کے دن ہر غدار کا ایک جنڈا ہو گا۔“ * * * یعنی اس

* صحيح مسلم، کتاب الجهاد والسبير، باب تحرير الغدر: ۴۵۲۹۔

سے اس کی بد عہدی اور غداری کی تشبیہ ہوگی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو صحیحیں فرماتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ ”بد عہدی نہ کرنا۔“ ۲ یعنی دشمنوں سے معابدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مردا دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے کسی کو جان کا امن دیا پھر مرواذاً الاتو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔“ ۳ اللہ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا أَوْفُوا بِالْعُهُودَ﴾ (٥ / المائدۃ: ١٠)

”اے ایمان والو! اپنی گروں (قول وقرار) کو پورا کرو۔“

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معابدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معابدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے مدت معینہ کے لیے کوئی معابدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہوا اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمر بن عبد اللہ نے ایک صحابی سوراہ کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بد عہدی نہیں۔ امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنائے کہ ”جب کسی قوم سے معابدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گردہ نہ باندھی جائے نہ کھوئی جائے۔“ ۴ یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معابدہ کو یک قلم روک دیا جائے۔ یہ کن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے۔ ۵ غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ معابدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی۔ لیکن ان کا یہ فعل معابدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتہوں نے اس کو بھی بد عہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

۱ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب تأمیر الاماء.....: ۴۵۲۲۔ ۲ سنن ابن ماجہ،

ابواب الديات: ۲۶۲۸ وصحیح ابن حبان؛ منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد، ص: ۲۰۳، ۲۰۲۔

۳ سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یکون بینہ و بین العدو عهد فی سیر نحوہ: ۲۷۵۹۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے، یا اس کی طرف کوئی ناکرde گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجوہی نہیں ہوتا۔ لیکن شرافت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سراس لیتے چھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حدود جن شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کریا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گناہ گار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمان میں طمع نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے گھر میں چوری کی مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بربی ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وہ الٰہی نے دفعۃ حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ ❷ دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طمع کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امامت رکھنے کو دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ آپ ﷺ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا۔ اس وقت یہ وحی آئی۔ ❷ بہر حال واقعہ جو پکھو ہوا۔ امر مشترک یہ ہے کہ گناہ گار کو بے گناہ کو گناہ گار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ يَالْحَقِّ لِتَعْلَمَ بَيْنَ النَّاسِ بِهَا إِذْنَ اللَّهِ وَلَا تَكُونَ لِلْخَالِقِينَ حَصِيبًا ۚ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۖ وَلَا تُجَاهِلْنَ عَنِ الَّذِينَ يَعْتَدُونَ أَنْفُسَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ حَوَّاً إِيمَانًا ۗ يَسْتَغْفِرُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَغْفِرُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعْهُمْ إِذْ يُسْتَغْفِرُونَ مَا لَا يُرِضِي مِنَ الْقُوَّلِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ يَعْلَمُ مَنْ يُفْسِدُ﴾

(النساء: ١٠٥ - ١٠٨)

”ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر) ایسی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو اللہ نے تھوڑے سو جھلایا انصاف کرا اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ چھڑا اور اللہ سے قصور مغاف کر، بے شک اللہ بخشش والارحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ چھڑ جوابنے جی میں دغدار کھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گناہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا

● جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن من سورۃ النساء: ٣٠٣٦۔

● تفسیر طبری، سورۃ نساء آیت (إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ) ج ۵، ص: ۱۵۹۔

چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں، جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔“

آگے چل کر ہے:

﴿وَمَنْ يَكُلِّسْ خَطَايَةً أَوْ إِثْمًا لَمْ يُرْفِه بِرَبِّئَ فَقَدِ احْتَمَلْ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّمِينًا﴾

(٤/ النساء: ١١٢)

”اور جو کوئی خطایا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے۔ اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لا دا۔“

ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو رسول ﷺ کو انصاف کی تاکید ہے۔ پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے۔ پھر فرمایا: جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہ گار ہیں اور اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ذاتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے۔ جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔ اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا، اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھا پہنچنے سر پر لا دا۔ پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی، یا مجبول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔ اللہ نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے۔ اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی:

﴿وَلَا يَأْتِنَ يُبْهَتَانٌ يَقْتَرِبُنَّ كَمَّ يَبْيَنُ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلَهُنَّ﴾ (٦٠/ الممتحنة)

”او ریکہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے پیچ میں۔“

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَغْدُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا أَنْتَ سُبُوا فَقَدِ احْتَمَلُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّمِينًا﴾

(٥٨/ الحزاب)

”اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لا دا۔“

شریف یوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھتا ہے۔ اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرٹکب ہوا اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے۔ اس کو کوڑے مارے جائیں:

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةٍ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ تَمِينًا جَلْدًا وَلَا تَقْبِلُوا إِلَيْهِمْ شَهَادَةً أَبْدَاهُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ ۝ إِلَآ الَّذِينَ تَأْتُوا﴾

(النور: ۴-۵)

”اور جو لوگ شریف یوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ، تو ان کو اسی کوڑے مارا اور ان کی گواہی کبھی نہ مانا اور وہ فاسق ہیں، مگر جنہوں نے توبہ کی۔“
اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بے گناہ ہو۔ یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیشہ پر کوڑے مارے گا۔“ یہ گویا قذف یعنی تہمت بے جا کی مثالی سزا ہو گی۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے۔“ یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

سنن ابو داود، کتاب الادب، باب فی حق المظلوم: ۵۱۶۵۔

سنن ابو داود، کتاب الادب، باب فی الغيبة: ۴۸۷۴۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دوآ دمیوں کے درمیان جھوٹی پچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرا کے خلاف بھئڑ کائے اور اپنارسوخ جتا ہے اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرا کو پہنچاتے ہیں، جس سے دوسرا کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی جائی ہے یہ لفظ کہے ہیں: ﴿مَشَّاءٌ بِكَبْيُوْدٍ﴾ (القلم: ۱۱) ”جو چلی کھاتا پھرتا ہے۔“ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومکن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر لی جائے جس پر پچھے افسوس ہو۔ فرمایا:

(١٠) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَرَاسِقٌ مِّنْ بَيْنِ أَنفُسِهِمْ فَلَا يُنَبِّئُونَ أَنْ تُصْبِيَوْا قَوْمًا مَّا يَعْلَمُونَ

مَا فَعَلْتُمْ نَدِيْمِيْنَ (٦)) ٤٩/الحجـ ات:

”اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تھا رے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرو۔ کہیں کسی قوم پر نادانی سے جانہ چڑو۔ پھر اینی کے پر پچھتائے گلو،“

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو اللہ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بداعلائی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں، بالخصوص، عزیزیرواقارب اور دوست و احباب میں تاتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں؟ پھر خود وہی فرمایا:

((المشاون بالنميمة المفسدون بين الاحبة))

”جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔“

صیحیں میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت علیہ السلام ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا: "ان میں

سے ایک پاس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔*

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الابشكم ما العضة هي النمية القالة بين الناس)) *

”کہا میں تم کو بتاؤں کے غصہ کہاے؟ وہ چغل خوری سے جلوگوں کے درمیان بیان کی حاجتی ہے۔“

لغت میں غصہ کے معنی تفریق اور حرکے ہیں۔ اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں

١ مسند احمد، ج ٦، ص: ٤٥٩ عن اسماء بنت يزيد. **٢** صحيح بخاري، كتاب الوضوء، باب من الكبار ان لا يستر من بوله: ٢١٦ وصحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول: ٦٧٧.

٣ مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحرير النمية: ٦٦٣٦.

تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے۔ لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں یہوی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يَفْتَحُونَ إِذْ بَيْنَ الْمُرْءَ وَزَوْجِهِ طَ﴾ (۱۰۲/ البقرة)

”اس پر بھی ان (ہاروت و ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں، جن کی وجہ سے میاں یہوی میں جداً ڈال دیں۔“

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں، جو لوگ ہاروت و ماروت سے سیکھتے تھے۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔ *

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کفاران شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ہدایت کی تھی:

((لَا يَبْلُغُنِي أَحَدٌ مِّنْ أَصْحَابِي عَنْ أَحَدِ شَيْئِنَا فَإِنِّي أَحُبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وَإِنَّ

سلیم الصدر)) *

”میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے۔ کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔“

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں، جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود دو شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے۔ بعض حالتوں میں جس شخص تک دو بات پہنچائی گئی ہے، اس کو ناگوارگزرتی ہے۔ بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بد اخلاقی میں بتلا ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگتے رہتے ہیں، تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اسی بنابر اہل عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کرلاتے ہیں اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آٹسِ فتنہ و فساد کے لیے ایندھن بھم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابوالہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ”حَمَّالَةُ الْحَطَبِ“ یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔ *

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں۔ یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو

* تفسیر کبیر، ج ۱، ص: ۴۴۳ و مابعد۔ ** ابو داود، کتاب الادب، باب فی رفع الحدیث: ۴۸۶۰۔

*** تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۷۷۱۔

دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قیامت کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَنَاتٌ))

"جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔"

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے، اسی لیے عربی زبان میں چغل خوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و لگار کے ہیں اور ادھر کی ادھر لگانے کے لیے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی مناسبت سے چغل خوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگر چہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تحریر و سلتابت اور مزوا شرات سے چغل خوری کی جا سکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں۔ یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جا سکتا کہ "فلاں شخص یہ کہتا تھا" بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "فلاں شخص یہ کام کرتا تھا"۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "غض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا" چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے "ترک ملا یعنی" کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے، جس کے نتائج بعض الحالوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل و خوزریزی تک کی نوبت پہنچتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تحسس، کذب و فریب، نفاق، غرض مختلف بدآخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ان ستائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے۔ اگر امراء کے درباروں میں تعلق و خوشنامہ کے لیے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبوتوں میں اس سے تفریط ہے۔ خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم میں اسے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو

مردوں کی آوازیں جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ فرمایا: ”ان پر عذاب ہو رہا ہے۔ لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشab آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔“ *

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی مشکال فیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں۔ پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بد اخلاقیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کہاڑ و موبقات میں داخل ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ افک عائشہ زین العابدین کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

﴿إِذْ تَلْقَوْنَهُ بِالسِّنَّتِكُمْ وَتَقُولُونَ يَا أَفْوَاهُكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَّ حَسْبُنَهُ هُنَّا هُنَّا وَهُوَ عَلَيْهِمْ بَشِّيرٌ﴾

عِنْدَ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿٢٤﴾ (النور: ١٥)

”جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقش درقل کرنے اور اپنے منہ سے اسی باشیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی بھلی (سی) بات سمجھا، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشبیہ و تفسیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام روچپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔ کشف عورت اور کشف عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بد اخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے شروع فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابل اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اس طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّقِيمٍ لَّهُمَّ إِنَّمَا يُمَسِّكُ بِعِصْمٍ مُّتَّكِدٍ أَنْ يُمُوْمَهُ﴾

(القلم: ٦٨-١٢)

”اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آپ رو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ بد کار ہے۔“ *

* بخاری، کتاب الادب، باب التنبیہة من الكتاب: ٦٠٥٥

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرد محفوظ رہے۔ اور ان کے باہمی تعلقات خوبصورت ہیں۔ اس بنابر جن بداغلائقوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرد کو صمدہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخُرُ كُوْمَرٌ مِّنْ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ يَسْأَءُ عَسَىٰ أَنْ يَكُنْ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا تَلْمِذُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابِزُوا بِالْأَلْقَابِ طَيْسُ الْإِنْسُرُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتَبَتَّ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كُثُرًا فِي النَّقْنَ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِنَّمَا وَلَا تَحْسِسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا إِيَّاهُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلْ حُمَّاً خَيْرٌ مَّيْتًا فَلَمْ يَهْمُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَكِّلْ رَحِيمٌ﴾**

(الحجرات: ۱۱-۱۲ / ۴۹)

”مسلمانو! مرد مردوں پر نہ پہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر بہتے ہیں) وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں پر پہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر بہتی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طمعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) بازنہ آئیں تو وہی (اللہ کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ثنوں میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیچھے پیچھے برانہ کہے۔ بھلام میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقوی کرو۔ بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور حرم کرنے والا ہے۔“

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پرده دری نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پرده دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور حمایات و نقایل، ہر طریقے سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جاسکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لئے، غرض ہر چیز میں عیوب نکالا جاسکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پر زور طریقے سے اس کی ممانعت کی ہے **﴿أَوْ رَأَسْ كُوْنُوْدَانِ بَهَائِيَ كَمَرَادَ گُوشَتَ سَتَّ تَشَبِّهَ دِيَ ہے جس میں بلا غلت کے بہت سے ملتے ہیں۔﴾**

* احیاء علوم الدین، ج ۳، ص: ۱۰۱۔

① انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے۔ اس لیے جو چیز اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

② لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غصب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لینے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک برافعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رو در رو کسی کو برائے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ایک شخص کی پیشہ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

③ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارنیٹیں کرتے۔ اس لیے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت و منگدی اور بغرض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطفِ محبت کے منافی ہے، جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

④ مردار گوشت کا کھانا سخت اخطر ارکی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کی بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لیے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی، جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور رہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو، علانيةً غیبت سے احتراز کرنا چاہیے اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہیے۔ اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”شہر مراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبراہیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟“ بولے، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت و آبرو لوٹ لیتے تھے۔“ * اعمال اور اعمال کی جزا اوسرا میں مناسب ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے۔ یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لیے عالم برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود انہا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار ختح بد پیچلی تور رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ ”جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔“ * اس حدیث میں بھی اعمال اور جزا اس کی مناسبت ظاہر ہے۔ مردار گوشت اکثر بد پورا ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے۔ اس لیے یہ بدبو اسی مردار خوری کا بتیجہ ہے۔ اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب

* ابو داود، کتاب الادب، باب فی الغیة: ۴۸۷۸۔ * ادب المفرد، باب اخطر الغيبة: ۷۳۲، ۷۳۳۔

کی تشویہ و تفہیح کی جائے۔ اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بوجھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے تنفس کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تفہیح کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا: ”اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جا گزیں نہیں ہوا ہے۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کی تلاش کرے گا اور اللہ جس کے عیوب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا۔“ * ۱

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی ضروری قید نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائی ان ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے۔“ کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیوب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں؟ تو فرمایا: ”اگر وہ عیوب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔“ *

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جزو نہیں۔ بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہو گی۔ لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے زدیک غیبت صرف اس بدگولی کا نام ہے، جو کسی کے پیچھے پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے۔ بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔ اس طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعے بھی غیبت کی جاسکتی ہے۔ کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً: ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیوب کے نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا کر چنان بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ * ۲ اس طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیوب کی پرده دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آنکھوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿هَكَذَا مَقْتَأَبُ بَيْمَوْ﴾ (القلم: ۶۸)

۱ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الغيبة: ۴۸۸۰۔

۲ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الغيبة: ۴۸۷۴۔

۳ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الغيبة: ۴۸۷۵۔

”(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (ادھر کی ادھر ادھر کی ادھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔“

﴿وَيُنْلِلُكُلُّ هُمَزَةٌ لَمَزَةٌ﴾ (۴ / الهمزة ۱۱)

”ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کرتا ہے، اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔“

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور لغاش طریقوں کی نہ مت کی گئی ہے، ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر کھنچ چاہئیں جو حسب ذیل ہیں:

① **ہُمْزٌ**، سامنے اور لُمْزٌ، پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

② **ہُمْزٌ**، خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

③ **ہُمْزٌ**، ہاتھ کے اشارے سے اور لُمْزٌ، زبان سے غیبت کرنا۔

④ **ہُمْزٌ**، زبان سے اور لُمْزٌ، آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

⑤ **ہُمْزٌ**، برے الفاظ سے ہم نہیں کی دل آزاری کرنا۔

⑥ **لُمْزٌ**، آنکھ۔ ہاتھ۔ سرا اور ابرو کے اشارے سے ہم نہیں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہو گا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاق بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے، تاکہ ان کو تنبیہ اور نہامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ کہتے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانية برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ، بیشہ عموم کے ساتھ پرده میں یا صیغہ مجھول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے۔ اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں، وہ اس لیے کہ ان کی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے موقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعریف بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پار اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهَرُ بِالشُّوَوْعِ مِنَ الْقُولِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللَّهُ بَيْعًا عَلَيْهِ﴾

(۱۴۸ / النساء)

”اللہ کو بدگولی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔“

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کر کوئی کسی کی برائی کو پاک رکھتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بازیابی کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ”یا پے خاندان میں کس قدر برائی شخص ہے؟“ لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی، * اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوال واقعی کا اطمینان جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو، یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز کرتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

① حاکم کے مظالم کی بارگاہ مسلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ((الصاحب الحق مقلا)) *

② مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی براکیان قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

③ فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا) *

④ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو ((بس ابن العشیرہ)) (قبیلہ کا برآ آدمی) کہا تھا۔ *

⑤ ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گواں کا عیب ظاہر ہو، مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھنے ہو، مثلاً: امغش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو ذوالیدین (دوہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔ *

⑥ علایمیق و فجر کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تا کہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً: محنث کو محنث کہنا۔ *

* بخاری، کتاب الادب، باب ما یجوز من اغیاب اهل الفساد والریب: ۶۰۵۴۔ * بخاری، کتاب الاستقراض، استقراض الابل: ۲۳۹۰۔ * بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر هند بنت عتبہ: ۳۸۲۵۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن العشرة: ۴۷۹۱۔ * بخاری، کتاب الصلاة، باب تشییک الاصابع فی: ۴۸۲۔ * احیاء العلوم الدین، ج ۳، ص: ۱۰۶۔

دور خاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دور خاپن نہیں پایا جانا چاہیے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ بداخلاتی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دور خاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پر کے لیے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی بھجو کرنے لگے تو بھی وہ دور خاکہ لائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام ﷺ اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ ”ہم لوگ امراء و حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں“۔ یوں ”ہم لوگ عبد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔“^۱ اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

﴿وَإِذَا الْقَوَافِلُ الَّذِينَ أَمْتَنَّا قَالُوا أَمْتَنَاٰهُ وَإِذَا خَلُوْلًا إِلَى شَيْطَانِهِمْ لَا قَالُوا إِنَّا مَعَهُمْ لَا إِنَّا مَعَنْهُ مُسْكِنْهُمْ وَعُونَ﴾ (۲/۱۴ البقرة)

”اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔“

معاشرتی اور دینیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو ارادو میں دور خا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعید شدید آئی ہے، مثلاً: فرمایا: ”قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور“^۲۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: ”دنیا میں جس کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔“^۳ یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تقلیل ہو گی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

¹ صحيح بخاری، کتاب الاحکام، باب ما يكره من ثناه السلطان: ۷۱۷۸۔

² بخاری، کتاب الادب، باب ما قيل في ذي الوجهين ۶۰۵۸ و صحيح مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۶۳۰ تا ۶۶۳۲ و مالک کتاب الكلام: ۱۸۶۴۔^۴ ابو داود، کتاب الادب، باب في ذي الوجهين: ۴۸۷۳۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کام میں بد نتیٰ ہی بد نتیٰ معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو صحن بنت نظر نہیں آتا۔ دوسرے کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کوئی بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے۔ اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رینے کی تاکید فرمائی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْنَبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظُّنُونِ﴾

(الحجرات: ۱۲)

”اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔“

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض وحد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا: ”تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے نوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوں کرو اور نہ آپس میں حسد اور نہ بغرض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیر و اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔“ ॥ یہی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی الیٰ حالت میں ہو، جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرے افتن میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کواز و ایج مطہرات ﷺ میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو اپس پہنچانے چلے کہ اتنا قاراستہ میں دو انصاری آپ ہے، وہ آپ کوئی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور اپس پھر نے لگے، آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا: ”یہ میری بیوی فلاں ہیں۔“ انہوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ ﷺ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا: ”شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔“ ॥

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْنَبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظُّنُونِ﴾، ۶۰۶۶ و مسلم: ۶۵۳۶ و ابو داود: ۴۹۱۷ و ترمذی: ۱۹۸۸ و مالک، کتاب حسن الخلق، باب ما جاءَ فِي الْمَهَاجرَةِ: ۱۶۸۳۔

صحیح مسلم، کتاب السلام، باب انه يستحب لمن رؤى خاليا بامرأة: ۵۶۷۸۔

مدّ احیٰ اور خوشامد

مداد احیٰ اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لیے بھی بتاہی کا سامان ہے جس کی مداد احیٰ اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداد احیٰ کرنے والا تین گناہوں کا مرتبہ ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے اربابِ قدر و جاہ کی خوشامد ان تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظر و میں اپنے کو ذیل و رسوایت کرتا ہے، جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔ بے جا تعریفوں سے مدد و حج میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دسری اپنی نسبت غلط ہمی تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفرد و ضم کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرب ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پہ در پ تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور موقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مصکحہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ بروخ غلط ہو جاتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہود یوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔ اور ان کے انجام کی یہ خبران کو دی ہے:

﴿لَا يَحْسِنُونَ يَكْفُرُونَ يَأْتُونَ كَيْفُرُونَ أَنْ يَعْمَلُوا إِيمَانَ لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا يُحْسِنُونَ﴾

﴿بِمَا زَانَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ وَلَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (آل عمران: ۱۸۸)

”اور جو اپنے کارناموں پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں، تو ان کو نہ سمجھنا، پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے نج جائیں گے اور ان کے لیے درد ناک سزا ہے۔“

ان آئیوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے۔ * اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیسے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بڑی بات ہے کہ بن تو بہ کے اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الہی دشگیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گناہگار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ایسی مداد اور خوشامد کا نگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں۔ جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف

* فتح القدير شوکانی، ج ۱، ص: ۳۷۴۔

کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: ”تم نے اس کو برباد کر دیا۔“ * ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا: ”تم نے اپنے ساتھی کی گرون مار دی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہوا در قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے۔“ * مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغزور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندر وہی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں، ان کوں کران کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمان بن عفی کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں، تو حضرت مقداد بن عقبہ صاحبی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”مذاہی کرنے والوں سے ملوتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔“ * ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ ”یہ کون ہے؟“ تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو سن اک مرتبہ کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔“ *

١ صحيح بخاري، كتاب الادب ، باب ما يكره من التمادح: ٦٠٦٠ -

٢ صحيح بخاري، أيضًا: ٦٠٦١ و مسلم: ٧٥٠١ و أبو داود: ٤٨٠٥ -

٣ صحيح مسلم، كتاب الزهد، باب النهى عن المدح: ٧٥٠٥ و أبو داود، باب فى كراهة التمادح: ٤٨٠٤ -

٤ باب يحيى في وجوه المداحين: ٣٤١؛ مستند أحمد، ج ٤، ص: ٣٣٨ -

بخل

بخل بھی اساسی بد اخلاقیوں میں سے ہے، یعنی ایسی بد اخلاقی جو بہت سی بد اخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت، بد دیانتی، بے مردی، بعض دفعہ بے رحمی، بد سلوکی اور دنایت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لائچ، نگ، نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلمہ اڑی باری اور بھوکوں کو کھلانا، نگوں کو پہننا محتاجوں کو دینا، تیبیوں کی خبر گیری اور مقرضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرانض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓؑ کے سامنے جریل علیہ السلام کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓؑ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین، جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں:

”یا رسول اللہ ﷺ اے آپ قرابت والوں کا حق اور مقرضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے صیبیت زدوں کی مدآ کرتے ہیں۔“

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ نبی ”بخل“ نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔ بحال ان یہاں یوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا اوسرا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا۔ سورہ مدثرہ آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گے ہو؟ تو کہیں گے ہم نمازوں میں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، بخاریوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و مزار کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے:

﴿مَا سَلَكْنَا فِي سَقَرَهُ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ لَا وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْيُسْكِينَ وَلَكُنَا

نَخُوضُ مَعَ الْغَايِضِينَ وَلَكُنَا لَكَذِبُ يَقُولُ الدُّنْيَا﴾ (٧٤/المدثر: ٤٦-٤٧)

”تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روزِ جزا کو جھلاتے تھے۔“

اس سے ظاہر ہو گا کہ بخل کی برائی دوزخ پہنچا کر رکھتی ہے اور وہ عمل کی جزا اوسرا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزا اوسرا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں

● صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف بدء الوحی: ۳۔

کر سکتا، یہی نکتہ سورہ ماعون میں جو مکہ کی پرانی صورتوں میں سے ہے وہ ہر ایسا گیا ہے، فرمایا:
**﴿أَرَعِيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِاللَّدِيْنِ ۝ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ عَلَيْتَمْ ۝ وَلَا يَحْضُّ عَلَى طَعَامٍ
الْيَسْكِيْنِ ۝﴾** (۱۰۷ / الماعون: ۲-۱)

”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے پچ کو
دمکاد دیتا ہے اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔“

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی
اس اخلاص اور نیک نیتی کی بناء نہیں ہو سکتی، جو قویلیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا
بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اس دنیا میں پانے کا موقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی
معلوم نہیں ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں
یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا اللہ کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔

اور ایک کمی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کا تذکرہ کیا جس کی روزی زیادہ نہیں ہے، اس لیے اس کو
اپنے اللہ سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، اللہ فرماتا ہے:

**﴿كَلَّا لَيْلَ لَا تَكُونُوا مُؤْمِنُوْنَ الْبَيْتَمْ ۝ وَلَا تَحْصُّوْنَ عَلَى طَعَامِ الْيَسْكِيْنِ ۝ وَكَلَّا كُونَ الْعَرَاثَ أَكْلًا
لَهَا ۝ وَكَلَّا كُونَ الْمَالَ حُبَّا جَمَّا ۝﴾** (۸۹ / الفجر: ۲۰-۱۷)

”یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے پچ کی تقریب نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے
پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھاجاتے ہو اور مال و دولت سے
بڑی محبت رکھتے ہو۔“

ان آئیوں میں با تیں کمی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی صحبت بخیل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورہ
ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلوں کو اپنی حیات جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ
ان کی بدولت وہ بیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی عیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیال خام ہے فرمایا:
﴿إِلَيْنِي جَهَّمَ مَالًا وَعَدَدَةٌ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيَبْذَلَنَّ فِي الْحُطَبَةِ ۝﴾

(۴ / الہمزہ: ۲-۴)

”جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن کر رکھا اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو بھی نہ زندہ رکھے گا،
ہرگز یوں نہیں، وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔“

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر کھنے اور کارخیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی
دی گئی ہے، جو کھال تک کھینچ لے:

﴿كَلَّا إِنَّهَا لَطِيْهُ نَزَّاعَهُ لِلشَّوَّى تَذَعُّ عَوَامَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلِّيْ وَجَمَعَ فَأَغْلِيْ ﴾

(٧٠ / المعراج: ١٨)

”ہر گز نہیں وہ تپتی آگ ہے، کھال کھینچ لینے والی، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھے دی اور پھر گئی اور اکٹھا کیا اور سینتا۔“

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی ایشیں خود بخود رہی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو اللہ نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لیے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کاسامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَلْتَذُونَ الدَّلَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْقُوفُونَهَا فِي سَيْلِ اللَّهِ فَبِقَدْرِ هُمْ يَعْدَّ أَلَيْمُهُمْ يَوْمَ يُحْسَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتَلَوُّ يَهَا جِبَاهُهُمْ وَجَنُوْهُمْ وَظَهُورُهُمْ هَذَا مَا كَذَّبُوا لِأَنَفْسِكُمْ فَلَوْ قَوَّا مَا لَنْتُمْ تَلَذُّزُونَ ﴾

(٩ / التوبۃ: ٣٥-٣٤)

”اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو درد ناک سزا کی خوش خبری سنادے، جس دن اس کو وزن کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں، کروٹیں اور پتھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا، تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے، اس کا مزہ چکھو۔“

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھر تارہ نہیں چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے، جس کے رکن وہ خود ہیں:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَ الَّذِينَ يَكْحُلُونَ يَهَا أَنَّهُمْ أَلَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرُ الْهُمَّ بَلْ هُوَ شَرْكَهُمْ سَيْطَوْنَ مَا تَخَلُّوا إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيْمَةِ ﴾

(٢/آل عمران: ١٨٠)

”اور جو لوگ اس مال کو جو اللہ نے اپنے مہربانی سے ان کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔“

یعنی جس دولت کو انہوں نے بحالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے، وہ قیامت کے عالم مثال واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ ”یہ مال زہر یہ سانپ کی صورت میں

گلے میں پر اہوا نظر آئے گا۔”*

جو بخیل ہوتا ہے، اس کو خلق اللہ اور اللہ کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ فُخْتَالٍ فَعُوْرٌ إِلَّذِينَ يَخْكُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۚ﴾

(٥٧) / الحدید: ٢٣-٢٤

”اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا، جو آپ بخیل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخیل کی ترغیب دیتے ہیں۔“

اور جس سے اللہ محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال پچھے اور عزیز و اقرباً بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سواد و سروں کو ذلیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخیل کی ب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا ذکر سورہقصص میں ہے، یہ حضرت موسی عليه السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی نہیں تھی اور وہ بھی اللہ جانے کتنی بھاری اور بھروسی ہوتی ہو گی) خزانے تو الگ رہے خراؤں کی کنجیوں کے گھپلوں کوئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کوہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا، کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزر چکے ہیں، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی یہ انجام ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہا گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿أَوَ أَنْ يَعْلَمُ مَنَّ اللَّهُ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ فُقَدَّةً وَالثُّرُوجُمَعَةُ ۚ﴾

(٢٨) / القصص

”کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقت اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔“

زمانہ محمدی مئہ تیسراں کے قارون ابوالہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

* صحیح بخاری، کتاب الزکرة، باب ائم مانع الزکرة: ١٤٠٣۔

﴿مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾ (۱۱۱ / اللمب: ۲)

”ابوہب کو اس کامال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔“

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿هَلَّمَ هُوَ لَا عِنْدَ عَوْنَ لِتُقْفِقُوا فِي سَيِّلِ اللَّهِ فِيمَمُ مَنْ يَنْجُلُ وَمَنْ يَنْجُلُ فَإِنَّمَا يَنْجُلُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّمَا الْعَفْيُ وَإِنَّمَا الْفَقْرَاءُ﴾ (۴۷ / محمد: ۳۸)

”ہاں تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلا یا جا رہا ہے، تو تم میں کوئی بخیل کرتا ہے اور جو کوئی بخیل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخیل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی نیاز ہو۔“

یعنی اس کے بخیل کے برے نتیجے اسی کو بھگتے پڑیں گے۔ بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہنچنا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت، نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقر اس کے لیے بدعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ یہوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے، وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستے سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے چور اس کے درپی، ڈاکو اس کے لاگو، زہروہ پاتا ہے، جملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھراں میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھراں کی آنکھ بند ہوئی اور ادھراں کے وارثوں نے الکے تملے سے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالی مفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بڑی عادتوں میں بیٹلا اور آخر میں مغلس و فلاش ہو جاتی ہے۔ اللہ اپنے رسول ﷺ کی زبانی فرماتا ہے:

﴿وَآمَّا مَنْ يَنْجُلَ وَاسْتَغْنَى وَكَذَبَ بِالْحُسْنَى فَسَيِّرْتُهُ لِلْعُسْرَى وَمَا يَعْنَى عَنْهُ مَالُهُ إِذَا أَرَدَهُ﴾ (۹۲ / الیل: ۸-۱۱)

”اور لیکن جس نے دینے سے بخیل کیا اور (اللہ کی یا نیکی کی باتوں کی) پرواہ کی اور اچھی بات کو جھٹکایا، تو ہم اس کو سخت کام کے لیے آسان بنا کیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کامال اس کے کام نہ آئے گا۔“

وہ سخت کام جس کو اللہ اس کے لیے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بڑی عادت و خصلت اور برے

کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ بیتلار ہوتا ہے اور ان کو صرف اس لیے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے، تنگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سوئیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز واقارب دوست و احباب سے اس کی صرفت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افقار یا مصیبت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محجوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے:

﴿وَأَنْقُفُوا مِثَارَ رَزْقِنَّكُمْ قِنْ قِيلُ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمُوْتُ فَيَقُولُ رَبِّ لَوْلَا أَخْرَجْتَنِي إِلَىٰ أَجَلِ قَرِيبٍ لَاٰصْدَقَ وَأَكُنْ قِنَ الصَّالِحِيْنَ ۝﴾ (المنافقون: ٦٣)

”اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے، اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہہ کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔“ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت نالے نہیں سکتا، اس کے لیے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعا کیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدے کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستے سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لِكِنْ اَتَنَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَسَدَّقَنَ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ ۝ فَلَمَّا

اَنْتُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخْلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعَرِّضُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ: ٩)

”اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور اُن کو پھر گئے۔“

اللہ فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا:

﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ ۝﴾ (التوبۃ: ٧٧)

”تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی بر باد کر دیتی ہے، شاید اسی لیے آنحضرت ﷺ نے

فرمایا کہ ”وَخَصَّتِيْنَ بِچِيْمِ مُوْمِنِوْنَ مِنْ جَمِيْعِ نَبِيِّيْمِ هُوْتِيْمِ، بَخْلٌ اُورِ بَدْ خَلْقِيْمِ۔“ ^۱ رسول اللّٰہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی اللّٰہ سے دعا میں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخیں بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ”خداوند! میں بخیں، کسلمندی، کبریٰ، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“ ^۲

اسلام میں زکوٰۃ کی جواہیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و میراث کی تغیبات شریعت محمدی ﷺ میں اسی لیے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک و صاف رہیں۔ یہ بھی پیش نظر ہے کہ بخیں صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اللّٰہ نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ اللّٰہ کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیں ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاوں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلانے اور دوسروں کو بتانے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیں ہے، اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کرنہ بتانا گناہ ہے:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۱۴۰/ البقرة)

”اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہو گا جو اللّٰہ کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔“

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اللّٰہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا جنی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا۔“ ^۳ اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہو گا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، اللّٰہ کے حق اور بندے کے حقوق کا اجمالی مجموع۔ نماز اور بندوں کے حقوق کے بدل جمود زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجا آؤ اور یہ کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:

﴿مَا سَلَكَمُ فِي سَقَرَهُ قَالُوا لِمَنْ تَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَأَمْنَكُ نُطْعَمُ الْمُسَكِّيْنَ﴾

(۴۴-۴۲/ المدثر)

”کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازوں میں سے نہ تھے اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔“

پہلا گناہ حقوق الہی کی بجا آوری سے اخراج اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورہ ماعون کے آخر میں ہے:

^۱ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في البخل: ۱۹۶۲۔

^۲ صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب التعوذ من العجز: ۶۸۷۶۔

^۳ مشکوٰۃ، كتاب العلم الفصل الثالث: ۲۵۰، بحواله شعب الایمان للبیهقی: ۱۷۶۷ تحقیق ناصر الدین البانی۔

﴿فَوَلِّ لِلْمُصَلِّيْنَ ۗ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۗ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاوِعُوْنَ ۚ وَيَكْتَبُوْنَ الْمَاوِعُوْنَ ۚ﴾ (١٠٦ / الماعون: ٧-٤)

”پھر خرابی ہے ان نمازوں کی جو اپنی نماز سے بے پرواہ ہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگنے نہیں دیتے۔“
پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، یہ حقوق الہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریع سے معلوم ہوا ہو گا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعییل کا سبب بنتا ہے اور اس لیے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص و طمع

حرص و طمع یا لالج وہ برائی ہے، جس میں نفس کی دنامت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ حرص و طمع جس میں بخالت کی بھی آمیرش ہو۔ عربی میں اس کو شُح گفتہ ہیں۔ جس کی برائی قرآن میں کئی موقوعوں پر آتی ہے۔ خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔ شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور یہو یاں لالج سے زیادہ کام طالبہ کرتی ہیں، یا ایک شخص کی کئی یہو یاں ہوں تو ہر یہو کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میراث زیادہ رہے اور شوہر کو اس یہو کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کٹکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرا کے لیے اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔ تو پھر وہی گھر جو پہلے غم کہد تھا، عشرت کہد بن جائے گا۔ میاں یہو کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

﴿وَأَخْيَرَتِ الْأَنْفُسِ الشَّرٌّ وَلَنْ تُحْسِنُوا وَتَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ يَعْلَمُ أَنَّكُمْ خَيْرٌ﴾

(النساء: ۱۲۸)

”اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔“

یعنی میاں یہو دونوں حرص اور لالج چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔ اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتداری پہلو بھی ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر، پچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یاد دینا کی۔ فرمایا:

﴿وَأَنْفَقُوا خَيْرًا لَا نَفِيدُهُ وَمَنْ يُؤْتَ شُرًّا فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

(التغابن: ۶۴)

”اور خرچ کرو، اپنے لیے بھلانی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔“

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

﴿وَيَعْلَمُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ يَوْمُ خَاصَّةً وَمَنْ يُؤْتَ شُرًّا فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

(الحضر: ۵۹)

”اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی

لائق سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔“
اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی دنیاوی کامیابی کا زیست ہے اور یہ زیست اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا، جب تک حرص و طمع کا خاتمه نہ ہو۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا، جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لاپچی بھی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے۔ کیوں کہ اس میں دو اور بد اخلاقیات شامل ہیں۔ ایک بخل اور دوسرا حسد۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَنْتَمِّنُ مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ ۖ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا أَكْتَسَبُوا ۖ وَلِلِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا أَكْتَسَبُوا ۖ وَأَسْلُوا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾

(النساء: ٤٢)

”اور اس کی ہوں نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کی کمالی ہے اور عورتوں کے لیے ان کی اور اللہ سے مانگو، اس کے فضل میں سے حصہ، بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔“

مطلوب یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوں اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خودا سے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر اس کی مصلحت کا انتہا ہو گا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی۔ ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَقَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝ لَا تَمْدُنَّ عَيْنِيْكَ إِلَى مَا مَنَعْنَا إِلَيْهِ آنَّوْكَاجَأَقْنَعْدُ﴾ (الحجر: ٨٧-٨٨)

”اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے، تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مست پسار، جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔“

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟ بھی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ”حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو بر باد کیا۔ اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بھایا اور حرام کو حلال سمجھا۔“ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔ فرمایا:

● صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریر الظلم: ٦٥٧٦

”حرص سے بچو، کیوں کہ اسی نے الگوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بھایا۔ اسی نے الگوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاتا اور اسی نے الگوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا۔“ * آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: ”حرص سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاتا۔ اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا۔ اسی نے ان کو فشق و فجور کے لیے کہا تو انہوں نے فشق و فجور کیا۔“ * آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرادینے والی نامردی ہے۔“ * حریص آدمی اس لیے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھتے والی فرمایا۔ نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔“ * سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ برائی کے لہجے میں فرمایا کہ ”انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں، جیسے کی خواہش اور مال کی حرص۔“ * کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیے جائیں، وہ ان کو اتنا برابر باذنیں کرتے، جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برپا کر دیتی ہے۔“ *

* صحيح ابن حبان، كتاب الغصب: ٥١٥٤؛ مستدرک حاکم، كتاب الايمان، ج ١، ص: ١٢۔

* أبو داود، كتاب الزكوة، باب في الشجاع: ١٦٩٨۔

* أبو داود، كتاب الجهاد، باب في الجراة والجبن: ٢٥١١۔ * نسائي، كتاب الجهاد، باب فضل من عمل في سبيل الله على قدمه: ٣١١٢۔ * ترمذى، أبواب الزهد، باب ما جاء في قلب الشيخ شاب على.....: ٢٣٣٩؛ ومستدرک حاکم، كتاب الرفاق، ج ٤، ص: ٣٢٨۔

* ترمذى، أبواب الزهد: ٢٣٧٦؛ احمد، ٤٥٦/٣؛ الترغيب والترهيب منذری، باب الترغيب في الزهد في الدنيا، ج ٢، ص: ٢٣٨۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی اصول کی بنابر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔ اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یادھو کے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصرست آیت میں بیان کر دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْتَهُمْ بِإِلَّا طَالِبُونَ﴾ (٤٢ / النساء: ٢٩)

”اے ایمان والو! آپ میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔“

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزویات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمه کر دیا ہے۔ یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے، یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے یا رشتہ لے یا سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کامال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جس نے ہم (مسلمانوں) پر تھیسا را اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں۔“ جان اور مال معاملات میں دو ہم چیزیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا۔ آپ نے اس میں ہاتھہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے۔ آپ ﷺ نے غلہ والے سے پوچھا کہ ”یہ کیا ہے؟“ عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا: ”تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں۔“ یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوا: ”جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہو گا۔“ ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر اس نے قسم کھالی، تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے، تو اللہ سے جب وہ ملے گا تو اللہ اس سے منہ پھیر لے گا۔“

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ”غصب“ کہتے ہیں۔ غصب کر لینا ظالماء فعل

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: من حمل علينا السلاح فليس منا: ٢٨٠ تا ٢٨٣.

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: من غش فليس منا: ٢٨٤.

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعد من اقطع حق مسلم: ٣٥٥.

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعد من اقطع حق مسلم: ٣٥٨.

ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہ السلام کے تقصیہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، جو غریب مچھیروں کی کشمکشیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسِكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْجَنَّةِ فَأَرْدَدْتُ أُنْ أَعْيَّهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ

قَلْكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصَّابًا﴾ (۱۸/الکھف) (۷۹)

”وہ جو کشمی تھی سوچ کچھ غریبوں کی تھی۔ جو دنیا میں محنت کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشمی کو چھین کر لیتا تھا۔“

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت

نہ تھی۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھرہ میں بھی دبائے گا ((طَوَّقَهُ اللَّهُ فِي سَيْعٍ أَرْضِينَ)) تو اس بوز میں کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا“۔ یہ اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبقیں ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔ *

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہیں جو کیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیزیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے۔ کیونکہ میں نے اس کو آگ کا گلزار دیا ہے۔“ *

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت نہ ہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجب مطالبہ کو ساقط کر دیتے ہیں:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بِيَنْكُمْ بِإِلَيْأَنْ طَلِيلٍ وَتَدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكْمِ لَتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ

النَّاسِ بِإِلَيْهِمْ وَأَنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۲/ البقرۃ) (۱۸۸)

”اور آپس میں ایک دوسرے کامل ناجائز طریق سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ، تاکہ کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو،“

* صحیح مسلم، کتاب المسافاة، باب تحريم الظلم و غصب الارض، ۴۱۳۳: یہ عبارت کی طرح سے ہے فی سیع ارضین، من سیع ارضین، الی سیع ارضین کیکھلیں صحیح مسلم: ۴۱۳۵، ۴۱۳۶۔ * شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور، ج ۱۱، ص: ۴۸۔ * ابو داود، کتاب الاقضیۃ، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸۳۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ إِلَمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًاٌ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًاٌ﴾ (۱۰/ النساء)

”بے شک جو قیمتوں کا مال ظلم سے کھاجاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے۔“

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے۔ یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا:

﴿وَالسَّارِقُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيهِمَا حَرَاءٌ يَمَا كَسِّبَ تَكَالًا قِنَ اللَّهُ وَاللَّهُ عَزِيزٌ﴾

حَلِيمٌ ﴿٥﴾ (٣٨ / المائدۃ)

”اور جو کوئی چور ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو سزا ان کی کمائی کی۔ تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آ و ر حکمت والا۔“

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی براہیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا۔ مرتبہ فل کے جبٹ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناخن خون بھی بہتا ہے۔ اور بے گناہ جانیں بھی صائم جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفاۓ جرم کی خاطر بردا کر دیتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی بچھلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی ضروری تھی۔ سورہ محمدؐ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے، جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیویوں سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”وہ چوری نہ کریں گی۔“ فتح کہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے۔ مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا: ”تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔“ * اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔ دوسرا یہ کہ جس کا نقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھتے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے

* صحیح بخاری، کتاب التفقات، باب نفقة المرأة اذا غاب عنها زوجها ونفقة الولد: ۵۳۰۹۔

لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رض صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے اور جوان میں سے کسی ایک فامر تک ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کار تکاب لیا اور اللہ نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔“ *

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا: ”اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یاری چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کانا جاتا ہے۔“ *

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو اللہ بھی ہم کو نہیں دیکھتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔“ *

ججۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ”تم میں سے ہر ایک کامال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ۔“ *

یعنی جس کامال ہوا اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا كُلُوكُوا أَمْوَالَ الْكُفَّارِ لَا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ
قِنْمُمٌ﴾ (٤٠/النساء)

”اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کامال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لیں دین ہو آپس کی خوشی سے۔“

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہے۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی، جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر کمر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اپنچھے اپنچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم سے پہلے تو میں اس لیے

* صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود کفارۃ: ٦٧٨٤۔ * صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب

قول اللہ: السارق والسارقة: ٦٧٩٩۔ * صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یحذر من الحدود: ٦٧٧٢۔

* صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة أيام منی: ١٧٣٩ تا ١٧٤٢۔

تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، اللہ کی قسم اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔ ۱

ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک چادر سرہانے رکھ کر سور ہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ کھینچ دی اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔“ ۲

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ میں نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکھزی سے حاجیوں کا سامان چرایا تھا اور اگر مالک بو شیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنستی گھسیتا پھرتا تھا۔“ ۳

1 ابو داود، کتاب الحدود، باب فی الحد يشفع فيه: ۴۳۷۳۔

2 ابو داود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز: ۴۳۹۴۔

3 صحیح مسلم، کتاب الکسوف، باب ما عرضن علی النبی ﷺ فی صلۃ الکسوف: ۲۱۰۲۔

نَّاپٌ تُولِّ مِنْ کُمْ وَمِيشِي

چوری کی عام قسم تو وہی ہے، جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کا نئے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہرمنہ ہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا، تشرع کی اور ان کی برائیوں کی تشبیہ کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیمیوں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم چیز نَّاپٌ تُولِّ کی کمی و میشی ہے، جس سے ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری بہتلا رہے ہیں اور جس سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشایہ ہے کہ جس کی وجہ پر ہو وہ اس کو دے دی جائے، بھی وہ میزان یعنی ترازو ہے، جسے اللہ نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یاد ہے میں کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے، فرمایا:

﴿وَالشَّهَاءُ رَقَعَهَا وَوَضَمَ الْمَيْدَانَ ۝ الْأَنْظَفُوا فِي الْبَيْذَانَ ۝ وَاقْبِمُوا الْوَزْنَ بِالْقُسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْبَيْذَانَ ۝﴾ (۵۵ / الرحمن: ۹-۶)

”اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو نہ تو لو اور مت گھٹاؤ تول۔“

اس ترازو سے انسان کا ہر قول فعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔ نَّاپٌ تُولِّ میں کمی بیشی کرنا، حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالتا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکید میں آئی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لیے ان کی دعوت میں نَّاپٌ تُولِّ میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیب علیہ السلام سمجھاتے ہیں:

﴿أَوْفُوا الْكِلَّاَنَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَرِزْنُوا بِالْقُسْطَلَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ وَلَا تَبْغُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثُوْفُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝﴾

(۲۶ / الشعراء: ۱۸۱-۱۸۳)

”اور پورا بھروسہ نَّاپٌ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھر و ملک میں فساد پھیلاتے۔“

بھی حضرت شعیب علیہ السلام دین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر میں آباد تھے:

﴿وَلَا تَنْقُصُوا الْمُكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِذْ أَلْكَمْ بَخِيرٍ وَإِذْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ فَلْيُبْطِلُهُ وَلَا تَنْقُصُهُ أَوْفُوا الْمُكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْنُوُا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴾ (۱۱ / ہود: ۸۴-۸۵)

”اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دون کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور اسے میرے لوگوں ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔“

یہ آیت بتاتی ہے کہ ماپ اور تول فی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھنے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ماپ تول میں کمی کرتے ہیں، ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیو پارکی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور فرع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معماشی برپا دی کا پیش خیمنہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرا لی گئی ہے:

﴿فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذِلِّكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنَّمَا كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾ (۷ / الاعراف: ۸۵)

”تو ناپ تول پوری کرو اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لیے بھلا ہے، اگر تم کو یقین ہو۔“

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن

چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ﴾ (۶ / الانعام: ۱۵۲)

”اور ناپ تول کو پورا کرو۔“

سورہ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا أَلْكَمْ وَرَزَّوْا بِالْقَسْطَلَابِ الْمُسْتَقْبِلِ ذِلِّكَ خَيْرٌ وَآخْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

(۱۷ / بنی اسرائیل: ۳۵)

”اور جب تم ناپ تو ناپ پورا بھر دو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔“

آیت کا اخیر مکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گوشروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے، مگر آخ رکاروہ بیو پار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس بداخلی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہو گا، سورہ مطوفین میں ہے جہاں اس بداخلی کی ممانعت کی گئی ہے، اس بیماری کا علاج بھی بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَيُلَمِّلُ لِلْمُطَّفِفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَنْتُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَانُوا هُمْ أَوْ زَوْجُهُمْ يُمْسِيْنَ ۝ أَلَا يَقْنُنُ أُولَئِكَ أَهْمَمُ مَبْعُدُنَوْنَ ۝ لِيَوْمِ عَظِيْمٍ ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لَيَّبِتُ

العلَّمَيْنَ ۝﴾ (الطففين: ۶-۱) (۸۲/۸۲)

”خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی، جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لیے ان کو اٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔“

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہوا اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو، اس سے کوئی چیز دوسرا سے ساحبوں سے چھپا کر لینا غلوں کہلاتا ہے، مگر زیادہ تمدن غنیمت میں جو بد دیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں، غنیمت کامال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلوں ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بد دیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتكب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوچھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے، اس میں ہر ایک کا برابر ابرار حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہو سکتا، دوسرا بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تھا ملکیت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی کی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہر ا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے نظرخی کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گناہ گارثہرے گا اور چوکہ ان بیانیں بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرأ ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے، فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَعْلَمَ طَلاقَهُ﴾ (۱۶۱: آل عمران)

”او کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے۔“

پھر فرمایا:

﴿وَمَنْ يَغْلِلْ يَأْتِ بِمَا يَغْلِلْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ لَمَّا تُوقَى كُلُّ نَفِيسٍ مَا كَسِبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾ (۱۶۱: آل عمران)

(۱۶۱: آل عمران)

”اور جو کوئی غنیمت کامال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

غزوہ خیر کے مال غنیمت میں سے مدغم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیر سے چل کر جب لوگ وادی القمری پہنچتے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان

ہے! جس شملہ کو اس نے خیر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے۔ ”لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا: ”یہ آگ کا تسمہ ہے، آگ کا۔“ *

خیر میں ایک اور واقعہ یہ گزرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا: ”تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھو۔“ یعنی کہ لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھئے کہ کوئی بات ہوئی ہے، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے بھائی نے مال غیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے۔“ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی حلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔ ** قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلاں ﷺ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مال غیمت لے کرتے، پھر اس میں سے پانچوں حصہ نکلا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ بھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا: ”کیا تم نے بلاں ﷺ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟“ اس نے کہا، سنسنی تھی، پوچھا: ”پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے۔“ اس نے مذہرات کی فرمایا: ”تم اس کو قیامت میں لے کر آتا، میں نہیں قبول کرتا۔“ *** عمال کوہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں، فرمایا: ”اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا، تو وہ ”غلوں“ ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔“ ****

1 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۱۔ 2 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۰۔ 3 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الغلول اذا كان يسير: ۲۷۱۲۔ 4 سنن ابی داود، کتاب الافتية، باب فی هدايا العمال: ۳۵۸۱۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناقص مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپورا ڈاٹھن کو پکھ دے کر اپنے موافق کر لے۔ *

پہلے عرب کے کام اپنی مفروضہ نبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر پکھند رہا نہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہ امام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر آنحضرت ﷺ نے کامن کے حلوان کی خاص طور سے مناعت فرمائی۔ * عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیے تھے، اس لیے وہ قانون کی نامہواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لیے علامیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کام اور قاضی علایمی لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرا کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے تورات کے احکام پر مصالح و ضرورت کے اقتضا سے پرداذال دیتے تھے۔ * چنانچہ تورات کے قوانین میں تحریف کا ایک سبب یہی رشوت خوری تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردوہ دری کی گئی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ تَهْمَةً قَلِيلًاٰ أَوْ لَكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمُ الْأَثَارُ وَلَا يُكِبِّرُهُمُ اللَّهُ يُوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُرِيكُمْ بِهِمْ وَلَا هُمْ عَذَابُ أَلِيمٍ﴾

(۱۷۴/ البقرة)

”اللہ نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے بیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دروناک عذاب ہے۔“

”پیٹ میں آگ بھرنا“، اس لیے فرمایا کہ یہودیا کی اس معمولی دولت کے لائق میں آکر اللہ کے احکام میں رو بدال اور نشانے الہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ این جریئے نے اس آیت کی تفسیر میں لقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علا کو اس لیے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف تورات میں ہیں، وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے لفظ سے یہ

* مجمع البخار علامہ فتنی، ج ۲، ص: ۳۲۹۔

* ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی کراہیہ مهر البغی: ۱۱۳۳۔

* صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الرجم بالبلاط: ۶۸۱۹۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الہی میں عام طور سے رو بدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر و دفعہ ہے، فرمایا:

﴿وَتَرَىٰ كَثِيرًا قَتْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْأَثْمِ وَالْعُدُولِ وَكَلِّهُمُ الشُّحْتَ لَيْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ وَلَا كَيْفَمُهُمُ الرَّبُطُونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْأَثْمُ وَكَلِّهُمُ الشُّحْتَ لَيْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۵/ المائدۃ: ۶۲-۶۳)

”اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔“

﴿سَمَعُونَ لِلْكَذِيبِ أَكْلُونَ لِلشُّحْتِ ط﴾ (۴۲/ المائدۃ: ۴۲)

”جھوٹ کے بڑے سنبھالے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔“

قرآن پاک کی ایک اور آیت جو پبلے گزر چکی ہے یہاں پہنچی اس تدلیل کے قابل ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْتَنَمْ بِالْبَاطِلِ وَنَذْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَمَاءِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْأَثْمِ وَأَثْمُ تَعْلَمُونَ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۸)

”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔“

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رשות کی ممانعت میں صاف و صریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ❷ رشوت

دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی امانت کرتا ہے اور جرم کی امانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھے پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبد اللہ بن رواحہ ؓ صاحبی کو سمجھتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی

رشوت دیئی چاہی، آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کرو اور اس کے بدله تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یعنی حضرت ابن رواحہ ؓ نے فرمایا: ”اے یہودیو! اللہ کی قسم! تم اللہ کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ

❷ ابو داود، کتاب الاقضیۃ، باب فی کراہیۃ الرشوة: ۳۵۸۰۔

حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے۔ یہودیوں نے ان کی یہ تقریر میں کر کہا کہ ”یہی وہ (النصاف) ہے جس سے آسان اور زمین قائم ہیں۔“ *

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔ * ایک دفعہ ایک عامل نے آ کر کہا کہ یہ صدقہ کامال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریری کی، حمد و شنا کے بعد فرمایا:

”عمال کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو یہیجہ ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تختے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لوے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گرون پر لا دکر لائے گا، اونٹ گاڑی، بکری جو ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا: ”میں نے پہنچا دیا۔“ *

اس آیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، وہ غلوں والی آیت کی تفسیر ہے۔

* مذکور امام مالک، کتاب المساقاة، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۳۵۸۱ و کتاب الخراج، باب فی هدایۃ العمال۔

* ابو داود، کتاب الاقضیۃ، باب فی هدایۃ العمال: ۲۹۴۶۔

* صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب فی هدایۃ العمال: ۷۱۷۴۔

سودخوری

سودخوری، حرص و طمع بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص و طمع تو یوں کہ سودخور اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آ جائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقرض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارخیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں پکج کی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودخوری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے اور ظالم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور حرم نہیں کرتا، اسی لیے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُنْظَلُونَ ﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۹)

”نَمَّ كُسْيَ الظَّلْمَ كَرِدَ اور نَمَّ قَمْ بِالظَّلْمِ كَيَا جَاءَ۔“

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہود یوں کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہود یوں پر نعمتوں کا دروازہ جھومند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:

﴿وَأَخْذِهِمُ الْيَلْوَا وَقَدْ نَهُوا عَنْهُ وَأَكْلُوهُمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ (۴/ النساء: ۱۶۱)

”اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے رو کے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے۔“

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے دور کر دیا:

﴿الَّذِينَ يَا كُلُّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مُثْلُ الْيَلْوَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَمَ الْيَلْوَا فَمَنْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةً فَإِنَّمَا يَرَى فَلَمَّا مَا سَلَفَ طَ وَأَمْرَةٌ إِلَى اللَّهِ طَ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَبُ النَّارَ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ طَ يَعْلَمُ اللَّهُ الْيَلْوَا وَيَعْلَمُ الْمُصَدَّقَاتِ طَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كُفَّارَ إِنَّمَا هُمْ﴾

(۲/ البقرة: ۲۷۵-۲۷۶)

”جو سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے، جیسے وہ امتحات ہے جس کے شیطان نے پٹ کر حواس کو دیئے ہوں، یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، تو جس کے پاس اس کے پروگرام کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے پروردگار پھر ایسا کرے تو وہ دوزخ میں رہیں گے، اللہ سود کو مناثا اور صدقہ و خیرات کو

بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پیار نہیں کرتا۔“

قیامت میں سودخوار کا بدحواس ہو کر انھنَا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہو گی، دنیا میں سودخوروں کا بھی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال دولت کے چھینے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سودخواروں کو ناشکر گناہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ اللہ نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونچی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھادیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے، جو سودی کار و بار کرنے لگے تھے، جیسے چھپرہت عباس بن عبدالمطلب اور بن عمر و بن عیسیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا، تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی آئیں آتیوں کے سلسلہ میں ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ وَذَرْوَانِ مَا يَعْقِلُ فِيمَنِ الْيَوْمَ لَكُنُتمْ مُؤْمِنُونَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَقْعُلُوا فَأَذْنُوا ۝ بِحَرْبٍ قَنَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۝ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۝ لَا تَنْظِمُونَ وَلَا تُظْلِمُونَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِيرَةٌ إِلَى مَيْسِرَةٍ ۝ وَإِنْ تَصْدِقُوا خَيْرَ لَكُمْ إِنْ لَكُنُتمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَإِنْ قَوْا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُوَفَّى كُلُّ شَيْءٍ بِمَا كَسَبُوا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۸-۲۸۱)

”اے ایمان لانے والو! اللہ کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا، ہواس کو چھوڑ دو، اگر تم واپسی مومن ہو تو اگر تم ایمان کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے ہوشیار ہو جاؤ اور اگر تم بازا آ جاؤ تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کشاوی تک مہلت دو اور معاف کر دیا تمہارے لیے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھو ہو اور اس دن سے ڈرو، جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر کسی کو دہ پورا پورا دیا جائے گا ہواس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا جائے گا۔“

ان آتیوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب اللہ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور جس نے کسی کامال نا حق کھایا ہوگا، اس کا حساب ہوگا، تو اگر تم نے نیکی کی ہو گی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا، تو اللہ کے یہاں پورا پورا املاں جائے گا۔

جامعیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے، تو مہاجن کہتے کہ تم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً: ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گناہ سود ہو جاتا، اللہ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الزِّيَادَأَضَعَافًا مُضْعَفَةً وَلَا تَقْوُا اللَّهَ لَعَلَّمْتُمْ تُفْلِعُونَ﴾

﴿وَلَا تَقْوُا النَّارَ الَّتِي أُعَدَّتُ لِلْكُفَّارِ﴾ (۲/۱۳۰-۱۳۱) (آل عمران: ۱۳۰-۱۳۱)

”اے ایمان والو! (اصل سے) دو گناہ چو گنا سود مدت کھاؤ اور اللہ سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاں پاؤ اور اس آگ سے بچو جو مکروہ کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا: ”میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پھر لیے کنارے پکھرا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارے پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کہ پھر مارتا ہے کہ اس کامنہ کھل جاتا ہے اور وہ پھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جب تک علیہ السلام نے تیار کی یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خور ہے۔“ * سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پیسیں ایک کر کے محنت سے جور و زی پیدا کرتے ہیں، سود خور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے، تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پھر لقمہ ترین کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے، تو وہ، وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں، جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ *

* صحيح بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶ و کتاب التعبير، باب تعییر الرؤيا بعد صلاة الصبح: ۷۰۴۷۔

** ابو داود، کتاب البيوع، باب فی اکل الربا و موكله: ۲۲۲۳۔

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کئی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثرتوں اس میں بہت انظار آتی ہیں، اسلام سے پہلے جو نہ ہب تھے، ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ پکھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے، ۱ لیکن اس کو حرام قطعی تحریرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پری تھی، شراب پینا، پلانا اچھے گھرانوں میں اطف او رفرغ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، یویاں شوہروں ۲ کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔ ۳

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض یہک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوا لے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑاتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی پیدا ہوتی تھی، کبھی ترنسٹ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑا لاتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ ۴ اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنانے کا کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جو اہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے، ان کو دنخ کر کے ان کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر کھاتے اور رنچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نہ کوئی اچھی چیز نہیں، اللہ نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بڑی نعمت ہیں، لیکن تم ان سے نہ شے تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا:

﴿وَمِنْ كُرْبَتِ الْجَيْلِ وَالْأَعْنَابِ تَكْبِدُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَيُذْقَ حَسَنَاتٍ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيَّةً لِقَوْمٍ يَعْقُلُونَ﴾ (۱۶/ النحل: ۶۷)

”اور کھجور اور انگور کے میوے دیے، تم ان سے نہ شے بناتے ہو اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کے لیے اللہ کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔“

اس آیت میں نہ کہ ”رزق حسن“ کے مقابل میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نہ ”رزق حسن“ ۵ نہیں۔ ان آئتوں میں درحقیقت خرد باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، ۶ اور پردو دھ اور گور اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلامیوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دنوں پیدا ہوتی ہیں۔

۱ لوقا ۱۵۔ ۲ سعد معلقہ میں قصیدہ عمر بن کثوم الاحبی بصحنک، ص: ۱۰۳۔

۳ صحیح بخاری، کتاب الاشریۃ، باب من رأى ان لا يخلط البیر والتمر: ۵۶۰۰۔

۴ سعد معلقہ میں طرف کا قصیدہ، ص: ۲۰ اور صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۳۰۰ میں حضرت جزہ شیعیانہ کا قصہ۔

۵ تفسیر کبیر امام رازی، تفسیر سورۃ نحل، ج ۴، ص ۱۵۹۔ ۶ مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:

﴿لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّىٰ تَعْلَمُو مَا تَقْرُبُونَ﴾ (۴/ النساء: ۴۲)

”تم جب نشرے میں ہوتا نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جاؤ کہم کیا کہتے ہو۔“

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پیٹے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کتابی تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہو گا:

﴿يَسْأَلُونَكُمْ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِنْهُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُهُ لِلنَّاسِ ۖ وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ تَفْعِيلَهَا ۚ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۹)

(اے پیغمبر)! تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ ان دلوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔“ فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لاطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بد ولست کچھ کھانے پینے کوں جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تاب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأُنْصَابُ وَالْأَذْلَامُ رِجُسْ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُنَّ الشَّيْطَنُ أَنْ يُؤْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنَّمْذَنُهُمْ ۝﴾

(۹۰-۹۱/ المائدۃ)

”اے ایمان والو! شراب اور جو اور چڑھاوے کے بت اور پانے، گندے کام ہیں شیطان کے، سوان سے بچتے رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیرڑاں دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم بازاً تے ہو۔“

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابے نے چلا کر کہا، یا اللہ! ہم بازاً گئے، اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر

طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بھائی جا رہی تھی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روپ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو محلی ہوئی ہے، یعنی شراب اور جوئے کو چڑھادے کے بتوں اور بائٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں شمار کیا ہے، اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت مولیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاق آیک قطبی مرگیا تو فرمایا:

﴿هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطِينِ ﴾ (۲۸/القصص: ۱۵)

”یہ واشیطان کے کام سے۔“

یعنی بہت ہی برائی کام ہوا، اسی طرح اس آیت:

﴿إِنَّ الْمُبَدِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطِينِ ﴾ (۱۷/بنت اسرائیل: ۲۷)

”بربضوں خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔“

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوئے، بتوں کے چڑھادے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بائٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خوری، قمار بازی اور دکھادے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے، جس کی مثلیں زمانہ کے صفحوں پر کھصی آج بھی ملتی ہیں۔ اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو براہیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں بھی نہ کرتے۔ کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جو اکھلے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے، غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھو یا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب نزل تحریم الخمر: ۵۵۸۲۔

شراب کے لفظ سے یہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لیے خر کا لفظ استعمال کیا ہے، خر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش پر چھا جائے، وہ خر میں داخل ہے، حضرت عمر بن الخطبوؓ نے منبر بنوی پر کھڑے ہو کر فرمایا: ”شراب (خر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔“ ❶ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہر وہ شے جو نہ پیدا کرے، حرام ہے۔“ ❷ فرمایا: ”جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آختر میں اس سے محروم رہے گا۔“ ❸ آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرا میں شراب، سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا، ناموس وحی حضرت جبرائیل ﷺ نے کہا: ”اس اللہ کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔“ ❹ گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔“ ❺ یہ بھی فرمایا کہ ”قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔“ ❻ اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کیے، یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتوں کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ ❾ اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آپ کے کہ ﴿وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدُوانِ﴾ (۵ / المائدۃ: ۲) ”گناہ اور تحدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔“ کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا: ”اللہ نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے۔“ ❻ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ”ہر نہ کسی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا بھی دیسائی حرام ہے۔“ ❽

- ❶ صحیح بخاری، کتاب الاشریة، باب الخمر من العنب: ۵۵۸۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الاشریة، باب الخمر من العسل: ۵۵۸۵؛ مسلم: ۵۲۱۲، ۵۲۱۱۔ ❸ بخاری، کتاب الاشریة، باب قوله تعالى: إنما الخمر..... مسلم: ۵۵۷۵۔ ❹ بخاری، ایضاً: ۵۵۷۶۔ ❺ بخاری، ایضاً، ایضاً: ۵۵۷۸۔
- ❻ ایضاً: ۵۵۷۷۔ ❽ ایضاً، باب ترخیص النبي ﷺ فی الاویعة: ۵۵۹۳۔
- ❼ ابو داود، کتاب الاشریة، باب العصیر للخمر: ۳۶۷۴۔ ❽ ابو داود، باب ما جاء في السكر: ۳۶۸۱۔
- ترمذی، کتاب الاشریة، باب ما جاء ما اسکر کثیره فقليله حرام: ۱۸۶۵، ۱۸۶۶۔

غرض و نظر

غیظ و غصب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے بہت سے ظالمانہ اور بے در دانہ کام انسان صرف غیظ و غصب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غصب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی تعریف کی ہے:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ (١٣٤) / آل عمران

”کہ وہ ایسے غصہ کو دپالتے ہیں۔“

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يُغْرِيُونَ﴾ (٤٢) / الشورى: (٣٧)

”جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔“

انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پیچاڑ دے، پہلوان وہ سے جو غصہ میں انسے کو قابو میں رکھے۔“ *

حضرت ابو ہریرہ، **۱۲** حضرت ابن عمر **۱۳** حضرت جاریہ بن قدامہ، **۱۴** حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ ”غصہ نہ کیا کرو“۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی آپ ﷺ نے ہر دفعہ ہبھی فرمایا کہ ”غصہ نہ کیا کرو“۔ مند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ **۱۵**

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر صحیح تین فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا: "آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا ہے، جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے اور ان سب سے براؤہ۔ جس کو غصہ جلد آتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں! غصہ

^{٤٦} صحيح مسلم، كتاب البر والصلة باب فضل من يملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤٣ وبيخاري، كتاب الأدب، باب الحمد من الغضب: ٦٦١٤ .
^{٤٧} رواه البخاري: ٢٠٢٠، مسلم: ٣٦٢٢، أحمد: ٢٠٢٠.

^{٤٣} صحيح ابن حبان: ٢٩٦ عن عبدالله بن عمرو. ^{٤٤} طبراني الأوسط: ٧٤٩١ صحيح ابن حبان.

-٤٨٤/٣- طبراني الاوسط: ٢٣٥٣ -٣٧٣/٥ احمد، ٦

ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی ریگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہواں کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔*

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”غضہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی مخندرا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وہ دفعو کر لے۔“ * حضرت ابوذر ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔“ *

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور ریگیں پھول گئیں، تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا: ”مجھے ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ كہے۔“ *

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَهَلِينَ ﴾ وَإِنَّمَا يَنْهَاكُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ

فَاسْتَعِدُّ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَوِيْهُ عَلِيِّمٌ﴾ (۷/الاعراف: ۱۹۹-۲۰۰)

”معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگزر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجوہ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جانے والا ہے۔“

اسی قسم کی آیت سورہ ختم السجدہ (۳۲:۳۲) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ ہے:

”نیکی اور بدی بر ابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے اور اگر ابھار دے تجوہ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا جانے والا ہے۔“

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) اللہ اس کی سننے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو حفوظ کر لے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھنے کے جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو اللہ کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔ دو ظاہری

* ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقال عند الغضب: ۴۷۸۲۔ * ایضاً: ۴۷۸۴۔

** ایضاً: ۴۷۸۲۔ * صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ۶۱۱۵ و مسلم، باب فضل من يملک نفسه عند الغضب: ۶۶۴۶۔

علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مخصوصاً سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے، اس سے منشایہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بعض وکینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذب رکھنا بعض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بڑی چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعائیں گا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

﴿رَبَّنَا أَغْفِلْنَا وَلَا خُوَانَنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْنَ فِي قُلُوبِنَا غُلَامًا لِّلَّذِينَ أَمْتَنَوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۱۰ / الحشر: ۵۹)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ، اے ہمارے پروردگار! تو زمیں والا مہربان ہے۔“

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے، آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، وہاں بعض وکینہ کا گزرنا ہو گا، فرمایا:

﴿وَتَرَزَّعُنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غُلَامَخَانِ عَلَى سُرُورٍ مُّتَقْلِبِينَ ۝﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۷)

”اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آئے سامنے بیٹھے۔“

﴿وَتَرَزَّعُنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غُلَامَخَانِ عَلَى سُرُورٍ مُّتَقْلِبِ الْأَنْهَرِ﴾ (۷ / الاعراف: ۴۳)

”اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہیں ان کے نیچے بیٹھی ہوں گی۔“

ان آئیوں کے اشارے سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا، جنت کا تختہ ہاتھ نہ آئے گا۔

آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ فنا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ فرمایا:

”اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔“ *

مطلوب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابوالیوب حابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے، دنوں میں تو ایک دوسرے سے منہ

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینہی عن التحساد والتذابی: ۶۰۶۰؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۵۲۶؛ ابو داود، کتاب الادب، باب فی هجرة الرجل اخاه: ۴۹۱۰؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی الحسد: ۱۹۳۵؛ مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المهاجرة: ۱۶۸۴۔

پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ ” * ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ” کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے، تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آ کر ملے، پھر سلام کرے، تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا۔ ” * کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ” ہر دو شنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دوآ دمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں۔ ” * اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا: ” دو شنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہو گی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہو گی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہ آ کیں۔ ” * یہ یہی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ” تین شخصوں کی پنجشنبہ نہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے۔ ” * ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جن دوآ دمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور انہیں دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

* صحيح بخاری، کتاب الاستذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة: ٦٢٣٧؛ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الھجر فوق ثلاث: ٦٥٣٢؛ ترمذی، ایضاً، باب ماجاء فی کراہیۃ الھجر للمسالم: ١٩٣٤؛ ابو داود، کتاب الادب: ٤٩١١؛ موطا مالک: ١٦٨٢۔ * ابو داود، ایضاً: ٤٩١٣۔ * صحيح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهى عن الشحناء: ٦٥٤٤؛ ابو داود: ٤٩١٦؛ ترمذی: ٢٠٢٣؛ ادب المفرد: ٤١١۔

* طبرانی فی الاوسط: ٧٤١٩۔ * ادب المفرد للبخاری، باب الشحناء: ٤١٣۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصيان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، قرآن پاک میں اس کے لیے دو اور لفظ بُغْنٰی (سرکشی) اور عُدُوَّاً (عدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

﴿فُلِ إِلَمَا حَرَّمَ رَبُّ الْفَوْاجِحَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَالْأَنْوَارُ وَالْبَغْنَىٰ يَفْيِيْرُ الْحَقِّ﴾

(الاعراف: ۳۳)

”کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿وَيَنْهَا عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْنِيَّ﴾ (النحل: ۹۰)

”اور اللہ بے حیائی، ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔“

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مرادِ حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگرنے کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو بر باد کر دے لے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یعنی مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گوکسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بعد تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیے دی گئی، تاکہ یہ برائی آگئے بڑھنے پائے، فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا آتَاهُمُ الْبَغْنِيَّ هُمْ يَتَّهِرُونَ وَجَرَوا سَيِّئَةً سَيِّئَةً وَيَنْهَا﴾

(الشوری: ۴۰-۳۹)

”اور جن پر ظلم ہو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔“

یعنی جیسی برائی کوئی کرے دیسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف اللہ کے ہاں پائے گا اور ظالم اللہ کی محبت سے محروم رہے گا:

﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرَهُ اللّٰهُ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (الشوری: ۴۰)

”پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے، تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔“

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔

﴿وَلَمَّا انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَيِّئِاتِهِ﴾ (٤٢ / الشوری: ٤١)
 ”اور جو کوئی اپنے ظلم کیے جانے کے بعد بدلتے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔“
 ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہلے کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:
 ﴿إِنَّمَا السَّيِّئُاتِ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَعْمَلُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِيقَةِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (٤٢ / الشوری: ٤٢)

”راہ ان پر جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔“

اگر کوئی کسی ظلم سے مارڈا تے تو اس کے ولی کو طلب تھا صاص کی منصفانہ اجازت دی گئی:
 ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَالِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفُ فِي الْفَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا﴾

(٣٣ / بنی اسراء: ١٧)

”اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شہاس کو مدد وی جائے۔“

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔
 مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی خالماں کا رواجیوں کو علایمیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ذریعے ظلم کرنے میں کچھ بچپنا کیسی گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهَرُ بِالشَّوْعِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلِيمٌ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلَيْهَا﴾

(٤ / النساء: ١٤٨)

”اور اللہ کو بربی بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔“
 اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے، سبل کر اس سے لڑیں اور اس کو اللہ کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

﴿فَإِنْ بَغَتْتَ أَحَدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبَغَّى حَتَّىٰ تَقْتَلَ عَلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ﴾

(٤٩ / الحجرات: ٩)

”تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھائے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔“

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق خلاف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا:

وَلَا تَعِدُ مِثْلَمَ شَنَانَ قَوْمًا نَّصَدَ وَكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْعَرَامِ أَنْ تَعْدُهُ وَلَا تَعَوَّذُ عَنِ الْبَرِّ
وَالشَّفْوَىٰ وَلَا تَعَوَّذُ عَنِ الْأَنْوَاعِ الْأُنْوَاعِ وَالْأَعْدَوَانِ وَالْغَوَالِهِ إِنَّ اللَّهَ شَرِيدُ الْعِقَابِ ۝

(۲/۵) (المائدۃ: ۲۰)

”اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھوا اور یتکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور اللہ سے ذرتے رہو، بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔“

اس سے معلوم ہو گا کہ دنیا میں ظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حرہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور ننان کو اپریشن ہے، اسلام نے بہت پہلے پیش کیا ہے اور صرف وصیرت حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہو جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ”تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم“۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا: ”اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔“ ﴿ اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے، ظالم کی مدد کی ترغیب والا کرنے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی براہی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی، فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ اے میرے بندوں! میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔“ ﴿

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔“ ﴿ ظلمات عربی میں اندر ہرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اندر ہرے کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندر ہر اہو

صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب اعن اخاک ظالمماً او مظلومماً، ۲۴۴۴ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب نصر الاخ ظالمماً ومظلومها: ۶۵۸۲۔ ﴿ صحیح مسلم، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۲ و مسنون احمد، ج ۵، ص: ۱۶۰ و ادب المفرد بخاری، باب الظلم: ۴۹۰۔ ﴿ صحیح مسلم، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۶ و صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الظلم ظلمات یوم القیامۃ: ۲۴۴۷۔

جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہو گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہیے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مد و گار چھوڑ دے۔“ * براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت علیہ السلام نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ * حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو امیر بن کر جب آپ علیہ السلام نے یہ کہ جیسا کہ جیسا کہ تو ان کو تصحیح فرمائی کہ ”مظلوم کی بد دعا سے بچت رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے نجی میں کوئی پر وہ نہیں۔“ * حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے، اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینا رہو گا نہ درہم، ظلم کے بد لہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔“ * فرمایا کہ ”ظالم کو اللہ مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔“ *

فرمایا: ”اہل ایمان جب دوزخ سے پاک ہو جیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کیے تھے، ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تو ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔“ *

- * صحيح بخاری، کتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه: ۲۴۴۲۔ * ایضاً، باب نصر المظلوم: ۲۴۴۵۔ * صحيح بخاری، کتاب المظالم، باب الاتقاء والحد من دعوة المظلوم: ۲۴۴۸۔
- * صحيح بخاری، کتاب المظالم، باب من كانت له……: ۲۴۴۹۔ * صحيح مسلم، باب تحريم الظلم: ۶۵۸۱۔
- * صحيح بخاری، کتاب المظالم، باب قصاص المظلوم: ۲۴۴۰۔

فخر و غرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، بلکہ جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے تھیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو بکرا اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلی کاظمہ شیطان سے ہوا، اس نے آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُمْ﴾ (الاعراف: ۱۲)

”میں اس سے بہتر ہوں۔“

وہ مٹی سے بنتا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شجنی پر اس کو مردود فرما دیا اور فرمایا:

﴿فَأَهْمِلْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تُتَكَبَّرَ فِيهَا فَإِنْ خَرُجْ إِنَّكَ مِنَ الظَّاغِنِينَ﴾

(الاعراف: ۱۳)

”یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیب نہیں، بلکہ جا تجھے بڑائی کے بدله یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔“

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لیے بعض اپنی عظمت کا تخلی کافی نہیں، بلکہ اس تخلی کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تھیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جہاں شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا: ”نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو بولنے کیا جائے اور لوگوں کو تھیر سمجھا جائے۔“ *

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو نہ ہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخل اقویں کا سرچشمہ بنادیا۔ پیغمبر وہ کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے:

﴿وَبِرَزْوَا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الصَّعْنَوُ اللَّذِينَ اسْتَكَبُرُوا إِنَّا لَنَا الْكُمْبَرُ فَهُنَّ الَّذِينَ مُغْنُونَ

﴿عَنَّا هُنَّ عَذَابُ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ابراهیم: ۲۱)

”اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے رو برو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا

* ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الكبر: ۹۴

میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے، تو کیا (آن) تم عذاب اللہ میں سے کچھ (تحوڑا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بڑی بڑی شناختیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے:

﴿فَأَسْتَلْهِرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِيًّا﴾ (۴۶ / المؤمنون)

”تو وہ سب شخصی میں آگئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔“

اسی تکبر کی بنابرودہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کو اس سے نگ و عارقا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں:

﴿فَقَالَ الْمَلَكُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرَكَ إِلَّا بَشَرًا قِتْلَنَا وَمَا تَرَكَ إِلَّا

الَّذِينَ هُمْ أَرَادُنَا بِإِدَى الرَّأْيِ وَمَا تَرَكَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ إِلَّا نَظَّلْنَاهُمْ لِكُلِّ ذِيْنِ﴾

(۱۱ / ۲۷: هود)

”اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رہا لے ہیں، (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔“

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو نہ ہی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاکہ کہر و غرور کے تمام مارج پیش نظر ہو جائیں، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿إِلَيْهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عَرَقَةٍ وَّيَقَاقٍ﴾ (۲۸ / ص: ۳۸)

”لیکن جو لوگ مکفر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے) ہیں۔“

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے:

﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُّتَّكِثِرٍ جَبَارٍ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۳۵)

”جتنے مغرورو اور سرکش ہیں، اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگادیتا ہے۔“
دموکتوں پر اس کے لیے مخالف کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
کہ ایسے مغرورو اور فحشی ریمیری محبت کی عزت سے محروم ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ فَحْشًا لِّأَفْوَالِ﴾ (٤ / النساء: ٣٦)

”اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرورو اور فحشی رہو۔“

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿٥﴾﴾ (١٦ / التحلیل: ٢٣)

”اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

ان کو جہنم کی خوش خبری بھی بیہیں دے دی گئی ہے:

﴿الْكَيْسُ فِي جَهَنَّمَ مَكْتُوْبٌ لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٥﴾﴾ (٦٠ / الزمر: ٣٩)

”کیا جہنم میں مغروروں کاٹھ کانا نہیں۔“

﴿فَيُلْكِسُ مَكْتُوْبَ الْمُنْتَكِبِينَ ﴿٥﴾﴾ (٧٢ / الزمر: ٣٩)

”تو دوزخ مغروروں کاٹھ کانا ہے۔“

مغروروں کے ساتھ یہ تختی اسی لیے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو شراث ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شماری نہیں کیا جا سکتا، مثلاً: ایک متنکب شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔“ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ”مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں، وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غروروں ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔“ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلک رہے گا۔ یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گونا گون صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا استقصاً تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیے ہیں، مثلاً: کبر و غرور کے جو مظاہر امراء مسلمین سے تعلق رکھتے

ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر: ٤٠٩١۔

ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔“ ایک بار آپ ﷺ خود عصا میکے ہوئے لٹک لے تو صحابہ کرام تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ ”عمجیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔“ ۴ بڑے آداب والقارب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے آپ کو خیریہ ملک الملوك اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”سب سے بر امام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کوملک الملوك اور شہنشاہ کہلاتے۔“ ۵

کبر و غرور کی چند عالم اور بد نما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَكُنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾

(۱۷) / بنی اسرائیل: (۳۷)

”اور زمین میں اکڑ کرنہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑنیں سکے گا اور نہ (تن کر چلنے سے) پھاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔“

﴿وَلَا تُصْعِرْ خَدَّكَ لِلْتَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا إِنَّ اللَّهَ لَأَمْبُغُ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٌ﴾

(۱۸) / لقمان: (۳۱)

”اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اتر اکرنہ چل، بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو، فمار ہو۔“

گناہ گار کی شان یہ بیان کی ہے:

﴿تَأْنَى عَطْفَهُ﴾ (۲۲/الحج: ۹)

”ایمٹھتا ہوا۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْتَرِ اللَّهَ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ۶

”جو شخص غور سے اپنے کپڑے گھسیتے گا، اللہ اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا اپہن کر اتراتا ہوا کلا تو اللہ نے زمین کو حکم دیا، جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔“ ۷ اس کے عکس بہت سے افعال ہیں جو تو واضح و خاک ساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو اللہ نے اپنی خاص عبودیت کی علامت

۸ ابو داود، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل: ۵۲۳۰۔ ۹ صحیح بخاری، کتاب الادب:

۱۰ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسیال الازار: ۴۰۸۵۔

۱۱ ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء فی شدة الوعيد للمتكبرين: ۲۴۹۱۔

قرار دیا ہے:

﴿وَعِبَادُ الْرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْسُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُوَنَا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجِهَلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾

(الفرقان: ٦٣)

”اور (خداۓ) رحمن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں، جو زمین پر فروتی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جهالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔“

رسول اللہ ﷺ دوز انو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بد و بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا، بیٹھنے کا

یہ کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: ”اللہ نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے، مکابر اور سر کش نہیں بنایا ہے۔“ *

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے جن کو لوگ مغرور سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغوروں ہوں، حالانکہ میں گدھے ہو سوار ہوتا ہوں، کبل اور ہتا ہوں اور بکری کا دودھ دو ہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ”جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔“ #

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں، لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں، وہ یہ ہیں، حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہہ کر منادیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذِكْرٍ وَأَنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شَعُوبًا وَقَبَائلَ لِتَعَارِفُوا مَا

(الحجرات: ٤٩)

”لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوالہ) سے پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرا کیں، تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔“

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی نمایاں سب و حسب پڑھیں، بلکہ روحاںی فضائل پر ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَ مَلَكُومْ عِنْدَ اللَّهِ أَنْتُكُمْ﴾ (الحجرات: ٤٩)

”اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا ہیزگار ہے۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ ”خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پر ہیزگار اور بد کار بد بخت، تم لوگ آدم کے بیچ ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں، جو ہنہم کا

* ابن ماجہ، کتاب الاطعمة، باب الاکل متکذا: ٣٢٦٣۔

ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ٢٠٠١۔

کوئلہ ہیں یا اللہ کے نزدیک اس کبریٰ سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو حسیناً چلتا ہے۔^۱ جہاں تک زیر و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوب و شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمده ہو، تو فرمایا کہ ”اللہ حسن کو پسند کرتا ہے۔“^۲ یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور و تکبیر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی تصحیح کیں جن میں ایک تصحیح یہ تھی کہ ”تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور اللہ غرور کو نہیں پسند کرتا۔“^۳ تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے، اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو خر و غرور کا ذریعہ بنالیا جائے تو اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہیں:

﴿إِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَاعِبٌ وَّلَهُ وَرِزْقُكُمْ وَتَقْأَخْرُ يَنْتَهُمْ وَتَكَاثُرُ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾

(۵۷) / الحدید: ۲۰)

”(لوگو!) جانے رہو کر دینا کی زندگی کھیل اور تاشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا، (بس یہی کچھ ہے)۔“ احادیث میں مال و دولت کی براہی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا۔ آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے، جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھاپی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔“^۴ قوت ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعے سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جاسکتے ہیں، اس لیے اس قسم کے موقعوں پر ایک قابل ستائش و صفائح ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ”قوی امین“ کہا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:

^۱ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب: ۵۱۱۶۔

^۲ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الكبر: ۱۹۹۹۔

^۳ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔

^۴ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الهاکم التکاثر: ۳۲۵۴۔

﴿قَالَ لَوْاَنَ لَيْ إِكْمُ قُوَّةً أَوْ أَوْيَ إِلَى رُتْكَنِ شَدِيدِيْدَ﴾ (١١ / هود: ٨٠)

”(لوط) بولے کہ اے کاش (آن) مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔“

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام نبی نوئے انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:

﴿أَللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً﴾ (٣٠ / الروم: ٥٤)

”اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے، جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو مان کے پیش میں ہوتی ہے، بنا کھڑا کیا، پھر (بچپن کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) تو انکی دی۔“

اور مسلمانوں کو طاقتوں بننے اور سامان جنگ سے آ راستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَأَعْدُوا لَهُمْ مَا أَسْتَطَعْنَمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ زِيَادَتِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ

وَآخَرِينَ مِنْ دُوَّهُمْ لَا تَعْلَمُونَهُمْ أَللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (٦٠ / الانفال: ٨)

”اور (مسلمانوں) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے، کافروں کے (مقابلہ کے) لیے ساز و سامان ہیا کیے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھماک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سواد و سروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔“

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ” طاقتوں مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے۔“ * اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ ت واضح و خاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابل ستائش و صفت ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ((الا اخْبَرُ كُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعْفٍ مُتَضَعِّفٌ الا اخْبَرُ كُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ

عَنْتِلٍ، جَوَاظٍ مُتَكَبِّرٍ))

”کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بد خوار مغرب و شخص۔“

دوسری حدیث میں ہے:

((احتجَتَ النَّارُ وَالْجَنَّةُ فَقَالَتْ هَذِهِ يَدُ خَلْنَى الْجَبَارُونَ الْمُتَكَبِّرُونَ وَقَالَتْ

* مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر و الاذعان له: ٦٧٧٤۔

* بخاری، کتاب الادب، باب الكبر: ٦٠٧١۔

هذه يد خلني الضعفاء والمساكين))

”دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا: مجھ میں جبار اور منکر لوگ داخل ہوئے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور منکرین لوگ۔“

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ضعف بجائے خود قابل مدح و صفتیں ہیں، بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تو اپنے وفا کساری اور اس قسم کے دوسراے اوصاف کا مظہر ہے۔ اعوان و انصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک مابہ الاتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متدين قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر و غرور کرتی ہیں اور اس فخر و غرور کے نشیب میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ اللہ کو بھلا دیتی ہیں، زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا، جس کو اپنی دولت اور اعوان و انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی بھی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

﴿أَنَا أَكْثُرُهُمْنَكَ مَالًا وَأَعُزُّنَفَرًا﴾ (۱۸ / الکھف: ۳۴)

”میں تمھے سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتنا (بھی) بڑا بردست (جتنا) ہے۔“

دوسرਾ شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیے اس قدر کبر و غرور جائز نہیں:

﴿أَلَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ تُطْفَةٍ ثُمَّ سُوِّلَكَ رَجُلًا﴾ (۱۸ / الکھف: ۳۷)

”کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے، جس نے تمھے کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تمھکو پورا آدمی بنایا۔“

تبیجیہ ہوا کہ عذابِ الہی نے اس کی دولت کو ملیا میث کر دیا اور اس کا جھٹاٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپاسیدار چیز فخر و غرور کے قابل نہیں، اہل عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ فقیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گزر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر و غرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیے ایک خاص لفظ ”مکاڑا“، ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسان کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

﴿أَلَهُمْ أَنْتُمُ الشَّكَارُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (۲۱ / النکاثر: ۱۰۲)

”تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل ہنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔“

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی و تہذیبی حیثیت

سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((تزویجوا الودود الولد فانی مکاثر بکم الامم)) ﴿۱﴾

”محبت کیش اور بچے جتنے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرت تعداد میں، میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔“

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

﴿۱﴾ ابو داود، کتاب النکاح، باب النہی عن تزویج من لم يلد..... ۲۰۵۰

ریا کے لغوی معنی دکھاو اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لیے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور بُرائی کا بہت سچھدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثوں میں ہے کہ ((انَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) * ”عمل نیت سے ہے۔“

اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھو کھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی بُرائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بُرا کر کے دکھانے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منش بھی اپنے نفس کی بُرائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لیے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی بُرائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری بُرائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:

((وَلَا يَكُونُونَ كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرْأً وَلَا يَأْتُوا إِلَيْنَا مُغَرِّبِينَ)) (٨/ الانفال: ٤٧)

”اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔“

یریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے، جو خالصہ لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی اور دینی غرض مطلوب ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر کھا ہے، کیونکہ دینیوں کی آمیزش سے ان اعمال میں اللہ کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ فرماتا ہے:

((أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَةً هُوَ مُهَوَّبٌ)) (٤٣/ الفرقان: ٤٥)

”کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اللہ بنا لیا ہے۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں، تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیے ہے، جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔“ *

ایک صحابی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ”قیامت کے دن جب اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو اللہ کے لیے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔“ *

* صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، کیف کان بدء الوحی: ١، ٥٤۔

** سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الریا والسمعة: ٤٢٠٢۔ ایضاً: ٤٢٠٣۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے، بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔“ *

اسلام کے لفظ میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ نفاق یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے اللہ کا منکر ہوتا ہے، لیکن خوف و خطر یاد و سرے دنیوی فائدوں کے لیے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے، اس لیے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریا کاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمُنْكَرِ وَالْأَذْىٰ كَلَّذِنِي يُعْنِقُ مَالَهُ يَنْأَءُ النَّاسَ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۴)

”مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کرو اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو، جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔“

منافقوں کے ریا کارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرا یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اشرذنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے وہ نہایت بے پرواہی، غفلت اور کاملی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں، اس کے بعد اس دوسرا مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مصنوعی خشوع و خضوع، للہیت اور محبویت و استغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عبد الرسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں، اس لیے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پرواہی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں، اسی لیے ایسے شخص کے عمل میں للہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا:

﴿إِنَّ الْمُنْفِقِينَ يُخْدِلُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَلِيفُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَأَوْنَ النَّاسَ وَلَا يَدْرِكُونَ اللَّهَ الْأَقْلِيلُ لَهُمْ﴾ (۴/ النساء: ۱۴۲)

”منافق، (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ (حقیقت میں) اللہ

* سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ۴۲۰۵

ان ہی کو دھوکے میں رکھتا ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو اکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، (ظاہرداری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ بیوں ہی سا۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاةِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يَآءُوْنَ﴾
(الْماعون: ٦٤ / ١٠٧)

”تو ان (منافق) نماز بیوں کی (بڑی) بتاہی ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔“

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ تسبیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اور فرمایا: ”کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے تسبیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟“ صحابہؓ نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ”شرک غنی اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوا اور اس کو زیب وزیست کے ساتھ ادا کرے، اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔“ *

چونکہ ریا اور نہاش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشم کی تسبیح کرنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریا کاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً: ان میں پہلی چیز تو داد دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی ہشتہت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائل اخلاقی میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لانا دینتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لیے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریا کاری کی آمیزش نہ ہونے پائے:

﴿إِنَّ تَبْدِيلَ الصَّدَقَاتِ فِيْعَلَمَاهُ وَإِنْ تَخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفَقَرَاءُ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ﴾

(البقرة: ٢٧١)

”لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپا اور حاجت مند کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، اللہ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے

* ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الریاء والسمعة: ٤٢٠

باکیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔ ۲

عرب کے حاصلِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دینیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ ریا کاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی۔ چنانچہ ایک بد و نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ نعمت کے لیے، ایک شخص دولت کے لیے اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، فرمایا: ”اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا فلم بلند ہو۔“ ۳

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حیثیت سے اور ایک شخص ریاست سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب ملا۔ ۴

ریا کاری کا ایک بڑا مظہرِ علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لیے اس میں ریا کاری کی جو آمیرش ہو سکتی تھی، اس کے متاثر بدر رسول اللہ ﷺ نے نہایت موثر طریقے سے بتائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ”سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص اللہ کے سامنے لا یا جائے گا اور اللہ اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھئے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہئے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا، اللہ کہئے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لیے لڑ کے تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لا یا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔ اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہئے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا، ارشاد ہو گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہئے جاؤ، پھر اسی طرح وہ گھیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لا یا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہئے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجوہ کو پسند تھے، میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہو گا جھوٹ کہتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ۵

۱ بخاری، کتاب الزکوة، باب الصدقة باليمين: ۱۴۲۳۔

۲ مسلم، کتاب الامارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله: ۴۹۱۹۔

۳ ایضاً: ۴۹۲۰۔ ۴ ایضاً، باب من قاتل للرياء والسمعة: ۴۹۲۳۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی، خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی مشکر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے برا بھتتا ہے، لیکن خود بینی کے لیے تہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تہا پیدا ہوتا بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط نازک رکھ سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ ان پر بھی ایسا فریفہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اللہ کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الہی نے ان کے پاؤں خام لیے اور شکست فتح سے بدلتی، اللہ نے فرمایا:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٌ إِذَا أَعْجَبَتْهُمْ لَغْرِيْبَةُ فَأَمْلَأْتُهُمْ ثُغْنَ عَنْكُمْ شَيْئاً﴾ (۲۵/التوبۃ)

”اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی، تو اس کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔“

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرَيَاءً لِّلَّاتِيْنَ﴾ (۸/الانفال: ۴۸)

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جا پسے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔“

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یا درہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھنمند میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقوع ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَلَمْ أَهْلِلْنَا أَهْلَنَا مِنْ قَرِيْبَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا﴾ (۲۸/القصص: ۵۸)

”اور کتنی بستیاں ہم نے بر باد کر دیں، جب وہ اپنے گزران میں اتر آ کر چلیں۔“

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ بر باد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی، تو اس بر بادی کے دن کی جو شناختیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر نازکے گا اور اترائے گا اور یہی وہ

موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔ *
ندھی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پر ہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعالیٰ کی منانعت فرمائی ہے:

﴿فَلَا تُنْكِحُوا النَّفَرَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِعِينِ الظَّفَرِ﴾ (۳۲/ النجم)

”تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جاتا) کرو، پر ہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔“

قدیم ندھی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالظَّرَفُرِيَّ تَحْمُنْ أَبْيَانَ اللَّهِ وَأَجْتَأَوْهُ﴾ (۱۸/ المائدۃ)

”اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چھپتے ہیں۔“

﴿فَلَنِ يَأْكُلُهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ رَعَمْتَ أَكْلَمُهَا فَلَيَأْكُلَّ عَلَيْهِ دُونُ النَّاسِ﴾ (۶۲/ الجسعة)

”(اے پیغمبر ان یہود یوں سے) کہو کہ اے یہود یو! اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے چھپتے ہو۔“

ان تمام آئوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوہ سراپ سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر ندھی حیثیت سے آخرت میں چاک ہو گا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے۔ حدیث میں ہے، کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ساتو فرمایا کہ ”تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔“ * ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔“ *

مدح کی یہ منانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے مدد و مدد عجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے۔ اسی لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا:

﴿وَلَا تُنَكِّحُوا بَيْهَا أَشْكُمْ﴾ (۵۷/ الحدید)

”اللہ نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں۔“

ابوداؤد، کتاب الملاحِم، باب الامر و النهي: ۴۳۴۲۔

* بخاری، کتاب الادب، باب ما یکره من التمادح: ۶۰۶۰۔ ایضاً: ۶۰۶۱۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا نام ہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح بر باد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور غماٹش کے دردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بد اخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

ایل عرب جب جلوں میں شراب پیتے اور جو کھلیتے تو جو امیں جو کچھ جیتے، نشہ کے ترک میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخر یہ اشعار باکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دشمن فیاضی کے اظہار کے لیے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیغمبر کردی تھی، اسی کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مارے مال جمع کرتے تھے اور نماش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور افسوس خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا:

وَاتَّ ذَا الْقُرْبَى حَكَمَةٌ وَالْمُسْكِنُونَ وَابْنُ الشَّيْبِلِ وَلَا تُمْلِرْ تَمْدِيرُهَا إِنَّ الْمُبْدِرِينَ كَانُوا

﴿اَخْوَانَ الشَّيْطَنِينَ طَوَّاَنَ الشَّيْطَنَ لِرَبِّهِ كُفُورًا﴾ (١٧ / بَنِي اسْرَائِيلَ: ٢٦-٢٧)

”اور شرستہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مٹ اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جاڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان ائے رورو گا کا بردانا شکرایے۔“

آیت کے آخر کلکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوث

^١ ابن داود، كتاب الضحايا، باب ماجاء في أكل معاقرة الاعراب: ٢٨٢٠.

مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غور کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے تھے۔ * آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی غم کی تقریروں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم مفلس اور تھی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ اسے تمہیں کو لوگ قابلِ ملامت ٹھہرائیں گے:

﴿وَلَا يَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنْقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا حَسُورًا﴾

(۲۹/ بنی اسرائیل)

”اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیرد کر (گویا) گزدن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے)، تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے، (اور) تم تھی دست بھی ہو گے۔“
کیونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسکو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا أَمْرِيْسُ فُوَّا وَمَا يَقْرَبُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوْمًا﴾ (۶۷/ الفرقان)

”اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں، بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بینج کا ہو۔“

کوئی اس تعلیم کا نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدھیتی پسند کرتا ہے اور کھانے، پینے، سینے اور اڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورہ اعراف میں اللہ فرماتا ہے:

﴿وَكُلُّوا وَاشْرِبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۳۰/ الاعراف)

”اور کھاؤ اور بیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“
صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿كُلُّوا مِنْ ثَيْرَةٍ إِذَا أَمْرُوا وَلَا وَحْقَةَ يَوْمَ حَصَادَةٍ وَلَا سُرْفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

(۶/ الانعام)

”درخت کے پھل سے جب وہ پھل تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کئے اور حد سے آگے نہ بڑھو، اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

* تفسیر بیکر، بہامشہ تفسیر ابن السعود، ج ۵، ص: ۵۷۷۔

حدہ

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً: اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یاد بینوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بد اخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اللہ کی نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد لعنی یہود بطرے مرتے تھے:

﴿أَفَمَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا أَنْتُمُ أَهْلُهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۴/ النساء: ۵۴)

”یا اللہ نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلمے مرتے ہیں۔“

اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے:

﴿لَوْدَ كَثِيرٌ قَنْ أَهْلُ الْكِتَابَ لَوْيَرِدُوكُلُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارٌ هُنَّ حَسَدًا قَنْ يَنْدِيْقُسِهِمْ﴾

(البقرة: ۱۰۹: ۲)

”(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے ولی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے

پچھے پھر تم کو کافر بنادیں۔“

حدہ کی تین قسمیں ہیں:

① یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گوہہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حدہ کی نہ موم ترین قسم یہی ہے اور اسی بتا پر منافقین کی خواہش یہی کہ مسلمان بھی ان کی طرح کافر ہو جائیں:

﴿وَذُوَّالُو تَكْفُرُوْنَ كَمَا الْكُفَّارُوْنَ سَوَّاءُ﴾ (۴/ النساء: ۸۹)

”ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان)

بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔“

② دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصد بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے، اس کو نہیں سکتی، اس لیے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

③ تیسرا یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے

سے سلب کری جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی نہ موم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لیے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَنْتَهِيَّا مَا فَصَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (۴ / النساء: ۳۲)

”اور اللہ نے جو تم میں سے ایک کو دوسرا پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔“ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر کسی کو حاصل ہو یعنی اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے یہی نہ موم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا نہ موم نہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿وَاسْتَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۴ / النساء: ۳۲)

”اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔“

تیسرا صورت بالکل نہ موم نہیں بلکہ دینی امور میں محسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں،

حد کے سات اسباب ہیں۔

① بعض وعداوت، کیونکہ یہاں نہیں ہے کہ ایک شخص کے زد یا کم کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں، اس لیے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبۃ آئے اور جب یہ مصیبۃ آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کی بجائے اللہ اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔ کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو وعداوت تھی، وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی:

﴿وَدُّوا مَا عِنْتُمْ قُدْبَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تَخْفِي صُدُورُهُمْ أَلْبَرُمْ﴾

(آل عمران: ۱۱۸)

”چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو جکی ہے اور (غیظ و غضب) جوان کے دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔“

﴿إِنْ تَمْسِكُمْ حَسَنَةٌ سُوْهُمْ وَإِنْ تُصْبِكُمْ سَيِّئَةٌ يَغْرِبُوا يَهَاطُ﴾ (۳ / آل عمران: ۱۲۰)

”(مسلمانوں)! اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچ تو ان کو برالگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچ تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔“

بعض وعداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے مساوات شرط نہیں، بلکہ ایک ادنی آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بد خواہ ہو سکتا ہے۔

② حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال واقرآن میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے اور وہ اس کے اس ترف کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے، تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

③ حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے، اس لیے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے، کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی تحریر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

﴿أَهْلُؤُمَّةِ مَنْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ فَقْنِ يُبَيِّنُهُمْ﴾ (٦ / الانعام: ٥٣)

”کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔“

حد کا چوتھا سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے کبر و غرور اور دوسروں کی تحریر و تذلیل لازمی ہے۔

④ حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی پدرار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تجب ہوتا ہے اور اسی تجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تجب سے کہتے تھے:

﴿أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا وَسُوْلًا﴾ (١٧ / بنی اسرائیل: ٩٤)

”کیا اللہ نے آدمی (کو) پیغمبر (پنا کر) بھیجا ہے۔“

⑤ حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب و شخصوں کا ایک مقصد ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیاب حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بد خواہ ہو جاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی، اس کا سبب یہی تھا:

﴿إِذْ قَاتَلُوا يُوسُفَ وَأَخْوَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِنَا مَا وَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ (١٢ / یوسف: ٨)

”جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجود یہ کہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بن یا مین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔“

⑥ حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے لیگا نہ روزگار ہونا چاہتے ہیں، جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہمی ہو گیا ہے، تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھوٹ جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور نرمی حیثیت سے اہل عرب پر تفویق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفویق جاتا رہا، اس لیے وہ اسلام ہی کی بخش کنی پر

آمادہ ہو گئے، منافقین میں عبد اللہ بن ابی کوہل مدینہ اپنا بادشاہ بنتا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمه کر دیا، اس لیے اس کو یہ ختن ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک جمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔^۱

⑦ حسد کا ساتواں سبب جبِ نفس اور بد طبیتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو سرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے غبیث انسان لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں کوئی چیز مابالاشتراک ہوتی ہے، اس لیے بیگانوں میں یہ جذب نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم رابطہ اشتراک ہوتا ہے۔ ایک عالم وسرے عالم پر، ایک عابد وسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے خلاف ایک عالم یا کسی عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں کوئی چیز مابالاشtraک نہیں۔ اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لیے ان میں حسد کا جذب نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے، اس لیے اصولاً جو بد اخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ ہر ہم کر سکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو نکھنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((اَيَاكُمْ وَالظَّنْ فَإِنَ الظَّنِ اَكْذَبُ الْحَدِيثِ وَلَا تَحْسُسُوا وَلَا تَجْسِسُوا وَلَا تَحَاسِدُوا وَلَا تَدَابِرُوا وَلَا تَبَاغِضُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ اَخْوَانًا))^۲

”بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی نوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک وسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغرض رکھو، بلکہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنى كونوا كاخوان النسب في الشفقة والرحمة والمحبة والمواساة
والتعاونة والنصيحة.^۳

”اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت، غم خواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں نبھی بھائیوں کی

^۱ بخاری، کتاب الاستذان، باب التسلیم فی مجلس فیه الاخلاط من المسلمين والمشرکین: ۶۲۵:-

^۲ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینهی عن التحاسد والتدارب: ۶۰۶۴:-

^۳ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینهی عن التحاسد والتدارب، ج ۱۰، ص: ۴۰۳:-

طرح ہو جاؤ۔“

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب ان تمام بد اخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کے تمام محسن اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

كانه قال اذا تركتم هذه المنهيات كتم اخوانا و مفهومه اذالم تركوها تصيروا اعداء و معنى كونوا اخوانا اكتسبوا ماتصيرون به اخوانا مما سبق

ذكره وغير ذلك من الامور المقتضية لذلك نفياواثباتا۔

”گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منهيات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو، جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں، جن کا ذکر اوپر گزر اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔“

ان بد اخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے مشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ”کوئی شخص شکون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔“ کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا: ”شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرتا چاہتے ہو، اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ ممت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ ہو جاؤ۔“ ^۱ لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہو تو اسلام کے تمام محسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھوٹ کر خاک سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((اَيَاكُمْ وَالْحَسْدُ يَا كَلِ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأكِلُ النَّارَ الْحَطَبَ))

”تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے:

((وَعِنْ شَرِّ حَسَدٍ إِذَا حَسَدَ)) (۱۱۳ / الفلق: ۵)

”اور بر اچاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔“

* ایضاً * مصنف عبد الرزاق بحوالہ فتح الادری، کتاب الادب، باب ما ینہی عن الحسد، ج ۱۰، ص: ۴۰۲ مصر۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی الحسد: ۴۹۰۳۔

خشش گوئی

خشش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوت شہوانی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتكب زیادہ تر رنگ، بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست و احباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور ندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں، تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں، جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی خشش گوئی کو رفت کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں

﴿فَلَمَّا رَفَتَ وَلَأَفْسُوقُ لَوْلَا جَدَالَ فِي الْحَجَّةِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۹۷)

”حج کے دونوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔“

اس کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانہ حج کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کے چچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ ذکر الہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی خشش گوئی منوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک ۳۰ جمع میں خطبہ دیا اور حرم و شاکے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ”کیا تم میں کوئی آمدی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح اللہ کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟“ لوگوں نے کہا: نہ۔ پھر فرمایا کہ ”اس کے بعد لوگوں کی صحبوتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا۔“ اس پر سب لوگ خاموش رہے، پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟“ اس پر ایک عورت نے دوز انواع میں کہا کہ ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ فرمایا: ”تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثالی ہے؟ اس کی مثال اس چیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مبادرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔“ ۴ مقصود یہ ہے کہ علامیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شری کی صورت یکساں ہے، اس خشش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدو والہی کی حرمت کا تخلیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھو دیں گی اور قول، عمل کے لیے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لیے جب ناگزیر ضرورت میں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے،

۱) دونوں کی نشیں الگ تھیں۔ ”س“

۲) ابو داود، کتاب الطلاق، باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصحابه اهلہ: ۲۱۷۴۔

چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿وَقَدْ أَفْضَى بِعَصْمِكُمْ إِلَى بَعْضٍ﴾ (۴/ النساء: ۲۱)

”حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی، ہم صحبت ہو چکے)۔“

﴿أَوْ لِسْتُمُ الْيَسَاءَ﴾ (۴/ النساء: ۴۳)

”یا تم نے عورتوں کو چھووا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اللہ شریف ہے، اسی لیے اس نے جماع کو کنایتہ مس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لیے اور جو الفاظ پیدا کیے ہیں، جو فقہی مسائل کی تشریع میں مجبور آتے ہیں، گوہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایتے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض..... کا ذکر بھی کنایت کرنا چاہیے، پاخانہ اور پیشاب کے لیے احادیث میں ”قضائے حاجت“ کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایت ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے غاٹک لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ قِنَافَابِطَ﴾ (۴/ النساء: ۴۳)

”یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔“

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لیے استعارہ اس سے پاخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پاخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چونکہ پاخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لیے استعارہ ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پاخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوہ کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیوب کے ہیں:

﴿وَاضْهِمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوعٍ أَيْدِيْ أُخْرَى﴾

(۲۰/ طہ: ۲۲)

”اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھلو (اور پھر نکالو) تو وہ بدلوں اس کے کسی طرح کاروگ ہو، سفید (براق) نکلے گا (اور یہ دوسرا مجرہ ہے)۔“

فخش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غھبیہ سے ہے، جس کا نام سب و شتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں اڑائی

بھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک عام لفظ "فق" سے اس کی ممانعت کی ہے:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقٌ وَلَا جِدَالٌ فِي الْحَجَّ﴾ (۱۹۷/۲) (البقرة)

"حج کے دنوں میں نہ شهوت کی کوئی بات کرنی چاہیے، نہ فتن کی، نہ بھگڑے کی۔"

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کرتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برس یا جذام میں متلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برداشت کیا گیا ہے، تو اس کا انطہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالي طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهَرُ بِالسُّوءِ مِنَ الْقُولِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (۴/۱۴۸) (النساء)

"اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو بر ملا بیان کر سکتا ہے)۔"

قرآن و حدیث میں جا بجا بذریعی سے بچنے کے حکم و مصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں:

① ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی نکالتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کرتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لیے دوسرے کی تعدی سے حفاظت رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تُسْبِّحُ الَّذِينَ يَذْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيُسْبِّحُونَ اللَّهَ عَدُوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(الانعام: ۶/۱۰)

"اور (مسلمانو)! اللہ کے سواد و سرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برانہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر اللہ کو برا کہہ بیٹھیں گے۔"

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ "سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ پر لعنت بھیجے۔" کہا گیا کہ یا رسول اللہ! کوئی اپنے باپ ماں پر کیوں کر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا: "اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس کے باپ ماں دونوں کو برا بھلا کہے گا۔"

② بذریعہ بزرگ آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملتا جلتا چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا، آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں نہایت برا آدمی ہے۔" لیکن جب وہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تو آپ ﷺ اس سے

● بخاری، کتاب الادب، باب لا يسب الرجل والديه: ۵۹۷۳۔

نہایت خندہ پیشانی سے ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا: ”عائشہ اتم نے مجھ کو بد زبان کب پایا؟ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہو گا جس کی بد زبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔“ ❶

❸ بد زبانی دور و حشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شاستگی کے خلاف ہے۔ ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ”تم میں جاملیت کا اثر باقی ہے۔“ ❹ امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔ ❺

❻ رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے، لیکن بد زبانی ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کے بجائے السام علیکم۔ تم کو موت آئے۔ کہا، حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا علیکم وَلَعْنَكُمْ اللہُ وَغَضَبُ اللہِ عَلَيْكُمْ۔ تم کو موت آئے، اللہ تم پر لعنت بھیجے اور تم پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے سناتو فرمایا کہ ”اے عائشہ ازی اختیار کرو اور سختی اور بد زبانی سے بچو۔“ ❻

❼ گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقيق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شری اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائی میں ان مکروہ باتوں کے سنتے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بد زبانی کو حیا کے بالقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ ”بد زبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے، اس کو بدنہما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔“ ❽ اس سے معلوم ہوا کہ بد زبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

❾ گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا ارسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔“ ❿ مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیزو اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ ❻

❶ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن السبی ﷺ فاحشا ولا . ٦٠٣٢ -

❷ بخاری، کتاب الادب، باب ماینفی من السباب واللعنة . ٦٠٥٠ -

❸ ادب المفرد، باب سباب العید: ١٨٩۔ ❹ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبي ﷺ فاحشا . ٦٠٣٠ - ❺ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش . ١٩٧٤ -

❻ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نفاذ الصلوٰت: ١٦٢ -

❼ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الشتم . ١٩٨٢ -

(۷) گالی گلوج لڑائی کا پیش نہیں ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھرنا کفر ہے، اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے، وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فتنہ تو ضرور ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سباب المسلم فسوق و قتاله کفر)) ❶

”مسلمان کو راجحلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔“

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بد زبانی اور غاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلی میں بتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لیس المؤمن بالطعن ولا اللعن ولا الفاحش ولا البذى)) ❷

”جو مسلمان ہے وہ طفرو تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجا، بد زبانی اور فوش کلامی نہیں کرتا۔“

ایک اور حدیث میں بد زبانی کو منافق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ❸

یہ تمام وجہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوج اور لعن و طعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بد زبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی بر اجلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً: جب کوئی شخص حادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو بر اجلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے، مشیت الہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے بر اجلا کہنے کی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ”اللہ کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو بر اجلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔“ ❹ یعنی زمانہ کو بر اجلا کہنا خود اللہ کو بر اجلا کہنا ہے۔

ایک بارہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر اور اڑاٹا نے گی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف اللہ کی فرمان بردار ہے۔“ ❺

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹ پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹ کو الگ کر دیا، ❻ اور یہ اس عورت کی سزا تھی، تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا لکھنہ کہہ سکے۔ اسلام میں گالی گلوج کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغالظات ننانے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاقس یا

❶ بخاری، کتاب الادب، باب ما ینهی من السباب واللعنة: ٦٠٤.

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في اللعنة: ١٩٧٧.

❸ بخاری، کتاب الإيمان، باب علامات المنافق: ٣٤.

❹ بخاری، کتاب الادب، باب لاتسبوا الدهر: ٦١٨١.

❺ ابو داود، کتاب الادب، باب في اللعن: ٤٩٠٨.

❻ ابو داود، کتاب الجهاد، باب النهي عن لعن البهيمة: ٢٥٦١.

کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافرنہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافرنہ ہو گا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پرلوٹ آئے گی۔“ اس سے یہ نتیجہ لکھتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہو گا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافرنہ ہو گا، تاہم اگر اس کا مقصود شخص اس شخص کی تفسیح و تثہیر ہو تو وہ گناہ کار ضرور ہو گا، بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی حفظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی جنت الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اللہ نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

-
- ﴿ سخاری ، کتاب الادب ، باب مائیہ من السباب واللعن: ٤٥ و مسلم ، کتاب الایمان ، باب بیان حال ایمان من قال لاخیہ المسلم یا کافر: ۲۱۶، ۲۱۵ - ۶۰﴾
- ﴿ فتح الباری ، کتاب الادب ، مائیہ من السباب واللعن ، ج ۱۲ ، ص: ۳۸۸ - ۳۸۹﴾

رذائل پر مختصر تبصرہ

گزشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریع کی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بد اخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنجایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لیے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و دہ میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیرروئی نہیں کی گئی ہے، اس لیے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکساں نہ ہو۔ جھوٹ، غیبت، خلاف و عدگی، اہتمام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دور خاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی برائی حب مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلوں، ناپ توں میں کی دشیش وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسرا اساسی برائی حب ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ، ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں، جوان سے اپنا دامن بچائے گا، وہ جنت میں آرام پائے گا:

﴿وَآمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَىَ النَّفْسَ عَنِ الْهُوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجِنَّةَ هِيَ الْكَاوِىٰ ۝﴾

(٤١-٤٠/ النازعات)

”اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈراؤ راپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا،
توجہت اس کی آرام گاہ ہے۔“

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سبھے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جا گئے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ تو اعداد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزو ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی و عدم پابندی کے بدولت حشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی و لطافت ملحوظ رکھتا ہسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماع اور معاشرتی امور میں خوشنگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شناخت اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالا نے میں ایسی خوبی مخوض رکھی جائے، جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا نگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پسغیر اسلام مذکورینے اپنی عملی و قوی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایسی کیت کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائیٰ قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئینی یونان اور روم سے حاصل کیا۔ لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے، وہی اس کے آداب و عوائد کا مأخذ بھی ہے، اس لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شاکستہ بنادیتا ہے۔ ہمارے محمد شین کرام ع نے ان آداب کی نوعیت کو مکارِ اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطهارة، کتاب الاطمۃ، کتاب الاشربة، کتاب اللباس، کتاب الاستیزان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح و سشن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابو داؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذمیل میں لکھتے ہیں۔

فطري آداب

اسلام دين فطرت ہے، اس لیے اس کے آداب کا برا حصہ بھی فطري ہے۔ یعنی فطرة وہ پندیدہ ہیں اور تمام انبیاء ﷺ نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شاستہ اور ناشاستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ”چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسوک کرنا اور زکاح کرنا۔“ ۱

ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پرداہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسوک کرنا، صفائی اور طہارت کی تمام اقسام کو بتاتا ہے اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ قورات کے بیان کے مطابق یہ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔ ۲

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے، جن کو خصال فطرت کہتے ہیں۔ امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، موچھیں ترشاویں اور ناخن کٹائے۔ ۳ ایک حدیث میں ہے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”خصال فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور موچھہ ترشوانا۔“ ۴ ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، موچھہ ترشوانا، ڈاڑھی بڑھانا، مسوک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استباحہ کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلکی کرنا ہوگی۔ ۵

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول ہیں گئے ہیں، چنانچہ وضو میں مسوک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلکی کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ ناخن ترشوانا، بال بخوانا، موچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور موچھیں بڑی ہوتی ہیں، وہ کھانے پینے کی ہر چیز

* ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء في فضل التزویج والمعث عليه: ۱۰۸۔ * توراة پیدائش، باب: ۱۷، آیات: ۱۱، ۱۲۔ * ادب المفرد، باب الختان للكبیر: ۱۲۵۔ * صحيح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۵۹۸۔ * صحيح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۶۰۴۔

کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے، بلکہ خود ان کو بھی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو بیت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی موچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔ موچھوں کے بڑھانے کا فیش یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر ڈاڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈائے کا فیش ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو ڈاڑھی اور موچھ دنوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے خلاف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو سیوں کے برخلاف تم موچھیں ترشاد اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔“ ^۱ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مشرکوں کے برخلاف تم موچھیں باریک ترشاد اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔“ ^۲ ان تقلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا نامہ ہی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخلیل زمان کے رسم و رواج کا وہ سہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے، دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

¹ صحيح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۶۰۳۔

² صحيح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۶۰۲۔

طہارت اور اس کے آداب

تھے یہب و ناسکی کی باتوں میں سب سے ابھی چیز طہارت اور پاکی ہے۔ گوکہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی بہت کم تھا۔ پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔ زن و شوہر کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کر لیں، نماز جو فرض ہے اونہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنِيًّا فَأَطْهِرُوهُا﴾ (۵ / المائدۃ: ۶)

”اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔“

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں۔ فرمایا:

﴿وَتَبَّأَكَ فَطَهِرُوهُ﴾ (۷۴ / المدثر: ۴)

”اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔“

اگر پاکی کے لیے پانی نہیں سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندریشہ ہو تو پاک مٹی سے تمیم کرنا چاہیے:

﴿فَتَبَّمُوا صَعِيدًا طَيْبًا﴾ (۵ / المائدۃ: ۶)

”تو پاک مٹی کا قصد کرو۔“

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ، منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں۔ اس کا نام وضو ہے:

﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بُرُوعَ وَسُكُونَ

وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْعُبَيْنِ﴾ (۵ / المائدۃ: ۶)

”جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھلو اور اپنے سر و سینے کا سچ کر دا اور اپنے پاؤں دھوو۔“

جمعد کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہاد ہو کر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجعیت پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔ تقاضے حاجت اور پیشتاب کے بعد استخراج اور عضو خاص و ممتاز خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ہبھرا گیا۔ ان احکام سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ فرمایا:

﴿وَبَيْحُوتُ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۲۲۲ / البقرۃ: ۲)

”اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً:

① آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص سوکرا ٹھیے تو جب تک تم بارہا تھنہ دھولے، اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے۔“ * اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔ * ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے۔ اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

② دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتائی، مسوک کرنا سنت ٹھہرایا۔ فرمایا: ”اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسوک کرنے کا حکم دیتا۔“ * ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے۔ تو فرمایا: ”تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں۔ مسوک کیا کرو۔“ *

③ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں تھنے کے حاجت نہیں کرنا چاہیے۔ * یہ اس لیے کہ راستے چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

④ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے۔ * بلکہ محجب کو چاہیے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے۔ کیوں کہ ہماری تھوڑی سی کھل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لیے ناپاک یا قابل کراہت، بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

⑤ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و دقار کے بھی خلاف ہے۔ اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زیاد بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

⑥ پیشاب زمزیں پر کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سخت زمزیں سے پیشاب کے چھینٹے اُرک جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

* مسلم، کتاب الطہارة، باب کراہیہ غمس المتوسطی وغیرہ یہد ۶۴۲: ۶۴۳۔ * ابو داود، کتاب الطہارة، باب فی الرجل یجد البلا فی منامه ۲۲۶۔ * ایضاً، باب السوکا ۶: ۴۶۔ * مسند احمد، ج ۱، ص ۲۱۴: ۲۶، ۲۵۔

* ابو داود، کتاب الطہارة، باب الموضع التی نهى عن البول فیها ۲۶، ۲۵: ۲۶۰۔ * ایضاً، باب البول فی الماء الراکد: ۶۹، ۷۰۔

❷ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو۔ کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا دوسرا دل میں پیدا کریں گی۔

❸ بول و براز کے بعد استخبا کرنا چاہیے۔ ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھولیٹنا چاہیے۔ استخبا میں ہاتھ سے کیا جائے۔ اس میں داہنہا تھہنہ لگایا جائے۔

❹ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ منی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے۔ *

❺ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلا عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔ بلکہ بعض فقہاء اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنابر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لیے جماعت کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہا نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پیشینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پیشینہ میں پیٹ آیا اور اس کی بوکے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے یہ بد بحسوں کی توفیر میا: ”لوگوں جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوبصورت میسر ہو سکے لگائے۔“ * جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ *

❻ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف سترہ رہنا چاہیے۔ چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ ”اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟“ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ”اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولیتا۔“ *

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی جائے جو تشدد، غلو اور وہم و دوسروں کی حد تک پہنچ جائے۔ اس بنابر اسلام نے بعض ان بخاتوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً: یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہایت کے بعد بھی اس دن کا آنفتاب ذوب لتب نہانے والا پاک ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا

* یقان مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارة میں دیکھئے۔ * ابو داود، کتاب الطہارة، باب الرخصة فی ترك الغسل يوم الجمعة: ٣٥٣۔ * مسلم، کتاب المساجد، باب النهى من اكل ثوما او يصلا: ١٢٥٢، ١٢٥١۔

* ابو داود، کتاب اللباس، باب فی الخلقان: ٤٠٦٢۔

کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدید اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنا اسراہیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قیچی سے کاٹ دالتے تھے۔ لیکن حضرت خدیفہ رضی اللہ عنہ نے اس تشدید کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر رکھنی نہ کرتے۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استغنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:

«وَيَسْكُونُوكُمْ عَنِ الْجَيْخِينَ فَإِنْ هُوَ أَذْى لَا يَعْتَرِلُوا النِّسَاءُ فِي الْجَيْخِينَ لَا تَقْرِبُوهُنَّ

حَتَّى يَظْهُرُنَّ فَإِذَا نَطَقُهُنَّ فَأُتُونُهُنَّ» (۲۲۲: البقرة)

”اور (اے پیغمبر ﷺ! لوگ) تم سے جیس کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے، تو جیس کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں ان سے مقاہرہ نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔“

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقوع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں لکھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی۔ میں نے معدرت کی تو فرمایا: ”یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔“ **●** ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً: مسجد میں نہیں جا سکتے۔ قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنیار بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان بخس نہیں ہوتا۔“ **●** یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا بخس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھوٹے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں۔ یعنی زمین میں گھٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔“ **●** یعنی اس

1 صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب المصح على الخفين: ۶۲۵۔ **2** صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها: ۶۹۱ تا ۶۸۸۔ **3** ابو داود، کتاب الطهارة، بباب فی الجنب بصافح: ۲۳۰، ۲۳۱۔ **4** ابو داود، کتاب الطهارة، بباب الاذى يصيب الذيل: ۳۸۳۔

کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے۔ جب بارش ہوتا ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ ”اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے۔؟“ بولیں، ہاں ہے۔ فرمایا：“تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔“ غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لیے وہ حالت تمیم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ جو تاز میں پر گز لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یقینی کہ تمیم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا ہے اور اس کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں۔ پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے۔ پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر دوسرے ہاتھ سے پانی بہا کر باہمیں ہاتھ سے کر کے یونچ دونوں طرف دھوتے۔ پھر وضو کرتے۔ لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جزوں کو ملتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بھاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہانے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تیلیں میں فرماتے ہیں کہ ”اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہرہ ہتی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہیا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔“

ابوداؤد، کتاب الطهارة، ایضاً: ۳۸۴۔

بخاری بیانی نملے کی صورت میں۔ صحيح مسلم، کتاب الحیض، باب صفة غسل الجنابة: ۷۱۸۔

صحیح بخاری، کتاب موافیت الصلوة، باب الصلوة الخمس کفارۃ: ۵۲۸۔

کھانے پینے کے آداب

① کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر بیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سکر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھونے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے۔ اسی طرح بے ہاتھ دھونے کے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں اور ابو داؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ **❶** ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چنانی لگی رہ جائے اور وہ سجائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”ایسا اسی کی غلطی سے ہو گا اور اس کو اس تسلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔“ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

② مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہونا چاہیے، جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جوزندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔ یہ کام اللہ کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لئیں چاہیے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن ایک بار ایک بد دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اسی طرح ایک لوٹڑی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ ”جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔“ **❷** اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو ((بسم الله اوله و آخره)) کہدے۔ **❸**

③ انسان کو ضرورت کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور جیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیے خاص کر دیے جائیں۔ چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے دابنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لیے باسیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔ اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے۔ انسان کے زیادہ تر کام فطرة پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام بکھی بکھی ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے۔ یعنی ”دایاں پہلو“ تاکہ کام کے بچکوں اور جھنکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ سب انسان فطرة سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ

❶ ابو داؤد، کتاب الاطعمة، باب فی غسل الید من الطعام: ۳۷۶۱۔

❷ ابو داؤد، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام: ۳۷۶۶۔

❸ ایضاً: ۳۷۶۷۔

صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے۔ اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے۔ * صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ شریعت نے اکثر با توں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔ مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدوبیخا تھا اور بائیں جانب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ”ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔“ *

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے کوئی پیزی پی تو لڑکے سے کہا کہ ”اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔“ اس نے کہا، میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا۔ *

④ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے تجھ سے نہیں کھانا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے تجھ جائے گی، گندی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ برتن گندانہ ہوگا اور تیرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ ”برکت کھانے کے تجھ میں نازل ہوتی ہے۔“ *

⑤ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہیے۔ کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حص اور لائچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشاء یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے، تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے۔ یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حص و طبع پر دلیل ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

⑥ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے گھروالوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں عیب نکالنے والے کی طرف سے چڑا اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور گھر تباہ ہے۔ اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھالینا چاہیے ورنہ جھوڑ دینا چاہیے۔ *

⑦ سب کامل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ

* ابو داود، کتاب الاطعمة، باب الأكل باليمين: ۳۷۷۶-۳۷۷۷۔ ** صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب الایمن فالایمن فی الشرب: ۵۶۱۹۔ *** ایضاً، ۵۶۲۔ **** ترمذی، ابواب الاطعمة، باب مجاهہ فی کراهیة الأكل من وسط الطعام: ۱۸۰۵۔ ***** سنن ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی کراهیة القرآن بین التمرتين: ۱۸۱۴۔

**** بخاری، کتاب الاطعمة، باب ماعاب النبی ﷺ طعاماً قط: ۵۴۰۹۔

نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست و احباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ جیسا کہ قرآن پاک (۲۲/النور: ۶۱) میں ہے۔ الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے۔ اس طرح کھانا زیادہ بر باد نہیں ہوتا۔ کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پخت جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایسا ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا شخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، ملتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں، لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا: ”غَلَبَتُمْ لَوْكَ الْأَلْكَ كَحَاْتَهُ ہو“، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، ہاں۔ فرمایا کہ ”ایک ساتھ کھاؤ اور نسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔“ *

⑧ کھانا ایک لگا کر بیٹھ کر یامنہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے۔ * کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طینی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح نہ امداد میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دوز انوں بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکثر وہ بیٹھ کر۔ * آنحضرت ﷺ نے فرمایا کرتے تھے کہ ”میں بیک لگا کر نہیں کھاتا میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔“ *

⑨ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے۔ ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے۔ * خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گذاشتیں نہیں ہوتا۔ دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا نکٹرا لقا قا پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لافج سے بچتا ہے اور ایسا ریکھتا ہے۔

⑩ کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد درود مال سے ہاتھ پوچھنا چاہیے۔ *

⑪ پانی نہ بہر بہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے۔ * اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

⑫ پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہیے۔ * کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر

* ابو داود، کتاب الاطعمة، باب فی الاجتماع على الطعام: ۳۷۶۴۔ ② ابو داود، کتاب الاطعمة فی الاکما

مثکا: ۳۷۶۹۔ ③ ابو داود، کتاب الاطعمة: ۳۷۷۰ وابن ماجہ کتاب الاطعمة: ۳۲۶۳ وشرح سفر السعاد

فصل فی طعامہ، ص: ۸۷ فیروز آبادی لشیق عبد الحق محمد ولسوی۔ ④ ابو داود وابن ماجہ مع زرقانی علی السیر

ج ۴، ص: ۳۹۸۔ ⑤ بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام: ۵۳۷۶۔ ⑥ بخاری، کتاب

الاطعمة، باب لعن الاصابع: ۵۴۵۶۔ ⑦ بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب بنفسين اویلانہ: ۵۶۳۱؛

⑧ ابو داود، کتاب الاشربة، باب فی النفح فی الشراب: ۳۷۲۸۔

برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو کروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جواندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے۔ اس لیے اس سانس سے ملی ہوئی کچیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

⑬ پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے۔ * کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ بھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔ * مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تقطیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا منسون ہے۔

⑭ پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے۔ * کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا انداز نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جاسکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

⑮ کھانے اور پانی کے برتوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہیے۔ * تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی بخس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

⑯ کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کی مختلف دعائیں صدیوں میں آتی ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر دعائیہ ہے: ((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ)) ”یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔“ *

* صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فی الشرب فائما: ۵۲۷۷۔ * بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب فائما: ۵۶۱۶۔ * صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب تخمیر الاناء.....: ۵۲۷۲۔ بخاری، ۵۶۲۹۔ * صحیح مسلم، کتاب الاشربة: ۵۲۴۶۔ * عمل اليوم والليلة ابن السنی، باب ما يقول اذا اكل: ۴۶۴ نوٹ من المسلمين کے بجائے مسلمین کے الغاظ میں۔

آداب مجلس

آداب مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکاءِ مجلس میں سے ہر ایک کا حقن برابر ہو، تاکہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشت و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

① مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشت کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھنے جانا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ خواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و خوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے شخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام ﷺ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔ ۲۱ انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صفائی میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ جحد کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لیختنی رقاب یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کراور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

② مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ۲۲ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدو روت پیدا ہوتی ہے۔

③ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پہنچنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے۔ ۲۳ دوسرے اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلانیں جاتا۔

④ اگر مجلس میں دو شخص ہاہمیل کر بیٹھنے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۴ کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موافقت اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

⑤ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھنے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ ۲۵ کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف

۱ ادب المفرد، باب یجلس الرجل حيث انتہی: ۱۱۴۱۔

۲ ترمذی، ابواب الاستذان، باب ماجاء فی کراہیة ان يقام الرجل من مجلسه ثم یجلس فيه: ۲۷۴۹، ۲۷۵۰، ۲۷۵۱۔

۳ ترمذی، ابواب الاستذان، باب ما جاء اذا قام الرجل من مجلسه ثم رجع: ۲۷۵۱۔

۴ ترمذی، ابواب الاستذان، باب ما جاء فی کراہیة الجلوس بين الرجلين بغیر: ۲۷۵۲۔

۵ ترمذی، ابواب الاستذان، باب ماجاء فی کراہیة القعود وسط الحلقة: ۲۷۵۳۔

اس کا منہ ہو گا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہو گی، جو ایک قسم کی بد تیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں، تاکہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

⑥ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔ * کیوں کہ یہ عمومیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر، آقا اور رعایا، بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تنظیم تھی جس کا ڈانڈا اشک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص گویا اللہ بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند نہ ہب میں اچھا نہیں سمجھا جاسکتا۔

⑦ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ اور ہر آنے والے کو تکنا بد اخلاقی ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ یعنی نگاہ پنجی رکھنا، ضرر سا چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، یتکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔“ *

⑧ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اپنے ہم نژادیوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پہنچا چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ وہ جیسیں ایک مخلوق فوج ہیں۔ جن میں باہم آشائی ہوتی ہے۔ ان میں الفت و موانت پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ * ایک مشہور مثال ہے کہ ”اگر کسی کے اخلاق کا پہنچا لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پہنچا لگاؤ۔“ اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔“ اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ”اپنے ہم نژادیوں کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچنے گا یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوبیوں پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تھہارا گھریا کچھ اجلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بول پہنچنے گی۔“ *

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمایا کہ ”اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔“ *

۱ ابو داود، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل بقوم للرجل من مجلسه: ۴۸۲۸، ۴۸۲۷۔

۲ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطربات: ۴۸۱۵ تا ۴۸۱۷۔

۳ ادب المفرد، باب الارواح جنواد مجذدة: ۹۰۱، ۹۰۰۔

۴ بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار و بیع المسك: ۲۱۰۱۔

۵ ترمذی، ابواب الاستذان، باب حدیث لا یؤم الرجل: ۲۷۷۲۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہواں میں پہنچیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت بُنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سر کرنے اور دوسروں کے لیے جگہ بنانے کے لیے کہا جائے تو وہ برآمد نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو خود سکھایا۔ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَقْسِحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَأُفْسُحُوا يَنْسَحِبُ اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ أَنْ شُرُونَ فَأَنْشُرُوا يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُولُوا الْعِلْمَ دَرَجَتٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ عَمَلُكُمْ﴾ (۱۱:۵۸ / المجادلة)

”اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو۔ اللہ تمہارے لیے کشادگی کرے گا۔ اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اوپر کرے کا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔“

اسی طرح مجلس میں پہنچ کر اس طرح آپس میں کاناپھوی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ مناقوں کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک میں برملا کی ہے:

﴿إِنَّ الْجَبُوئِ مِنَ الشَّيْطَانِ لَيَعْزِزُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۱۰:۵۸ / المجادلة)

”یہ جو ہے کاناپھوی سو شیطان کا کام ہے کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو۔“

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دوآ دی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ ”تیسرے کو چھوڑ کر دوآ دی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہو گا۔“ *

مجلس کی رازکی پتوں کو برلانہیں بیان کرنا چاہیے کہ ((المجالس بالامانة)) قول نبوی ﷺ ہے۔

* ابو داود، کتاب الادب، باب فی التاجی: ۴۸۵۱۔ ** ایضاً، باب فی نقل الحديث: ۴۸۶۹۔

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ”جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنایا۔“^❶

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

① دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشندی اور صرف ظاہر کرنی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ ”تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرنا یہ بھی صدقہ ہے۔“^❷ ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو علمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے **السلام علیکم** (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔ چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔ عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللہ بک عینا، وانعم اللہ بک صباخا کہتے تھے۔ یعنی تمہاری آنکھیں مخدوشی ہوں۔ تمہاری صبح خونگوار ہو۔ امراء مسلمین کے لیے دوسرے الفاظ تھے۔ ایرانی ”ہزار سال بزری“، ہزار برس جیو، کافقرہ کہتے تھے۔ یورپ کے لوگوں میں صبح کو ”گڈ مارنگ“ (اچھی صبح) شام کو ”گڈ ایونگ“ (اچھی شام) رات کو ”گڈ ناٹ“ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔ مگر اسلام نے سب کے بجائے **السلام علیکم** کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رہیں۔

② یہ تمام انبیاء عليهما السلام کا متفقہ طریقہ ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء عليهما السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں **﴿وَالسلامُ علَيْكَ﴾** (۱۹/مریم: ۳۲) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں **﴿وَسَلَامٌ عَلَى الْمُؤْسِلِينَ﴾** (۲/الصفات: ۱۸۱) ظاہر ہوتا ہے۔

③ اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دینیوں تہذیبات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معمین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

④ اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

⑤ اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی، کورٹش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشرد ع

❶ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في زيارة الاخوان: ۲۰۰۸۔

❷ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔

طریقوں میں پائی جاتی ہے، بھی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے ریکسوس کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ سُخّن ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کریں تو آپ نے اس کی اجازت نہیں دی ॥ ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے، فرمایا: ”نہیں۔“ اس نے کہا: تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا: ”نہیں“ (یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی مذکور ہو مثلاً: ملنے والا مرد ہو، یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو) اس نے کہا کہ اس کا تھک پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے؟ فرمایا: ”ہاں۔“ ॥

⑤ دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا اور آخوند ہر قسم کی سلامتی پر مشتمل ہے۔

⑥ جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بے گانگی کے سبب سے متوجہ اور چوکتے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

⑦ اسلام نے اپنے بیرونیوں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پیچان کی علامت اور ”واج و رذ“ مقرر کیا ہے، آئینے سامنے جب دوزبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملٹ محمد یہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی دہی تھی:

((یا ایها النّاس افشووا السّلام واطعموا الطّعام وصلوا والنّاس نیام تدخلوا

الجنة بسلام))

”لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سور ہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔“

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ ”تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ

ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأة: ۲۱۴۰۔ ॥ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في المصالحة: ۲۷۲۸۔ ॥ ترمذی، ابواب صفة القيامة، حدیث: افسوا السلام: ۲۴۸۵۔

ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔ ۱

سلام کرنے کے لیے شناساً و غیر شناساً، جانے اور انجان کی تخصیص نہیں۔ ۲ مرد اور عورت کی تفریق نہیں ۳ بڑے اور بچے کی تمیز نہیں ۴ البتہ اسلام نے سلام کی ابتداء کرنے کے لیے دو اصول کو ملاحظہ رکھا ہے، جو تمام متعدد قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ جھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنابر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور جھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنابر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو بیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے۔ ۵

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔ ۶ مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔ ۷ سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ، کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ”السلام علیکم“ آپ نے فرمایا: ”اس کو تین نیکیاں ملیں۔“ دوسرا آدمی آیا تو کہا ”السلام علیکم و رحمۃ اللہ“ آپ نے فرمایا: ”اس کو تین نیکیاں ملیں۔“ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ”السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو تین نیکیاں ملیں۔“ ۸

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں، ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ خود قرآن مجید نے تعلیم دی ہے:

﴿وَإِذَا حَيَّتُمْ بِتَجَيِّدِهِ فَعِظِّمُوا يَأْخُسَّ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ (٤/ النساء: ٨٦)

”اور (مسلمانوں) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ایسا ہی جواب دو۔“

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے، لیکن آیت کا ظاہری مفہوم

۱ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في افتتاح السلام: ۲۶۸۸۔

۲ بخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة: ۶۲۳۶۔

۳ بخاری، کتاب الاستئذان، باب تسليم الرجال على النساء والنساء على الرجال: ۶۲۴۸۔

۴ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم على الصبيان: ۶۲۴۷۔

۵ بخاری، کتاب الاستئذان، باب فی بسلم الراکب على الماشی: ۶۲۳۲۔

۶ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في التسلیم اذا دخل بيته: ۲۶۹۸۔

۷ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء في التسلیم عند القیام و عند القعود: ۲۷۰۶۔

۸ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما ذکر في فضل السلام: ۲۶۸۹۔

یہی ہے کہ اتحاد ناینا کافی ہے۔

[2] ملاقات کے وقت انگلیاں محبت اور انگلیاں مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اسلام کا تکمیلہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے۔“ مدینہ میں سب سے پہلے یہ تخفہ اہل بیکن لائے،^۱ اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معافہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اور پرگزروچ کا ہے مانع نہ آئی ہے، لیکن اگر شرعی مجبوری نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اہل کو گلے سے لگالیا اور ان کا بوسہ لیا۔^۲

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشی محبت اور جوش عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی منوع نہیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چوتھے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ان کے بیہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاو کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بجیوار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام حباب کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔^۳

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشکل کا قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یہ قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے سجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔^۴

اس قسم کے موقوں پر خوش آمدید کے الفاظ امثالًا: مر جبا کتبہ کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔^۵

[3] ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَرَكُوكُلُومَ تَذَوَّبُونَ ۝ غَيْرَ يُوْتَكُمْ حَتَّىٰ لَسْتَأْسِوْ وَتَسْلِمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۝ ذَلِكُمْ خَيْرٌ ۝ لَكُمْ لَعْلَمُ تَذَوَّبُونَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا ترْكُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۝

¹ ترمذی، کتاب الاستاذان، باب ما جاء في المصافحة: ۲۷۳۰۔

² ابو داود، کتاب الادب، باب فی المصافحة: ۵۲۱۳۔

³ ترمذی، کتاب الاستاذان، باب ما جاء في المعافنة والقبلة: ۲۷۳۲۔

⁴ یہ دونوں واقعے ابو داود، کتاب الادب، باب فی القیام: ۵۲۱۷، ۵۲۱۵ میں ہیں۔

⁵ ابو داود، کتاب الادب، باب یقوم الرجل يقوم للرجل بعظمته بذلك: ۵۲۲۰۔

⁶ ترمذی، کتاب الاستاذان، باب ما جاء في مرحبا: ۲۷۳۴۔

وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ أَرْجِعُوا فَإِرْجِعُوهُ أَذْكَرِ الْكُفَّارَ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ عَلَيْهِمْ ﴿٥﴾

(٢٤) / النور: ٢٧-٢٨)

”مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرا گھروں میں گھروں والوں سے پوچھئے اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہوتا تو تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تھیس (خاص) اجازت نہ ہو، ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تال) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔“

غیر محروم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ *

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پیند نہیں کرتا، کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے، تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، * اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دامیں یا باہمیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے * تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”دوازہ کے دامیں یا باہمیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔“ * ایک حدیث میں ہے کہ ”اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھاٹک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔“ * ایک بار کسی نے آپ کے مجرہ میں تاک جھاٹک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی لٹکھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا: ”اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کوئی دیتا۔“ پھر فرمایا:

((انما جعل الاذن من قبل البصر)) یا فرمایا: ((انما جعل الاستئذان من اجل البصر))

١ ترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی النہی عن الدخول علی النساء الاباذن ازواجهن: ٢٧٧٩۔

٢ ابو داود، کتاب الادب، باب الاستئذان فی العورات الثلاث: ٥١٩٢۔

٣ ادب المفرد، باب كيف يقوم عند الباب: ١٠٧٨۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی الاستئذان: ٥١٧٤۔

٤ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالة الیت: ٢٧٠٧ و بخاری، کتاب الديات،

باب من اطلع فی بیت قوم ففقطوا عینه فلا دیة له: ٦٩٠٢، ٦٩٠١۔

”یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھنیں۔“

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ * تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو اپس جانا چاہیے، * البتہ اگر کسی کو خود بلا یا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، * اگر کوئی شخص گھر کے والان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، * دو کافیوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پہلی مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، * خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہو گا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر حرم عمرتیں آ گئیں ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پرده کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً: چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پرده رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعمیں کر دی ہے، یعنی نمازِ عشاء کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دو پہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹیہ کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لِيَسْتَأْذِنُكُمُ الَّذِينَ مَلَكُتُ أَيْمَانَكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَأْتُوكُمْ بِالْحُلْمَ وَنِنْكُمْ شُكْرَ مَرْثِتٍ طِّمْنُ قَبْلَةَ الْفَجْرِ وَجِنْبُنَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّاهِرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَوةِ الْعِشَاءِ ثَلَثُ عَوْرَتٍ لَكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَ هُنَّ طَوَّفُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ مَكْذِلَكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَتِ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَكْمٌ وَإِذَا بَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلْمَ فَلَيْسَ أَذْنًا لَمَّا أَسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۴ / النور، ۵۹-۶۰)

”مسلمان تو تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جوں بلوغ کوئی نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں، (ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دو پہر کو (سونے کے لیے معقول کے مطابق) کپڑے اتار دیا

* اس کتاب کے ”اسلام کا فلسفہ اخلاق“ کے ذیل عنوان ”تجسس اور غربت کی ممانعت“ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں: انما الاذن لاجل الرؤية مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں، ویکھے صحیح بخاری، کتاب الاستاذان، باب الاستاذان من اجل البصر: ۶۴۱ وکتاب الدييات باب من اطلع في بيت قوم۔ ۶۹۰

* ابو داود، کتاب الادب، باب کیف الاستاذان: ۱۷۷ * ابو داود، کتاب الادب، باب کم مرہ یسلم الرجل فی الاستاذان: ۵۱۸۰ * ادب المفرد، باب دعاء الرجل اذنه: ۱۰۷۴ تا ۱۰۷۶ * ادب المفرد، باب مالا يستاذن فيه: ۱۰۹۷ * ادب المفرد، باب الاستاذان فی حواریت السوق: ۱۰۹۸

کرتے ہو اور (تیرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تمین وقت تمہارے پر دے کے وقت ہیں، ان (وقات) کے سوانح (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لوئڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہو گی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جانے والا حکمت والا ہے اور (مسلمانو! جب تمہارے لڑ کے حد بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لیے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔“

آداب گفتگو

آداب گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موتی اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ با تیس کرو:

﴿فَقُولُوكَهُ قَوْلًا لَّيْتَنَا﴾ (۴۴ / طہ: ۲)

”تو تم ان سے نرم بات کہنا۔“

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند ہو۔ اس کے کہنے میں اپنا یادو سرے کا فرع ہو، اسی لیے فرمایا:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (۲ / البقرة: ۸۳)

”اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔“

مجلس میں بیٹھیں تو ایے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر لکھتی ہو۔ یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے ”انظرنا“ (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ ”راعنا“ کہتے، جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَارِعِينَ وَقُولُوا إِنَّا نَظَرْنَا﴾ (۱۰۴ / البقرة: ۱)

”اے ایمان والو! ”راعنا“ نہ کہو، انظرنا“ کہو۔“

اس کی پوری تفصیل سورہ نساء کو ع ۷۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے پیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں اڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا لِّيُصْلِحَ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَلَا يَغْرِي لَكُمْ دُّنْيَا كُمْ﴾ (۳۲ / الاحزاب: ۷۱-۷۰)

”اے ایمان والو! اللہ سے تقوی کرو اور بات سیدھی کہو، اللہ تھہارے کاموں کو سنوارے گا اور تھہارے گناہ معاف کرے گا۔“

عورتوں کو جب ناحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی زنا کرت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:

﴿فَلَا تَخْصَصُنَ بِالْقُولِ فَيَطْعَمُ الَّذِي فِي قُلُوبِهِ مَرْضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾

(۳۲ / الاحزاب)

”تو (اے نبی کی بیویو!) دلبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی

طرح کا کھوٹ ہے وہ اللہ جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کر لے گا اور بات کرو تو معقول بے لگ۔“

مردوں کو زرم، معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آتی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا:

﴿قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةً خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتَبَعُهَا أَذْيٌ﴾ (٢/ البقرة: ٢٦٣)

”نیک بات کہنی اور درگز کرنا اس خیرات سے باہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔“

بات کی جائے تو آہنگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:

﴿وَأَغْصُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لِصَوْتِ الْحَمْرٍ﴾ (٣١/ الحمدان: ١٩)

”اور کچھا پتی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔“

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ الْلَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (٢٣/ المؤمنون: ٣)

”اور جو لغو سے اعراض کرتے ہیں۔“

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر اللہ کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهُ رَقِيبٌ عَتَيْدٌ﴾ (٥٠/ ق: ١٨)

”آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا، لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔“

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکلنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہہ یا چپ رہے۔“ ﴿ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔“ ﴿ یہ حدیث ان جو امع المکم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں، مگر در حقیقت اس کو زہ میں دریابند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجارو والضیف: ۱۷۳، ۱۷۴۔

❷ ترمذی، ابواب الزهد، باب من حسن اسلام المرء: ۲۳۱۸، ۲۳۱۷؛ ابن ماجہ، کتاب الفتن: ۳۹۷۶۔

معنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن المغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلفظ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (۲۵: الفرقان)

”اور جب ناس جہاں کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔“

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں بھتلا رہتے ہوں اور فرمایا کہ ”ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں۔“ ❷ یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تلقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تلقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے۔ ❸ یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان یہی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ ”وجود نوں جزوں کے حق یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا، وہ جنت میں جائے گا۔“ ❹

مخاطب کو جوبات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے، تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے ❺ اور گفتگو اتنی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لاسکے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجہ کے پہلو میں یہی کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ اسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ضمیر ہبھر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے لفاظ کو لگانا چاہتا تو گن سکتا تھا، ❻ حضرت جابر بن عبد اللہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لفاظ کے کلام میں تریل و تریل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں علبت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:

كان كلام رسول الله ﷺ كلاماً فصلاً يفهمه كل من سمعه. ❽

”رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ

❶ ادب المفرد، باب قصوص الكلام: ۱۳۰۸۔ ❷ مؤطا امام مالک، كتاب الكلام، باب ما يؤمر به من التحفظ في الكلام: ۱۸۴۸؛ بخاري، كتاب الرقاقي: ۶۴۷۷؛ مسلم، كتاب الزهد: ۷۴۸۲، ۷۴۸۱۔

❸ مؤطا امام مالک، كتاب الكلام، باب ما جاء في ما يخالف من اللسان: ۱۸۰۴۔ ❹ أبو داود، كتاب العلم، باب تكرير الحديث: ۳۶۵۳۔ ❺ أبو داود، كتاب العلم، باب في سرد الحديث: ۳۶۵۴۔

❻ أبو داود، كتاب الأدب، باب الهدى في الكلام: ۴۸۳۹۔

لیتا تھا۔“

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا۔ حضرت عمر و بن العاص رضی اللہ عنہم نے سات تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔“ *

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مبارکات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گروہ بنا یا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع، مفہومی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چباچا کے باعثیں کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان تمام بالتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ”اللہ اس بلغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے، جس طرح تیل اپنی زبان کو توڑ مرور کے گھاس کھاتا ہے۔“ نیز فرمایا کہ ”جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گروہ بنائے، اللہ قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا۔“ *

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو اتفاقات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ خبر پھر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدم اتفاقات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔ *

۱ ابو داود، کتاب الادب، باب ما جاء في التشدق في الكلام: ۵۰۰۸۔

۲ یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرائی مقصود ہو۔

۳ ابو داود، کتاب الادب، باب ما جاء في التشدق في الكلام: ۵۰۰۶۔

۴ ادب المفرد، باب اذا احدث الرجل القوم لا يقبل على واحد: ۱۳۰۴۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستے میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، اللہ اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

﴿وَعَبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَكُشُّونَ عَلَى الْأَرْضِ هُوَنَا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۳)

”اور رحمت والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔“

اکثر کنہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور اور تکبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَكُنْ تَخْرِقُ الْأَرْضَ وَلَكُنْ تَبْلُغُ الْجِبَالَ طُولًا﴾

(۱۷/ بنی اسراء یہل: ۳۷)

”اور زمین میں اکڑ کرنہ چل، (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں

تک اوپھائی میں پہنچ سکتا ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ فَحْشَاءٍ فَهُوَ عَلَىٰ فَوْقَٰةٍ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۸)

”اور زمین میں اکڑ کرنہ چل، بے شک اللہ مغفرہ اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔“

عورت کو بنجنے والے زیور مثلاً: پازیب، چھڑے یا چھا بھجھ پکن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گزرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

﴿وَلَا يَضْرِبُنَّ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يَخْفِفُنَّ مِنْ زِيَّهِنَّ﴾ (۲۴/ النور: ۲۱)

”اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندر ورنی زیور کی

خبر ہو۔“

شریف عورت جب بھر و رت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشائی اور زیب دزینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے، تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں۔ پھر تکا ہیں شرم سے جھکی رہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَا زَوَاجٌ وَلَا تَنكِحَ وَيَسَّأَءُ الْمُؤْمِنِينَ يُذْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَانِنِيَّهِنَّ

ذلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفُنَ فَلَا يُؤْذِنُونَ﴾ (۲۳/ الاحراف: ۵۹)

”اے پیغمبر مصطفیٰ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے نکالیں

اپنے اور پرچھوڑی سی اپنی چاریں، اس سے لگتا ہے کہ بیچانی پریں، ﴿ تو کوئی نہ تائے۔﴾

﴿ وَقُلْ لِلّٰمٰوْمٰتِ يَقْضِيْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَعْقِظُنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبَدِّيْنَ زِيَّهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلَيُضَرِّيْنَ بِخَرِيْهِنَ عَلَى جُوْهِيْنَ وَلَا يُبَدِّيْنَ زِيَّهُنَ إِلَّا يُعَوِّيْهِنَ ﴾

(النور: ٣١) (٤)

”اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سینگارند کھائیں، مگر جو (فطرہ کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سینگارند کھائیں، لیکن شورہ (ونیرہ حرم) کو۔“ (اخیر تک پڑھیے) اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں لکھنا چاہیے، ﴿ کیونکہ اس سے میلان طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال برملانا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافت نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کوں جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دعویتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے الگ کر چلنے لگیں۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متنانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو پچکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو، بلکہ تم متنانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔“

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پا کیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہنے والا بھی ایک طرح کا سورا ہوتا ہے۔“

جو تے دونوں پاؤں میں پکن کر چلنا چاہیے یادوںوں پاؤں ننگے رہیں، یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ ﴿ کیونکہ یہ ادب وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احتق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دوچار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔﴾

- ❶ یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خواتین ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیننے نہیں۔ ﴿ ترمذی ، ابواب الاستئذان ، باب ماجاء فی کراہیة خروج المرأة متعرّة: ٢٧٨٦ . ❷ ابو داود ، کتاب الادب ، باب فی مشی النساء مع الطريق فی الطريق: ٥٢٧٢ . ❸ صحيح مسلم ، کتاب المساجد ، باب استحباب إثبات الصلوٰۃ بوقار: ١٣٦٠ . ❹ ابو داود ، کتاب اللباس ، باب الانتعال: ٤١٣٣ . ❺ ایضاً: ٤١٣٦ . ❻ ابو داود ، کتاب اللباس ، باب ماجاء فی الرخصة فی المشی فی التعلٰی: ١٧٧٧ . ❾ ترمذی ، کتاب اللباس ، باب ماجاء فی المشی فی التعلٰی: ١٧٧٨ ، ١٧٧٧ .

آداسفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی سرزی میں، عرب کی آب و ہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بخرا اور پھر میل، پانی کی قلت، ہوا کی گری، دھوپ کی تمازٹ، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق پندرہ مفید ہدایتیں کی ہیں، جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ ممتنع ہو سکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحراء و بیابان کے راستوں میں ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی ایشنسنوس اور ہولوں میں بہتات ہوتی ہے۔

① سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا بڑھنا ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے:

((أَسْتَوْدُعُ اللَّهَ دِينَكُمْ وَآمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيمَ أَعْمَالِكُمْ))

”یعنی تمہارے دین، امانت اور خاتمہ عمل اللہ کے پسروں کرتا ہوں۔“

۲) سفر صحیح کے تڑ کے کرنا چاہیے، اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتدل بہ مسافت طے کر کے دو پھر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

③ سفر تہائیں کرنا چاہیے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہیے۔ * اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اس سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

④ اگر تمیں آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لیتا چاہیے۔ اسی شخص کو کارروائی سالار کرنے ہیں۔

۵ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔

^١ إيه داود، كتاب الجهاد، باب في الدعاء عند الوداع: ٢٦٠١.

^{٢٦٠} إس. داود، كتاب الحمد، باب في الاتكاك في السفر: ٢٦٠.

٢٦٠٧ - وحدة المسافر الجماد ، كتاب - الحجاج ، باب في الـ حـاجـة

٢٦٠٨، ٢٦٠٩ - اس داده، کتاب الحجاء، بارگ، القوی مسافر و زیارت و زندگانی احمدیه:

—XXXIII—
由上可知，此小説之題材，實為中國社會之現狀。

- ⑥ اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔
- ⑦ سفرات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے، اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہر حال عرب کی سر زمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔
- ⑧ مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔
- ⑨ رات کو مقام راستے سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیونکہ راستے سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موزی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔
- ⑩ جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے، کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔

1 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی التلقی: ۲۷۷۹۔ 2 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الدلجة: ۲۵۷۱۔
 3 مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر: ۴۹۶۰، ۴۹۵۹۔
 4 مسلم، کتاب الامارة، باب السفر قطعة من العذاب: ۴۹۶۱۔

آدابِ خواب

غیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿وَمِنْ أَيْمَهُ مَنَّا مُكْمِلُ بِالْأَيْمَلِ﴾ (الروم: ۲۳)

”اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔“

سورہ فرقان میں فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِيَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُورًا﴾

(الفرقان: ۴۷)

”اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردا، غیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔“

سورہ نبایم میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا تَوْمَكْمُ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾

(النبا: ۱۱-۹)

”اور ہم نے غیند کو تمہارے لیے آرام اور رات کو پردا اور دن کو کار و بار بنایا۔“

ان آئیوں کا اشارہ یہ ہے کہ غیند کے لیے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کار و بار اور محنت کے لیے ہے۔ یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے، البتہ دوپھر کو گرمی کے سبب سے کچھ دریاہل عرب آرام کرتے تھے، جس کو قیلول کہتے تھے، جس کا ذکر سورہ نور میں ہے:

﴿وَجِئْنَ نَصَعُونَ ثَيَابَكُمْ مِنَ الظَّاهِرَةِ﴾ (النور: ۵۸)

”اور رات آرام میں گزاری جائے اور ہو سکتے تو اس کے کچھ حصوں میں اللہ کی یاد کی جائے۔“ جیسا کہ دوسری آئیوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن ہناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاشنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”تمہاری آنکھ کا بھی تم پرحت ہے۔“ یہ تو عام افراد کے لیے ہے، لیکن خاصانِ الہی ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجُونَ﴾ (الذاريات: ۱۷)

”یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔“

① سنت نبوی نے سونے اور جانے کے طریقے اور اوقات بتادیے ہیں، نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا

* بخاری، کتاب النکاح، باب لزوچک علیہ حن: ۵۱۹۹۔

نہیں چاہیے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے۔ ۱ یہ اس لیے ہے کہ صبح تر کے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں اللہ کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سکتی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔ ۲

② احتیاط کا تقاضا ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے، پھر دہنی کروٹ لینا چاہیے۔ ۳

③ ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے، جس پر منڈیر یا جانی نہ گئی ہو۔ ۴ کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندریشہ ہے۔

④ پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے خود کر لینا چاہیے۔ ۵

⑤ پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ”سونے کا یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں۔“ ۶

⑥ ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرا بے پاؤں کو رکھ کر لینا چاہیے ۷ کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہبند باندھتے ہیں، اس لیے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندریشہ نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ ﷺ اس طریقے سے لیتے تھے۔ ۸

⑦ سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے۔ کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھاد بینا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی ہتھی کو اٹھالے جاتے ہیں۔ جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندریشہ ہے۔ یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”آگ تمہاری دشمن ہے، جب سو تو اس کو بجھاد بیا کرو۔“ ۹

۱ ابو داود، کتاب الادب، باب فی السمر بعد العشاء: ۴۸۴۹۔ ۲ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الصیف: ۵۳۶۵۔ ۳ ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقول عند النوم: ۵۰۵۰۔

۴ ابو داود، کتاب الادب، باب فی النوم علی السطح: ۵۰۴۱۔

۵ ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقال عند النوم، ۵۰۴۶: ۵۰۴۷۔ ۶ ویاب فی النوم علی طهارة: ۵۰۴۲۔

۷ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الرجل ینبطح علی بطنه: ۵۰۴۰۔

۸ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراہیہ فی ذلک: ۲۷۶۶۔

۹ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیہ: ۲۷۶۵۔

۱۰ بخاری، کتاب الاستئذان، باب لا ترک النار فی الیتت عند النوم: ۶۲۹۴ ویاب غلق الابواب باللیل: ۶۲۹۶۔ گیریاں حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور اُنکی کارپانا دیا جائیں گے۔

⑧ سوتے اور سوکر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

((اللَّهُمَّ يَا سَمِيلَكَ أَحْسِنْ وَأَمُوتْ))

”اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔“

اور جا گے تو کہے:

((الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ)) ﴿١﴾

”اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف انھ کر جانا ہے۔“

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

ابوداؤد، کتاب الادب، باب ما یقول عند النوم: ۴۹۔ ۵۰۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزو تھا یا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر گھٹنوں اور گٹوں تک اور لوٹریوں کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، ﴿ جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو؟ فرمایا: "اللہ تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے۔" ﴿ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔" ﴿

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہ السلام کو بہشت میں جو بہتی جوڑے ملے تھے، اللہ کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اترے گے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھانے لے گے:

﴿فَلَمَّا أَذَا قَاتَّ الْقَبْرَةَ بَدَأْتُ لَهُمَا سَوَادَهُمَا وَطَفِقَا يَعْصِفُنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ﴾

(الاعراف: ۲۲)

"توجب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے، تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑئے لے گئے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرم گاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ ج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو یہ توہن لیتے تھے، ﴿ ورنہ یوں ہی ننگے پھر اکرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا سبق دیا۔

﴿عورت کا پھر، قدم اور تنسلیاں ستر میں داخل نہیں۔﴾ ﴿ سن نرمذی، ابواب الادب، باب ما جاء في حفظ العورة: ۲۷۹۴۔﴾ ایضاً، باب ما جاء في الاستمار: ۲۸۰۰۔ ﴿ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، تفسیر فی قولہ تعالیٰ: خذوا زینتکم... ۷۵۵۱ و طبری، تفسیر آیات ذیل، ج ۸، ص ۹۹۔﴾

﴿لَیَقِنَّ اَدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِيَسَأَلُوْرِی سَوَاتِكُمْ وَرِيشَاطٍ وَلِيَاسُ التَّقْویٰ ذَلِیْکَ خَیْرٌ﴾

(۷/الاعراف: ۲۶)

”اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشک جوڑھا نکل تھا ری ستر اور زینت کا سامان۔
اور پر ہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔“

﴿لَیَقِنَّ اَدَمَ خُدُوْرِنَّکُمْ عِنْدَ گُلٰ مَسْجِدٍ﴾ (۷/الاعراف: ۳۱)

”اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔“

﴿فُلْ مَنْ حَرَمَ زِيْنَةَ اللَّهِ الَّتِی أَخْرَجَ لِعِبَادَةَ﴾ (۷/الاعراف: ۳۲)

”کہہ دے کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔“

﴿فُلْ اِنَّمَا حَرَمَ رَبِّ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ﴾ (۷/الاعراف: ۳۳)

”کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں منع کیا ہے۔“

ان آئتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ بہتی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ ستر پوشی ہے۔ ان آئتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصود ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیکی کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے، جو بہت سی جزیئات کو حاوی ہے:

﴿وَلِيَاسُ التَّقْویٰ ذَلِیْکَ خَیْرٌ﴾ (۷/الاعراف: ۲۶)

”اور پر ہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔“

پر ہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالح یا شرم و حیمار دلی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے۔ مشہور تالیمی مفسراں نے اس سے مطلق پوشک مرادی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و درع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں، ۱ لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پر ہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پر ہیز گاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرمادیا ہے، شاہ عبدال قادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حوالی میں لکھتے

* روح المعانی، تفسیر آیت مذکور، ج ۸، ص: ۹۰۔

ہیں: ”اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشم نہ پہنے اور دامن دراز نہ کئے اور جو منع ہوا ہے سونے کرے اور عورت باریک نہ پہنے، کہ لوگوں کو نظر آئے اور اپنی زینت نہ کھائے۔“ (تفسیر سورہ اعراف آیت ۵۲ کو)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریع احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

① مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہنانا چاہیے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تعمیم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی تشریع یہ ہے کہ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشم کپڑے پہنے ہیں، تاکہ لو ہے کی کڑیاں بدن میں نہ چھپیں، یا کسی کے بدن میں سمجھی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردراپن سے بدن کے چھپل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشم کپڑے پہنان سکتے ہیں، اگر کوئی دوچار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ *

② مردوں کے لیے عورتوں کی ہی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کی ہی پوشاک پہنانا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشاہدہ کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقای کریں لعنت فرمائی ہے۔ *

③ عربوں میں لباس کا دامن اتنا مبایا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھستا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی اپنا لباس فخر و غرور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیت کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا۔“ * اسی لیے مرد کو پا جامہ کی مہربوں اور تہبند کو تاننجا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹھنڈے چپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”پا جامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹھنڈوں سے اونچا رہے۔“ * فرمایا ”ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا۔“ *

البته عورتوں کو دامن یا گھری نیچے نہ لٹکانا بلکہ ایک آدھ باشت نیچے رکھنا درست ہے۔

④ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہنانا ممکن نہیں۔ خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشائیں ہوں یا مولویوں کا نمائش عبا، جبکہ یا صوفیوں کا گیروارنگ۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل مشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوں نفس کا کھلا غرور ہے۔

* صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریر لبس الحریر: ۵۴۰۱ تا ۵۴۲۸۔ * ابو داود، کتاب اللباس، باب فی لباس النساء: ۴۰۹۷۔ * ابو داود، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار: ۴۰۹۳۔

* ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔ * ایضاً۔

⑤ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”کتنی کپڑے پہنے والیاں ہیں جو حقیقت میں نگی رہتی ہیں۔“

⑥ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو۔ یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی (یا باریک) کپڑا پہن کر حضور ﷺ نے اس کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے اسماء! جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور تخلیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کچھ کھونا حلال نہیں۔“

⑦ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جاسکتے ہیں، آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے۔ البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوبصورت کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لیے منع ہے۔ بزرگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمائد بھی زیب سرفرمایا ہے۔

⑧ مردوں کے لیے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

⑨ آٹین وائی پوشک پہننے وقت پہلے دانہنے ہاتھ میں آٹین ڈالنی چاہیے۔

⑩ نیا لباس پہننے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا یہ ہے تھے:

((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هَذَا وَرَزَقْنٰهُ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مَّنِيْ وَقُوَّةٍ))

”اس اللہ کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)۔“

● صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب النساء الکاسبات: ۵۵۸۲۔

● ابو داود، کتاب اللباس، باب فيما تبدى المرأة من زيتها: ۴۱۰۴۔

● اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاج اور سمن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابو داود اور ترمذی ہیں ان مسائل کی تفصیلات نقیق کتابوں میں ملیں گی۔

● ابو داود، کتاب اللباس، باب ما يقول اذا ليس ثوبا جديدا: ۴۰۲۳۔
نوٹ: ابو داود میں ”هذا التّوْبَ“ کے الفاظ ہیں۔

آداب مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انہاتا نہیں۔ مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیوہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہار مسرت کے سینکڑوں موقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَقْرَرْخِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِجِينَ﴾ (٢٨ / القصص)

”جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترامت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔“

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے:

﴿وَلَئِنْ أَذْقَنَا إِلَيْنَا إِلْأَسَانَ وَمَنَّا رَحْمَةً لَهُ تَرَعَّنَّا مِنْهُ إِنَّهُ لَيُوْسُّ كُفُورَ وَلَئِنْ أَذْقَنَهُ نَعْمَاءً

بَعْدَ ضَرَّاءً مَمْتَنَةً لَيَقُولَنَّ دَهَبَ التِّسْبِيلُ عَنِّي طِلَّ إِنَّهُ لَفِرْخٌ فَغُورٌ﴾

(۱۱ / هود: ۹-۱۰)

”اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر بھروہ چھین لیں اس سے تو وہ نا امید، ناشکر ہوا اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پنچھے اس کو تو کہنے لگے لیکن برا ایسا مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑا ایسا کرتا۔“

اور اس کی ممانعت کی ہے:

﴿وَلَا كُفُرَ حُوَيْسًا الشَّكْرُ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كُفُّارٍ كُلَّ كُفُّارٍ فَغُورٌ﴾ (۵۷ / الحدید: ۲۳)

”اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اترانے بڑائی مارتے کو۔“

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ ولی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجالانا چاہیے، تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے، ایک بار مکہ سے مدینہ جا رہے تھے، جب غروراء کے قریب پنچھے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دریک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ ”میں نے اللہ سے اپنی

امت کے لیے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کر لی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سراہا کر اپنی امت کے لیے بھی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی النجات کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری النجات کو قبول کیا، تو میں اپنے اللہ کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔*

صحابہ کرام کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژده سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مرتضی میز موکعوں پر دوسروے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک بادے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جو حق در جو حق آئے اور ان کو مبارک بادوی۔*

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے، اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا،* اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں، تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غرہہ ہبوك سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے شنیۃ الوداع تک جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا، جس میں بچھی شامل تھے۔*

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیویا میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے، تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

((فصل مابین الحلال والحرام الدف والصوت))

”حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔“*

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ کا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم کرازو واجی زندگی بر کرنے کا معاملہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چیکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

* ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی سجود الشکر: ۲۷۷۵۔ ** بخاری، کتاب المعازی، حدیث کعب بن مالک: ۴۱۸۔

* ابو داود، کتاب الاطممة، باب الاطعام عند القديم من السفر: ۳۷۴۷۔

* ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی التلقی: ۲۷۷۹۔

* ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی اعلان النکاح: ۱۰۸۸۔

حضرت رجع بنت معاذ بن عفراءؓ پنچھا کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کران کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت رجع بنت معاذؓ پنچھا کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوہ بدمر میں شہید ہوئے تھے، اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع کایا:

وَفِيتَنَّبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي عَدِ.

”هم میں ایک پنچھیر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔“

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس کو چھوڑ دا اور جو گاری تھیں اسی کو گاؤ۔“ *

ایک بار حضرت عائشہؓ پنچھا نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشته دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”عائشہ! تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، حالانکہ انصار کو گیت پسند ہے۔“ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لوڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجا تی اور گاتی جاتی۔“ *

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ پنچھے لڑکیوں کا گاناں رہے تھے، اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آگئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا، آپ دو صاحب بدروی صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہورتا ہے، انھوں نے کہا تمہارا جی چاہیے تو تم بیٹھ کر سنو، رسول اللہ ﷺ نے شادی یا یہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے۔ * عربوں میں رسم شخصی کہ دو لہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد زیرینہ کی دعاء دیتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

(بارک اللہ لک و بارک عليك و جمع بینکما فی خیر)

”تمہارے لیے اللہ مبارک کرے، تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملا پ رکھے۔“ *

شادی یا یہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیدہ کہتے ہیں۔ جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلانے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اور کچھ نہیں تو ایک کبری ذبح کر کے کھلادو۔“ * اور خود کبھی پنیر، کھی اور چھوپا رے بھی کھلانے ہیں، * اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر کبھی کچھ بھیج سکتے ہیں۔ *

* بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والوليمة: ۵۱۴۷۔

* بخاری، کتاب النکاح، باب النسوة التي يهدىن المرأة الى زوجها ودعاه من بالبركة: ۵۱۶۲۔

* نسائی، کتاب النکاح، باب الہم و الغنا عند العرس: ۳۲۸۰۔ * ابو داود، کتاب النکاح، باب ما

يقال للمتزوج: ۲۱۳۰۔ * بخاری، کتاب النکاح، باب الوليمة ولو بشارة: ۵۱۶۷۔ * نسائی، کتاب

النکاح، باب البناء فی السفر: ۳۲۸۲۔ * نسائی، کتاب النکاح، باب الہدیة لمن عرس: ۳۲۸۹۔

مسلمانوں کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیانا پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کیے تھے، جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے، رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ ”تم لوگ پہلے دو دن خوشیاں مناتے تھے، اب اللہ نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن۔“ **❸** خوشی کے ان دو دنوں کی تعین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسوم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دین حنفی کے دعظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لیے پسند کیا گیا، عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل ﷺ کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنانا اور فتح کی اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔ ان دنوں میں اظہار مسرت کے لیے عمدہ لباس پہنانا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھلیوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دلوں ندیاں جو پیشہ ورگانے والیاں نہ تھیں، وہ اشعار گاہی تھیں، جو انصار نے بعاثت کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابو مکر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ ”شیطان کے مرا میر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں“۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابو مکر! اہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔“ **❹** یعنی اس دن گاناما بحاج ہے۔ **❺**

عجشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھارے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تماشا دکھایا اور جھشیوں سے کہا کہ ”باں بنوار فدہ“ **❻** اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھک گئی تو آپ نے کہا کہ ”بس“ انھوں نے کہا، باں۔ ارشاد ہوا: ”تو جاؤ۔“ **❼**

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام ”تقلیس“ تھا، جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کو دیں، تماشے دکھائیں، عبد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ میید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعری رضی اللہ عنہ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ ”تقلیس“ کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

❻ نسائی، کتاب صلوٰۃ العبدین، باب سنۃ العبدین لاهل الاسلام: ۱۵۵۷۔ **❼** بخاری، کتاب العبدین، باب سنۃ العبدین لاهل الاسلام:

۹۵۲۔ **❽** بشر طیک اس کے مضامین اخلاقی اور نہیں حشیثت سے برے نہ ہوں۔

❾ بخاری، کتاب العبدین، باب الحراب والدرق یوم العبد: ۹۵۰۔

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ”تقلیس“ ہوتی تھی۔ *

عیدین کے دن خوشی و سرگرمی کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں، جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آؤ دی کچھ دیرا نسباط خاطر کاظہار کر لے، اسی لیے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الہی کے ہیں۔“ ** اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلبِ کو اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لیے عید کے دونوں موقعوں پر دو گانہ ادا کرنا سنتِ شہریا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستے سے عید گاہ کو جائیں اور دوسرا راستے سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کاظہار ہو اور ﴿وَلَيَكُلُّوا إِلَّا اللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَى لَكُمْ﴾ (۲۰/ البقرة: ۱۸۵) کی تعلیم ہو۔

* ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التقلیس یوم العید: ۱۳۰۳۔

** شرح معانی الآثار طحاوی، ص: ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توأم ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گزرا جاتا ہے، عربوں میں فخر و غرور اور جہالت و حشمت کی وجہ سے تعریزت و ماتم کی عجیب عجیب رسیں قائم ہو گئیں تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہوا اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

اذا مُتْ فَابْكِينِي بِمَا انا آهُلُهُ وَشَقِّي عَلَى الْجَيْبِ يَا ابْنَةِ مَعْبُدٍ
جب میں مر جاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لیے گریبان کو چاک
کرُوا

منہ پر تھپٹر مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عامر ستمھی اور شعرا اس کا فخر یہ اظہار کرتے تھے:
من کان مسروراً بمقتلِ مالک فلیأت نسوتنا بوجهِ نهار
جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آ کر دیکھے
یَجِدُ النِّسَاءَ حَوَاسِرًا يَنْدِبَنَهُ يَلْطَمُنَ اوجَهَنَ بِالْأَسْحَارِ
وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوح کر رہی ہیں اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طما نچہ مار رہی ہیں
آنحضرت ﷺ نے ان رسم سے نہایت بختی سے منع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص گریبان
پھاڑتا اور گالوں پر طما نچہ مارتا اور جاہلیت کی طرح چھینتا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے
نہیں۔“ [●] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت عفی طیار ^{رض} سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان
کے خاندان کی عورتوں نے نوح شروع کیا، آپ نے منع کر ابھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ
مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ”ان کے منہ میں خاک بھر دو۔“ [●]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رو نے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی
تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہو گئی تھی، یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے

[●] شرح المعلقات السبع، طرفة بن العبد، ص: ۶۱۔

[●] ترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النهي عن ضرب الخدوود: ۹۹۹۔

[●] صحيح بخاری، کتاب الجنائز، باب من جلس عند المصيبة يعرف فيه الحزن: ۱۲۹۹۔

نوح کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ”وہ کون سی بات ہے، جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ ”نوح نہ کرو۔“ وہ بولیں کہ میرے بچانے جب انقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئیں تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصل مشاہدگیں تھیں، اس لیے پھر کبھی کسی کے نوح میں شریک نہیں ہوئیں۔

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اس کو عربی میں ”تعی“ کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہا جب مرنے لگے تو (فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ ”میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔“

جنازہ کے ساتھ نوح اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخود ان جلا کر لے جاتے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے، تب یہ مطلب ہو گا کہ ”جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور بجا نہ لے جائے۔“

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے، ایک عورت اٹھیں لے کر آئی، آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چار پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ ”جالیت کی رسم پر چلتے ہو؟“ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بد دعا کروں کہ تمہاری صورتیں بد جائیں۔ ”لوگوں نے فوراً چادر میں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ ”کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ یہو کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس میں وہ کوئی رُنگیں کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش وزیارت کرے۔“

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے

* ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الممتحنة : ٣٣٠٧۔ * ترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء في كراهة التعی: ٩٨٦۔ * مسلم، کتاب الایمان، ج ٤، ص: ١٩٩۔

* ابو داود، کتاب الجنائز، باب في اتباع الميت بالثار: ٣١٧١۔ * اسد الغابة، ج ٤، ص: ٣٩٥۔

* ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ماجاء في النهي عن التسلب مع الجنائز: ١٤٨٥۔

* ترمذی، کتاب الطلاق، باب ماجاء في عدة المتوفى عنها زوجها: ١١٩٦، ١١٩٥۔

آن سو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، بر انہیں۔ لیکن زور زور سے چیننا چلانا بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تهدید یہ فرمائی، آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب وفات پائی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ ”اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں، لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔“ *

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔“ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلاف ہے جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کے لیے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اس وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ * ہمدردی کا اقتضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجنیں، کیونکہ غم کے سب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفر بن علیؑ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ ”ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔“ * ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا دفع غم کا وہ لمحہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ «وَاسْتَعِنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ» (٢/ البقرة: ٤٥) صبر کا موقع حادث کے شروع ہی میں ہے، نہیں کہ شروع میں خوب روپیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جوان پنچ کی موت پر درہی تھی سمجھایا، مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو مذعرت کرنے آئی اور صبر کا لکھ ادا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔“ * اللہ فرماتا ہے کہ اپنے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، «قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» (٢/ البقرة: ١٥٦) اسی لیے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو انما اللہ و انما الیہ راجعون پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔ تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہو اللہ کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتایا ہے:

﴿لَيَكُلُّا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَلَكُمْ﴾ (٥٧/ الحدید: ٢٣)

”تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔“

* مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصیبان و العیال: ٦٠٢٥۔

* فتح الباری، ج ۳، ص: ۱۲۲۔ - * ابو داود، کتاب الجنائز، باب صنعة الطعام لاهل الميت: ۳۱۳۲۔

* ایضاً، باب الصبر عند المصيبة: ۳۱۲۴۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً: جمائی لینے میں انسان کامنہ کھل جاتا ہے آہ، آہ میا بہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی بیت بدل کر مضخکہ انگریز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ”جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کرتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر نہتا ہے۔“ * بعض حدیثوں میں ہے کہ ”جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے۔“ * حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا چھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے، * اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنہماںی کو دور کیا ہے۔

① پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور بہاہ نہیں کہنا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔ *

② جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی بہایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو اللہ کی جانب سے بتالیا ہے، * ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ”چھینک بدن کے بلکے چہلکے ہونے، مسامات کے کھلے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جمائی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے۔“ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی اخترے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے، * اس بنا پر شریعت نے چھینکے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر اللہ کا شکر کرے اور ”الحمد لله“ کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں ”ير حمك الله“ کہیں۔ *

③ تاہم وہ ایک بدنہما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے۔ اس لیے چھینکے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے۔ اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ *

④ انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خاص لص کی بعض کتابوں میں ہے کہ

* ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس و یکرہ الشتاوی: ۲۷۴۶۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی الشتاوی: ۵۰۲۶۔ * حجۃ اللہ البالغة آداب الصحبة، ج ۲، ص: ۱۴۹۔ * ترمذی،

کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس و یکرہ الشتاوی: ۲۷۴۷۔ * ایضاً: ۲۷۴۶، ۲۷۴۷۔

⑥ حجۃ اللہ البالغة، باب العطس والشتاوی، ج ۲، ص: ۱۴۹۔ * ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء کیف بشرط العاطس: ۲۷۴۱۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ۵۰۲۹۔

ہو، یا سوتے وقت چراغ کو جلانے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”چو ہے چراغ کی بقیٰ سے گھر میں آگ لگادیتے ہیں۔“

④ بعض آداب ایسے ہیں جن سے تجھیوں کے سرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلًا: حریر، تصویری دارکپڑوں اور چاندی سونے کے برتوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

⑤ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منانی ہیں اور انسان کو بالکل حشیوں اور بدروں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی ہے کہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ بالکل آئے۔ *

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد، جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول امام ﷺ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طلبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول ﷺ کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاقیں کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحبت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصول کا اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں، جو حقیقی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلتے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، * اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتادیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ بر انہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر منی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تو لیے استعمال میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چپھوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے، * پلٹیں بدی جائیں، یا صفائی اور سترہائی کے اور دسرے طریقے اختیار کیے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، پیشنه اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس سے راہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادا کیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

* حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲، ص: ۱۳۳۔ * ہمارے فقہاء نے اسی کو سنن البهدی اور سنن الزروانی کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

* آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

حُكْمَتْ رَبَانِيَّ كَا جَشْمَهُ نُور

﴿وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ وَيَنْزِلُهُمُ ط﴾ (٢/ البقرة: ١٢٩)

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیمیں اور پیغمبر اسلام ﷺ کی اخلاقی بُدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفہ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضور کی صداقت کی کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکماء زمانہ، فلاسفہ و نویسگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، ”معلم امی ﷺ“، کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر دہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاق عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے، بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دیں کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدروہ گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیل نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لیے کی تھی: ﴿وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ وَيَنْزِلُهُمُ ط﴾ ”یعنی ایسا نبی جوان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دئے۔“ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پر بھار بنا گیا۔ (ﷺ)

امید و ایرحمت
سید سیلمان ندوی

۱۳۵۶ھ ۲۹ ذی القعده ۱۴۲۹ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



سِرِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ